U1
J221

U1
Ak22K.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصّہ دوم

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا
دل کو پہنچائے ایذا وہ نہیں ہے اہل دل
ظلم کا باعث جو ہو درد آشنا کیونکر ہوا
طالب دنیا کو اکبر کس طرح سمجھوں میں خضر
خود جو گم ہے فکر میں وہ رہنما کیونکر ہوا

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
نے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا
یا اُس نے خوب سمجھا یا اِس نے خوب دیکھا
خدا کو اکثر زیب زباں تو پایا
عشق بتاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا
روں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

طاقت نہیں اب آپ کی طاقت کے سوا
کچھ بچا ہی نہیں میرے لئے جنّت کے سوا
راہے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
شغل اب کچھ نہیں فسخ عزیمت کے سوا
ں کو تھا ناز کہ حاصل ہے مجھے راحت و عیش
میں نے جانچا تو نہ تھا کچھ بھی وہ غفلت کے سوا

شکیبا جس کو زمانے میں مبارک ہو اُسے — ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا
مطمئن ہو کے لگا تا ہوں لحد میں بستر — اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

عکس دنیا کے مرقع کا پڑا آنکھوں میں
دل میں آتری نہ کوئی شے تری صورت کے سوا

نہ یہ رنگ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا — یہ جنوں اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا — مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ سن کے فطرت نے یہ نقش کھینچے ورنہ — نہ یہ ہوتی چشم نرگس نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دیں ہیں سب کے صدقے جو وہ خود نما بنا ہے — کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
نہ ابھارتا جو گردوں تو وہ کیوں یہ ظلم کرتے — کچھ اثر فغاں میں ہوتا تو میں کیوں خموش ہوتا
حسن نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے — میں تجھے ولی سمجھتا جو تو خرقہ پوش ہوتا

نہ کہہ کہ شمع سے پروانہ دور ہی اچھا — اگر ہے عشق تو قرب حضور ہی اچھا
لبھا لیا مجھے اے شیخ چشم ساقی نے — غرور زہد سے مے کا سرور ہی اچھا
ہزار ہوش ہیں قربان ایسے جلوے پر — جناب حضرتِ موسیٰ کو طور ہی اچھا
رہے نہ دل کے لئے کوئی مستقل مرکز — یہی ہے عقل تو دل اس سے دور ہی اچھا

دلِ شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں
سُنا ہے میں نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا

وہ مے نہیں رہی نہ وہ پیمانہ رہ گیا — دنیا میں بزم جم کا اک افسانہ رہ گیا
غائب ہوئی پری دلِ دیوانہ رہ گیا — افسوس شمع بجھ گئی پروانہ رہ گیا

سرور و نور و وجد و حال ہو جائے گا سب پیدا
مگر لازم ہے پہلے تیرے دل میں ہو طلب پیدا

نہ گھبرا کفر کی ظلمت سے تو اے نور کے طالب
وہی پیدا کرے گا دن بھی کی ہے جس نے شب پیدا

فرقتِ یار میں جینے کا سہارا کیا تھا
خوب تھی موت ہوا موت کے چارا کیا تھا

جان اللہ نے لی جسم ہوا داخل گور
ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہ گئی ہے یہ میلا نکل گیا

اب مادّے کے چھاننے والے ہی رہ گئے
روحانیات کا وہ اکھاڑا نکل گیا

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی
نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

میں خوش ہوا جو آپ نے دیں مجھ کو گالیاں
اچھّا ہوا بخار تو دل کا نکل گیا

کیا دل لگاؤں موسمِ گل سے میں اے صبا
اس کو بھی کچھ ثبات ہے۔ آیا نکل گیا

بازارِ مغربی کی ہوا سے خدا بچائے
میں کیا مہاجنوں کا دوالا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا
کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا

حسرتوں کا بھی مری تم کبھی کرتے ہو خیال
تم کو کچھ اور بھی آتا ہے سنورنے کے سوا

موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے یہ تعلیم نہ تھی
کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرنے کے سوا

محو حیرت ہی رہی بحر میں ہر چشم حباب
کچھ نہ تھی ہستی امواج گذرنے کے سوا

میرے شکووں کو نہ پوچھیں رہیں خاموش حضور
کچھ نہ بن آئے گی واللہ مکرنے کے سوا

عشق کے فن میں ہے اکبر کا بھی درجہ عالی
عیب کچھ اس میں نہیں ضبط نہ کرنے کے سوا

نہ باشد معتبر دل راسکون و اضطراب ایں جا
غم و شادیست گرد کاروان انقلاب ایں جا
میا سادر ہجوم جلوۂ دنیا کہ می بینم
سکون یک نفس سرمایۂ صد اضطراب ایں جا
فریب بحرِ ہستی مایۂ کبر است غافل را
بہ اوج چرخ خواہد سر کشیدن ہر حباب ایں جا
زقرآں بے خبر منشیں و از عقبےٰ مشو غافل
چہ خوش گفت اکبرؔ خوش گو حساب آنجا کتاب ایں جا

تو نے جسے بنایا اس کو بگاڑ ڈالا
اے چرخ میں نے اپنی عرضی کو پھاڑ ڈالا
برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا؟ یہ کہیے
روح رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا
دستار و پیرہن گم اور جیب و کیسہ خالی
تہذیب مغربی نے ہم کو چتھاڑ ڈالا
بنیادِ دیں ہوائے دُنیا نے منہدم کی
طوفان نے شجر کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا
اچھا ملا نتیجہ مجھ کو مراسلت کا
قاصد کو قتل کر کے نامے کو پھاڑ ڈالا

پیغام آ رہا ہے دلِ بے قرار کا
قایم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا
شایق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا
اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا
باغِ جہاں میں کوئی روش بے خلش نہیں
دوڑاؤں گل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا
شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر
کیا شعبدہ ہے گردش لیل و نہار کا
آماجگاہِ تیرِ حوادث ہوں رات دن
پُتلا بنا ہوا ہوں غمِ روزگار کا

اے جنوں دور ہے فطرت کی خود آرائی کا
دیدنی ہے یہ سماں لالۂ صحرائی کا

بڑھتا جاتا ہے اُدھر شوق خود آرائی کا
حوصلہ پست ہے یاں ضبط و شکیبائی کا
آپ کی یاد کو اللہ سلامت رکھے
مجھ پر احسان ہے اس مونس تنہائی کا
سبز باغ آپ مرے اشک رواں کو نہ دکھائیں
موج پر رنگ جمے گا نہ کبھی کائی کا

ایجاں شب فرقت میں میں سو ہی نہیں سکتا
تجھ بن مجھے نیند آئے یہ ہو ہی نہیں سکتا
اِس بحر میں ہوں مثل حباب اے غم ہستی
طوفاں مری کشتی کو ڈبو ہی نہیں سکتا
خاک قدم اُس نے مری آنکھوں میں لگا دی
اب اور مصیبت ہے کہ رو ہی نہیں سکتا

ہوائے شب بھی ہے عنبر افشاں عروج بھی ہے مہ جبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت محل نہیں ہے نہیں نہیں کا
اگر ہو ذوق سجود پیدا۔ ستارہ ہو اوج پر جبیں کا
نشان سجدہ زمین پر ہو تو فخر ہے وہ رُخ زمیں کا
صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا
نہ مہر و مہ پر مری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
فروغِ دل کے لئے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا
نہ علم فطرت میں تم ہو ماہر نہ ذوق طاعت ہے تم سے ظاہر
یہ بے اصولی بہت بری ہے تمہیں نہ رکھے گی یہ کہیں کا

جسے اپنے کام کا پا گئی اسے اک نظر میں ملا لیا
تری چشم مست ہی وہ غضب مرے شیخ کو بھی پلا لیا
وہ فنا کے رنگ سے خوش نہ تھا اُسے کب تھا میل شگفتگی
یہ فریب لُطف نسیم تھا کہ کلی کو جس نے کھلا لیا

یہ گہرفشانی متصل ہے فقط نتیجۂ جوشِ دل
نہ ہوا میں طالبِ انجمن نہ کسی سے میں نے صلا لیا

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا
اسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

علی گڑھ کو شرف بخشا ہی اقبالِ نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

وہ اک دن تھا میاں کو عار تھا صاحب بھی بنتے ہیں
پڑا اب سایۂ مغرب تو بی بی بھی بنیں آیا

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہوا ے اکبرؔ
اڑا جو ذرّۂ عنصر وہ پھر سوئے زمیں آیا

یہ چھاگئی زردی چمن پر جلوۂ گل ہو چکا
جورِ صرصر کے دن آئے دورِ بلبل ہو چکا

واعظا تجھ کو مبارک سنبل و تقویٰ کے پیچ
اب تو دل میرا اسیرِ دام کاکل ہو چکا

بحرِ عرفاں کے لئے ہی کشتیِ دل لازمی
سود منداس راہ میں الفاظ کا پل ہو چکا

کیا دلِ آگاہ سینوں میں نہیں باقی رہے
سنتے ہیں سرمایۂ اہل توکّل ہو چکا

سانس لینے میں بھی اے اکبرؔ کرو اب احتیاط
موقع فریاد وآہ بے تامّل ہو چکا

یہ جلوۂ حق سبحان اللہ یہ نورِ ہدایت کیا کہنا
جبریل بھی ہیں شیدا ان کے یہ شانِ نبوت کیا کہنا

وہ کفر کی ظلمت دور ہوئی اور محفل دیں پرنور ہوئی
یہ مہر ہدیٰ سبحان اللہ یہ صبح سعادت کیا کہنا

جس دل میں ہو پرتوِ کرسی و عرش اس دل کی بلندی صلِّ علےٰ
جس سینے میں قرآں اترا ہو اس سینے کی عظمت کیا کہنا

تسبیح سے دنیا گونج اٹھی تکبیر کا غل تاعرش گیا
تاثیرِ ہدایت صلِّ علیٰ یہ جوشِ عبادت کیا کہنا

نغمہ ہے ترا دلکش اکبرؔ مضموں ہی ترا پاکیزہ و تر
بلبل کے ترانے صلِّ علیٰ پھولوں کی لطافت کیا کہنا

عمل ان سے ہوا رخصت عقیدوں میں خلل آیا — کوئی پوچھے کہ ان کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
بیاں کرتا تھا بربادی کا اک برگِ خزاں دیدہ — رہا میں باغ میں دو دن کفِ افسوس مل آیا
محلّے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے — تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جاکر کود اچھل آیا
جہانِ بے بقا سے کیا لگائے دل کوئی اکبرؔ
گیا وہ آج پُر حسرت جو ارماں لیکے کل آیا

اشارہ ہے یہی بادِ صبا کا — چمن اک رنگ ہے اس کی ادا کا
نسیمِ صبح گاہی وجد میں ہے — عجب مطلب ہے بُلبل کی صدا کا

عجیب برق بلا تھا نظارہ اس مس کا — وجود ہی نہ رہا دل میں دین کے حس کا
نسیم و گل کے تعلق پہ یہ نہیں غمّاز — خدا زیادہ کرے نورِ چشم نرگس کا

خرد کی تفرقہ جوئی سے انتشار رہا — ہمیشہ مجھ پہ یہ کم بخت ہوش بار رہا
نشانِ شوکتِ انساں بنے تو مٹ بھی گئے — خدا کا نام ہی عالم میں برقرار رہا

بانکپن دل میں عقیدوں پہ وہ جوبن نہ رہا — کی ترقی تو بہت پر وہ میاں پن نہ رہا
لان ٹینس کے لئے بن گئے شاہی گلزار — ساتھ سبزے کے ہجوم گل و سوسن نہ رہا

راز کھل جاتا ہمارے نالہ و فریاد کا — آپ سنتے ہی نہیں قصہ دلِ ناشاد کا
آسماں نے دل کی بربادی کی کچھ پروا نہ کی — کھیل تھا ویران کرنا خانہ آباد کا
اس نگاہِ حسرت آگیں سے نہایت تنگ ہوں — ہاتھ اٹھتا ہی نہیں مجھ پر کسی جلّاد کا

مَس ہو لئے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار   اتنا خوگر ہو گیا ہوں پنجۂ صیاد کا
میری نظروں سے گری رہتی ہے دنیائے دنی   عرش منزل ہے یہ پہلو طبع کی افتاد کا

ان کے پرچے کے لئے اکبرؔ نے کہہ دی یہ غزل
شکر ہے اُترا تقاضا حضرتِ آزاد کا

اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا   جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا
ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں اے حضور   آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائے گا

عشقِ بت میں کفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا   جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
صبر کرنا فرقتِ محبوب میں سمجھے تھے سہل   کھل گیا اپنی سمجھ کا حال جب کرنا پڑا
تجربے نے حُبِّ دنیا سے سکھایا احتراز   پہلے کہتے تھے فقط منہ سے اور اب کرنا پڑا
شیخ کی مجلس میں بھی مفلس کی کچھ پرسش نہیں   دین کی خاطر سے دنیا کو طلب کرنا پڑا
کیا کہوں بے خود ہوا میں کس نگاہِ مست سے   عقل کو بھی میری مستی کا ادب کرنا پڑا
اقتضا فطرت کا رُکتا ہے کہیں اے ہم نشیں   شیخ صاحب کو بھی آخر کارِ شب کرنا پڑا
عالمِ ہستی کو تھا مدِّ نظر کتمانِ راز   ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرتِ اکبرؔ کو بالآخر طلب کرنا پڑا

تیغیں نیام میں ہیں انداز جنگ بدلا   خاموش ہیں زبانیں محفل کا رنگ بدلا
مائی کو پوت کی اب مطلق خبر نہیں ہے   اسٹیمروں سے مل کر اندازِ گنگ بدلا

مجھ سے غمِ پنہاں کا بیاں ہو نہیں سکتا
دل سینے میں ہے منہ میں زباں ہو نہیں سکتا

تم غیر کے پہلو میں ہو میں بزم میں بیٹھوں
مجھ سے تو یہ اے جانِ جہاں ہو نہیں سکتا

آنکھوں نے جو دیکھا ہے ترے حُسن کا عالم
واللہ زبانوں سے بیاں ہو نہیں سکتا

معنی کی شعاعوں سے جو لکھ جاتا ہے دل پر
سچ یہ ہے وہ لفظوں میں بیاں ہو نہیں سکتا

کس طرح کلیسا میں پڑھوں سورۂ اخلاص
ظاہر ہے کہ یہ کام یہاں ہو نہیں سکتا

بہتر ہے کہ ہو صبر کی قوت میں ترقی
اُن پر اثرِ آہ و فغاں ہو نہیں سکتا

اکبرؔ تری باتیں کبھی ہوتی ہیں کہیں ختم
کیا حال ہے تیرا کہ بیاں ہو نہیں سکتا

یقیں خدا کا بتِ نکتہ چیں نے کیوں نہ کیا
نہ پوچھ کار نبی دور بیں نے کیوں نہ کیا

جو دل میں آتی ہے اے واعظو نہیں رُکتی
سکوت خوب ہے لیکن تمہیں نے کیوں نہ کیا

اٹھائی میرے ڈرانے کو زحمتِ دشنام
یہ کام آپ کی چینِ جبیں نے کیوں نہ کیا

مجھے تو ملتے ہیں انشائے عشق کے طعنے
نہاں جمال کو اپنے انہیں نے کیوں نہ کیا

ہمیں ہنسے تھے زیادہ گناہِ اکبرؔ پر
ہمیں کو اب ہے یہ حسرت ہمیں نے کیوں نہ کیا

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقّی دیکھی
موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

کوئی حسرت مرے دل میں کبھی آئی ہی نہیں
تھا ہی ایسا کہ یہ مقبولِ تمنّا نہ ہوا

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

دل فریبی مری دنیا نے تو بے حد چاہی
میری ہی ہمّت و غیرت کا تقاضا نہ ہوا

ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں
اس میں کیا عشق کی عزّت تھی کہ رسوا نہ ہوا

مجھ کو حیرت ہے یہ کس پیچ میں آیا زاہد
دامِ ہستی میں پھنسا زُلف کا سودا نہ ہوا
بے دریغ آپ پہ دی جان کیا یہ میں نے
مرحبا منہ سے کہیں آپ سے اتنا نہ ہوا

جو ہنس رہا ہے وہ ہنس چکے گا جو رو رہا ہے وہ رو چکے گا
سکونِ دل سے خدا خدا کر جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا
فلک چلے ظالمانہ چالیں مچائے اندھیر جتنا چاہے
زمانہ لے ہی گا کوئی کروٹ نصیب بے کس کا سو چکے گا
ہماری منزل کا ہے وہ دشمن ہماری راہیں بگاڑتا ہے
کھلیں گے کچھ قدرتی شگوفے جب اپنے کانٹے وہ بو چکے گا
مراد اکبر بتان کافر سے مل ہی جائے گی شاید اِک دن
مراد ملنے سے پہلے لیکن، یہ امتیاز اپنا کھو چکے گا

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا
یہ طرز احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا
بلائیں لیتے ہیں اُن کی ہم اُن پر جان دیتے ہیں
یہ سودا دید کے قابل ہے کیا لینا ہے کیا دینا
خدا کی یاد میں محویتِ دل بادشاہی ہے
مگر آساں نہیں ہے ساری دنیا کو بھُلا دینا

دنیا سے میں نے کچھ بھی نہ چاہا
دل ہی نہ ابھرا جی ہی نہ چاہا
اس میں بُرائی کیا تھی جو میں نے
احیائے رسمِ دیرینہ چاہا

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئے گا | خدا کا نام لئے جاؤ کام آئے گا
ڈریں نہ حشر کی گرمی سے عاشقانِ رسولؐ | لگے گی پیاس تو کوثر کا جام آئے گا
رہے گا خوانِ فلک پر ضرر سے وہ محفوظ | جسے خیال حلال و حرام آئے گا

اگرچہ صبح کو پھیکے ہیں مثلِ مہِ صائم
چمک اُٹھیں گے یہ جب وقت شام آئے گا

غالباً خاتمہ بالخیر سمجھ لو اُس کا | جس کے مرنے کا نئی روشنی نے غم نہ کیا
لاکھ روئے کہ رہے جانتے ہیں اللہ و رسول | دیر کا کورس برہمن نے مگر کم نہ کیا

ایک اس عہد میں دو دل بھی نہیں اے اکبر
یہی باعث ہے کہ میں نے کبھی ہم ہم نہ کیا

یہ کیا صورت ہوئی پیدا۔ یہ ان کا ادّعا کیسا | بتانِ دیر کہتے ہیں ہمیں دیکھو خدا کیسا
ہمیں تو رنگ و بوئے گل پہ محبوبت ہے مستی ہے | مریضوں کو خبر ہو گی کہ ہے اس کا مزا کیسا
بس آنکھیں بند ہوتی تھیں کہ بدلا ہوش کا عالم | کسے اب یاد نقشہ عالمِ ہستی کا تھا کیسا

حلاوت زندگانی کی کہاں اس تلخ کامی میں
خدا کا حکم ہے جیتے ہیں اے اکبر مزا کیسا

اے دورِ فلک دنیا میں مجھے اب لطف ذرا باقی نہ رہا | جب ہم نفس اپنے اُٹھ گئے سب جینے کا مزا باقی نہ رہا
محرومی کا شکوہ بھول گئے یکتائی پر اپنی فخر ہوا | پیشِ درِ دولت میرے سوا جب کوئی گدا باقی نہ رہا

یہ پروانہ ہے جس نے دیدہ بازی کا ہنر جانا | اِسی کا کام ہے ذوقِ نظر میں جل کے مرجانا

یہی باتیں ہیں جن کی یاد تڑپا دیتی ہے دل کو — مرا انگڑائیاں لینا اور اس ظالم کا ڈر جانا
ہمارے دیر میں آکر کبھی اے شیخ بیٹھو تو — نظر بُت پر نہ کرنا اللہ ہی اللہ کر جانا
دلِ مشتاق اندیشوں سے کہتا ہے یہی ہر دم — اسی کو ڈھونڈتے رہنا جہاں ہونا جدھر جانا

کھلے گُل۱؎۔ بہار آئی - چمن کا سماں بدلا — ادھر آ، مرے ساقی پلا دے مجھے صہبا
غموں سے رہائی ہو۔ تردّد نہ رہ جائے — مزے میں غزل گاؤں۔ کسی کا نہ ہو کھٹکا
سمجھ میں مضرت ہے۔ مزا ہے جو مستی ہو — خدا پر بھروسا کر۔ عبث ہے غمِ فردا
کہاں ہیں۔ جم و کسریٰ۔ کدھر ہے وہ بزم اُنکی — فنا کا تسلسل ہے۔ کسی کو نہیں رہنا

زمزموں سے کیوں نہیں ہے تجھکو سیری عندلیب — کون سُنتا ہے صدا گلشن میں تیری عندلیب
پارک میں ان کے دیا کرتا ہے اسپیچ وفا — زاغ ہو جائے گا اک دن آنریری عندلیب

سب سے کر قطعِ نظر بہرِ خیالِ روئے دوست — یا ہر اک شے کو سمجھ عکسِ جمالِ روئے دوست
گوشِ عارف کے لئے قائم ہے صوتِ سرمدی — ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے اس سے حالِ روئے دوست
گردشِ ارض و سما ہے خضرِ راہِ معرفت — مہر و مہ ہیں شاہدِ اوجِ کمالِ روئے دوست

صد ہزاراں گلشن معنی براہ افتادہ است — تا مرا بر صورت خوبش نگاہ افتادہ است
خار از دستت زلیخا را براہ افتادہ است — مژدہ باد اے عشق یوسف ہم بچاہ افتادہ است

بباغِ طبع ز عشق تو رنگ و بوئے ہست — مرا بہ سینہ دلے ہست و آرزوئے ہست

۱؎ بحرِ طویل مخصوص بہ عرب۔ فعولن مفاعلین۔ فعولن مفاعلین۔

زشورِ عالمِ ایجاد بے خبر ہستم   کہ حیرت ست و نگاہِ من است و روئے ہست

شورِ بلبل جوششِ گل موجِ نسیمِ انوارِ صبح   اللہ اللہ کس قدر ہیں دل کشا آثارِ صبح

آفتابِ اوجِ سعادت کا ہو وہ روشن نفس   نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو دمِ آثارِ صبح

جلوۂ حق کے مقابل روئے بت ہے بے فروغ   ہے پیامِ مرگ شمعوں کے لئے دیدارِ صبح

واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیمِ صبح خیز   تیرے دم سے ہے چمن میں گرمیٔ بازارِ صبح

شب گذرتے ہی ہوئی برخاست بزمِ مے کشی   گردنِ مینا سے شاید اُٹھ نہ سکتا بارِ صبح

مدتوں سے آج کل پر ٹالتے ہیں وہ مجھے   صبح کو اقرارِ شام اور شام کو اقرارِ صبح

عاشقِ دنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت   کس نے پروانے کو پایا شایقِ دیدارِ صبح

خوابِ نوشیں سے ترا بیدار ہونا الاماں   یہ خمارِ نرگسِ مستانہ یہ آثارِ صبح

عہدِ پیری آگیا اکبرؔ سنبھالو اپنے ہوش
خوابِ غفلت سے اُٹھو پیدا ہوئے آثارِ صبح

کروں میں کس طرح اس دورِ انقلاب کی مدح   ہنوز شرع میں جائز نہیں شراب کی مدح

مجال کیا کوئی کہدے خوشامدی مجھ کو   اسی سبب سے بہت سہل ہے جناب کی مدح

بقیہ صیغے بھی ماضی بنیں گے حال کے بعد   رہا جو زندہ وہ دیکھے گا تیس سال کے بعد

نظارۂ بتِ بے دیں میں ہے بلا کی روح   اب اختیار ہے تم کو اس احتمال کے بعد

ہنسی خوشی سے ہے بہتر کنارہ کش ہونا   یہ لطف کیا کہ جدا اُن سے ہوں ملال کے بعد

رہے نہ اہلِ بصیرت تو بے خرد چمکے   فروغِ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبرؔ   یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

رنج ہے زیرِ فلک عیش کی تمہید کے بعد — دیکھئے ماہ محرم ہی پڑا عید کے بعد
جلوۂ حسن کچھ آساں نہیں اے دیدۂ شوق — حور کا ذکر بھی ہے حشر کی تمہید کے بعد

فریاد ہے اسی کی طپش سے زبان پر — پہلو میں دل نہیں ہے مصیبت ہے جان پر
دونوں کا ارتباط خدا ہی کے ہاتھ ہے — دانہ تو زیرِ خاک ہے ابر آسمان پر
دن کو بھی ان کے ملنے سے بہتر ہے احتراز — ملتے نہیں جو رات کو اپنے مکان پر
قبروں سے دوستوں کی بھرے ہیں سوادِ شہر — لوں کتنے نام روؤں میں کس کس نشان پر
بت سے مراسلت ہے تو عنوان سادہ چھوڑ — ناخوش کہیں نہ ہوں وہ ھوالمستعان پر
جو ہے زباں پہ دل کو نہیں اس سے فائدہ — جو دل میں ہے وہ لا نہیں سکتے زبان پر
شکرِ خدا کہ شرم کی تکلیف سے بچے — یاروں کی اب تو بھیڑ ہے مے کی دوکان پر
افسانۂ بہار و زبانِ نسیم ۔ واہ — گل جامہ چاک کرتے ہیں اس داستان پر
جوش اس کو کہتے ہیں کہ جو پیری میں بھی رہے — تقویٰ وہ ہے کہ جس کا اثر ہو جوان پر

از جمالت می تراود ہر زماں شانے دگر — وز خیالت می دمد ہر دم گلستانے دگر
انقلابے ہست در ذرات و ہوشم ہر نفس — ہر زماں دارم ز تو جسمے دگر جانے دگر
دل عطا کردی بمن قربان احسانت شوم — درد بخشیدی بہ دل ایں باشد احسانے دگر

تہذیب کے خلاف ہے جو لائے راہ پر — اب شاعری وہ ہے جو ابھارے گناہ پر
کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول — یہ بات منحصر ہے تمہاری نگاہ پر

چہرے نے دی شہادت غم زرد تر ہوا
سختی یہ کیوں ہوئی مرے سچے گواہ پر

جو دیکھا غور سے یہ بات ثابت ہو گئی آخر
وہی ظاہر وہی باطن وہی اوّل وہی آخر

وہی غالب رہے مجھ کو ہوئی شرمندگی آخر
نہ مانا آپ نے اور خاطرِ اغیار کی آخر

وہاں الفاظ خضرِ رہ ہیں یاں معنی ہیں منزل پر
زباں کا ان کو دعویٰ ہے تو مجھ کو ناز ہے دل پر

سماعت گوشِ گل میں ہے نہ بینا دیدۂ نرگس
عجب کیا گریۂ شبنم جو ہے اس بزمِ غافل پر

مذہب کا ہو کیونکر علم و عمل دل ہی نہیں بھائی ایک طرف
کرکٹ کی کھلائی ایک طرف کالج کی پڑھائی ایک طرف

کیا ذوق عبادت ہو انکو جو مِس کے لبوں کے شیدا ہیں
حلوائے بہشتی ایک طرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

طاعون و تپ اور کھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے
بمبے کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف

مذہب کا تو دم وہ بھرتے ہیں بے پردہ بتوں کو کرتے ہیں
اسلام کا دعویٰ ایک طرف یہ کافرادائی ایک طرف

ہر سمت تو ہے اک دامِ بلا رہ سکتے نہیں خوش کس طرح بھلا
اغیار کی کاوش ایک طرف آپس کی لڑائی ایک طرف

کیا کام چلے کیا رنگ جمے کیا بات بنے کون انکی سنے
ہے اکبر بے کس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف

فریاد کئے جائے اکبر کچھ ہو ہی رہے گا آخر کار
اللہ سے توبہ ایک طرف صاحب کی دہائی ایک طرف

محفوظ ذہن رکھیں ہر دور ہم کہاں تک
اوراقِ ہسٹری میں نقشِ قلم کہاں تک

ہر قطرہ اور ذرہ ہے مورثِ حوادث
دفتر ترا کہاں تک زورِ قلم کہاں تک

شخصی ہوں خواہ قومی سب حالتیں ہیں فانی
کبر و غرور کب تک جاہ و حشم کہاں تک

دیکھیں جو کچھ تو سمجھیں پائیں جو کچھ تو جانیں
کب تک چناں چنیں یہ قول و قسم کہاں تک

فطرت دکھا ہی دے گی ملحد کی بے ثباتی
عجز و عجب کہاں تک نازِ عجم کہاں تک

ناقص مقدموں سے نکلیں گے جو نتیجے
ان پر وثوق صحت اے محترم کہاں تک

اے چرخ بد دماغی کی تجھ کو کیا ضرورت — ناکامیوں پہ اپنی روئیں گے ہم کہاں تک
نعمت سمجھ بلا کو لے لذتِ تماشا! — آخر یہ مخزنِ اشک اے چشمِ نم کہاں تک

کہتے ہیں دوست اکبرؔ کو دیکھ کر بہ حسرت
ہے اس کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

قربِ منزل کا مجھے دیتے ہیں مژدہ کیا خضر — ضعف سے یاں تو ہے دو گام بھی چلنا مشکل
ناتوانی سے مٹا جاتا ہے آپس کا وہ میل — نبض کے ساتھ ہے اب سانس کو چلنا مشکل

ہیں ہوا پر کفر کے گیسو پریشاں ان دنوں — کوئے دل میں کیونکر آئے بوئے ایماں ان دنوں
علم دیں مفقود ہے گم ہے صراط مستقیم — خضرِ رہ بنتا ہے ہر غول بیاباں ان دنوں
اپنے اشتر کو یہ کیا لے جائے گا سوئے حجاز — مست خود ہے بینڈ کی گت پر حدی خواں ان دنوں
بڑھ رہا ہے کفر زلفِ علّت و معلول سے — حسنِ فطرت ہے حجابِ روئے یزداں ان دنوں
شارحِ دیوانِ ہستی ہے قیاسِ مغربی — ہے ازل بھی تجربوں کے زیرِ فرماں ان دنوں
یاد کرتا ہے گذشتہ با اثر لاحول کو — شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطاں ان دنوں
کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں — بے زباں ہے بزمِ دل میں شمعِ ایماں ان دنوں
صورتِ امروز میں گم ہے نگاہِ ناتواں — نقشِ فردا چشمِ باطن سے ہے پنہاں ان دنوں
زندگانی کی چمک سے دیدۂ عبرت ہے بند — کم نظر ہے جانبِ گورِ غریباں ان دنوں
ہے ایوولیشن[۱] بس اک تفسیر رب العالمین — کاش اس نکتہ سے واقف ہوں مسلماں ان دنوں
مَن عَلَیھَا فَان ہی پر ختم ہے قولِ فٹسٹ[۲] — کیوں عبث برپا ہے اتنا شورِ طفلاں ان دنوں

۱؎ ارتقاء

۲؎ مسئلہ تنازع للبقا

ہیں مشاغل محفلِ احباب کے ناگفتہ بہ — دم بخود بیٹھا ہے اکبرؔ سا سخنداں ان دنوں

ہیں ترے ہی واسطے اکبرؔ یہ سارے شعبدے
دیکھ تو ان کے یہاں مذہب کا ساماں ان دنوں

جن کے جلوے نہ سما سکتے تھے ایوانوں میں — اُن کی خاک آج پڑی پھرتی ہے ویرانوں میں
کان نے ہوش کو الجھایا ہے افسانوں میں — آنکھ نے دل کو پھنسا رکھا ہے ارمانوں میں
مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں مے خانوں میں — واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں
شیخ جی آپ کو اللہ سلامت رکھے — آپ کا دم بھی غنیمت ہے مسلمانوں میں
نام اللہ و رسول اب تو میں کم سنتا ہوں — پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں
پڑھ کے منصور کی حالت مجھے وجد آتا ہے — خوب مجنون ہیں اللہ کے دیوانوں میں
گرمیٔ دل جو ہے منظور تو منطق پہ نہ جا — عشق ہے آگ لگانے کیلئے جانوں میں

جس نے رکھا نہ فضولی سے سروکار اکبرؔ
مردِ عاقل ہے وہی دہر کے مہمانوں میں

صاحبِ حسن مری آہ سے خوش رہتے ہیں — جس طرح اہلِ سخن واہ سے خوش رہتے ہیں
ہر مصیبت کی یہ توجیہ کیا کرتا ہے — اس لئے ہم دلِ آگاہ سے خوش رہتے ہیں

قابلِ قدر طبیعت ہے ہماری اکبرؔ
ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں

یہ نکتہ ہائے بصیرت افزا جمالِ معنیٰ میں کم نہیں ہیں — کہ شکلِ ظاہر جو دیکھتے ہو ہمارا پر تو ہے ہم نہیں ہیں
کنارہ کش ہو گئے ہر اک سے نہ سو تعلق نہ سو تردد — خوشی نہیں ہے یہی ہو اک غم طرح طرح کے الم نہیں ہیں

کچھ آج علاجِ دلِ بیمار تو کر لیں — اے جانِ جہاں آؤ ذرا پیار تو کر لیں
منہ ہم کو لگاتا ہی نہیں وہ بُتِ کافر — کہتا ہے یہ اللہ سے انکار تو کر لیں
سمجھے ہوئے ہیں کام نکلتا ہی جنوں سے — کچھ تجربۂ سبحہ و زنّار تو کر لیں
سو جان سے ہو جاؤں گا راضی میں سزا پر — پہلے وہ مجھے اپنا گنہگار تو کر لیں
حج سے ہمیں انکار نہیں حضرتِ واعظ — طوفِ حرمِ کوچۂ دلدار تو کر لیں
منظور وہ کیوں کرنے لگے دعوتِ اکبرؔ
خیر اس سے ہے کیا بحث ہم اصرار تو کر لیں

یہ خیر اندیش بھی حاضر ہے مدّاحوں کے زمرے میں — ادھر بھی اک نظر اپنی خوش اخلاقی کے صدقے میں
تمہارے مصرعِ قامت کو لکھ کر کلکِ قدرت نے — دکھا دی خوبیٔ انشائے ہستی ایک جملے میں
اگر ڈھونڈو تو اکبرؔ میں بھی پاؤ گے ہنر کوئی
اگر چاہو نکالو عیب تم اچھے سے اچھے میں

کیا کہیں اوروں کو یہ ایسے ہیں وہ ایسے ہیں — سچ جو پوچھو تو ہمیں کون بہت اچھّے ہیں
جانتے ہیں کہ اجل سر پہ کھڑی ہے لیکن — محو ہیں انجمنِ دہر میں خوش بیٹھے ہیں
عقل حیران ہے پروانوں کی اس حالت پر
شمع کو حس نہیں یہ جان دیئے دیتے ہیں

منہ دیکھتے ہیں حضرتِ احباب پی رہے ہیں — کیا شیخ اسی لئے اب دنیا میں جی رہے ہیں
میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم — حیرت میں آ کے بولا کیا آپ جی رہے ہیں
احباب اٹھ گئے سب اب کون ہم نشیں ہو — واقف نہیں میں جن سے باقی وہی رہے ہیں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

دل کو خود چھیڑے جو وہ ترچھی نظر تو کیا کروں
چین سے رہنے نہ دے دردِ جگر تو کیا کروں
جانتا ہوں ہیں کہ خواہش موت کی اچھی نہیں
زندگی بے لطف ہو جائے مگر تو کیا کروں
سینے سے پر سوز آہیں اٹھتی ہیں اے ہم نشیں
لب پہ آ کر یہ جو نکلیں بے اثر تو کیا کروں
ہے خطا میری جو نکلے منہ سے لفظِ آرزو
آنکھ سے نکلے محبت کی نظر تو کیا کروں
دیر کیسا دل ہی میں کر لیتے ہیں یہ بت گذر
جلوہ گاہ ان کا خدا ہی کا ہو گھر تو کیا کروں

کھل گیا مجھ پر درِ دل اے حضور
غم نہیں گر آپ کا در وا نہیں
آگیا فضلِ خدا سے فنِ صبر
اب مصیبت کی مجھے پروا نہیں

کروں ان سے اس کا میں کیا گلا کہ توجہ ان کی ادھر نہیں
مرا حال تو ہے یہ ہم نشیں کہ خود آپ اپنی خبر نہیں

گردشِ گردوں سے ہر دم وہم رنج افزا میں ہیں
یہ بھی اک سودا ہے ورنہ کیا ہمیں دنیا میں ہیں

ناصحِ ناداں نے مطلب میرا سمجھا ہی نہیں
کیا سمجھتا ؟ عالم دل میں تو وہ تھا ہی نہیں

عالم ہے بے خودی کا مے کی دوکان پر ہیں
ساقی پہ ہیں نگاہیں ہوش آسمان پر ہیں

دل اپنی ضد پہ قایم وہ اپنی آن پر ہیں
جتنی مصیبتیں ہیں سب میری جان پر ہیں

دنیا بدل گئی ہے وہ ہیں ہمیں کہ اب تک
اپنے مقام پر ہیں اپنے مکان پر ہیں

میرا وہ دل نہیں ہے جو ہم نشین لب ہو
یہ آپ ہیں کہ ہر دم اپنی زبان پر ہیں

پامال ہیں مگر ہیں ثابت قدم وفا میں
ہم مثل سنگِ در کے اس آستان پر ہیں

اب تک ہے یاد ہم کو اپنی بلند نامی
اب بھی مٹے ہوئے ہم مٹتے نشان پر ہیں

ہر در کو ہم نے پایا ہے جلوہ گاہ تیرا
نقشِ جبیں ہمارے ہر آستان پر ہیں

یہ صورتیں تمہاری یہ ناز یہ ادائیں
قربان اے بتو ہم خالق کی شان پر ہیں

انداز وہ نظر کے جو آرزو کو روکیں
باتیں جو کر دیں ساکت ان کی زبان پر ہیں

شکرِ خدا کہ اُن کے قدموں پہ سر ہے اپنا
اِس وقت کچھ نہ پوچھو ہم آسمان پر ہیں

یہ قطرہ ہائے شبنم ہیں زینتِ گلِ تر
یا موتیوں کی لڑیاں اس گل کے کان پر ہیں

ہر ذرہ کوئے عشقِ احمد کا کہہ رہا ہے
جو اس زمین پر ہیں وہ آسمان پر ہیں

اب تک سمجھ رہے ہیں دل میں مجھے مسلماں
قایم ہنوز یہ بت اپنے گمان پر ہیں

اسلوبِ نظمِ اکبر فطرت سے ہو قریں تر
الفاظ ہیں محل پر معنی مکان پر ہیں

اک نقش مٹ گیا ہے روتے نشان پر ہیں
دِل میں ہے داغِ حسرت قصے زبان پر ہیں

خلقت میں جلوۂ حق پاتے ہیں اہلِ عرفاں
آنکھیں زمین پر ہیں دل آسمان پر ہیں

ہے دیدنی یہ گرمی بازار کافری کی
گاہک بنا ہے تقویٰ بت بھی دوکان پر ہیں

کرتا ہوں میں جو آہیں کہتے ہیں یہ ہیں مہمل
یہ اعتراض ان کے دل کی زبان پر ہیں

کرتی ہے بے خودی میں سوزِ دروں کو ظاہر
اے شمع ہم تو عاشق تیری زبان پر ہیں

فریاد مرغِ بسمل سمجھو تڑپ کو اس کی
اس وقت بے کسی میں گویا زبان پر ہیں

آزاد و بے نوا ہیں کیسا مکان و مسکن ۔۔۔ بس جس نے دل میں جا دی اس کے مکان پر ہیں
دیکھ اے نگاہ حیراں یہ عشوہ حوادث ۔۔۔ لے مول اے زلیخا یوسف دوکان پر ہیں
مرحوم دل بھی کیا تھا کیا حسرتیں تھیں اس میں ۔۔۔ اب تک کچھ اس کی باتیں میری زبان پر ہیں
دنیا کی غفلتوں کی تصویر ہیں بگولے ۔۔۔ بنیاد ہے ہوا پر سر آسمان پر ہیں

امید ہے دعا کی اہلِ سخن سے اکبر
میرے حقوق بھی کچھ اُردو زبان پر ہیں

وفا بتوں میں نہیں ہے خدا کو پائیں کہاں ۔۔۔ اسی فراق میں کٹتے ہیں دن کہ جائیں کہاں
سکون دل کی طلب میں اٹھے ہیں گھبرا کر ۔۔۔ پہونچ رہیں گے کہیں تم سے کیا بتائیں کہاں
جنوں کی مشق بھی ہے عاقلی بھی آتی ہے ۔۔۔ یہ سوچتے ہیں کہ کس فن کو آزمائیں کہاں
خرد نے رُخ تو کیا بحرِ معرفت کی طرف ۔۔۔ بشر کے دل میں یہ موجیں مگر سمائیں کہاں
یہ کہہ کے خون جگر مانگتا ہے غم دل سے ۔۔۔ کہ تیرے گھر میں رہیں رات دن تو کھائیں کہاں
امید بوسۂ ابرو و زلف و چشم کسے ۔۔۔ مرے نصیب کہاں اور یہ بلائیں کہاں

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سیّد سے
قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں

خدا کے واسطے دنیائے دوں سے منہ جو موڑے ہیں ۔۔۔ وہی ہیں مستند انساں مگر افسوس تھوڑے ہیں
مرے خطبے اثر ہیں اس نگاہ تیز کے آگے ۔۔۔ وہاں ہے تار بجلی کا یہاں کاغذ کے گھوڑے ہیں

بتوں پر دسترس آساں نہیں اے اکبر ناداں!
چھوئے ہیں پاؤں ان کے جبکہ برسوں ہاتھ جوڑے ہیں

ہم کب شریک ہوتے ہیں دُنیا کی جنگ میں | وہ اپنے رنگ میں ہے ہم اپنی ترنگ میں
مفتوح ہو کے بھول گئے شیخ اپنی بحث | منطق شہید ہو گئی میدان جنگ میں
وہسکی کی بُو سے شیخ کی چتون بدل گئی | ان کی نظر بھی مل گئی ساقی کے رنگ میں

تحقیر مولوی کی نہ کر لے گریجویٹ
واللہ اب بھی فرد ہیں یہ اپنے ڈھنگ میں

بلبلِ دل کے لئے ہر داغ گلشن ہے یہاں | ہر نفس راہِ جنوں میں گل بدامن ہے یہاں
ہے تجلّی نورِ حسرت کی ہر آہ شعلہ بار | ہر طپش سینے کی برق طور ایمن ہے یہاں
شعلہ ہائے غم سے ہے نشو و نمائے باغ دل | دامنِ ابرِ کرم ہر برق خرمن ہے یہاں
راحت و آرام جاں پر ہے مقدم یادِ دوست | راہِ غفلت جو چلے وہ سانس دشمن ہے یہاں
منزلِ ذوقِ نظر ہے سالکوں کو پُر خطر | عکس نقشِ عالمِ ایجاد رہزن ہے یہاں

شعلہ غم سے دلِ سوزاں میں اک جان آگئی
روح پرور اختلاطِ برق و خرمن ہے یہاں

کتابِ دل میں میرے عاشقانہ دیکھکر مضموں | کیا اس چشم نے ایما کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

مری بیتابیٔ دل برادا سے مُسکراتے ہیں | قیامت کرتے ہیں بجلی پہ وہ بجلی گراتے ہیں

قائل ہے حُسنِ بُت یہ میں کیا جانتا نہیں | مشکل یہ آپڑی ہے کہ دل مانتا نہیں
فریاد ہی کے کاش طریقے ہوں منضبط | یک لخت ظلم کی بھی تو وہ ٹھانتا نہیں
اس انقلاب پر جو میں روؤں تو ہے بجا | مجھ کو وطن میں اب کوئی پہچانتا نہیں

کس رُخ چلوں رسول تو دنیا سے اُٹھ گئے ۔۔۔ اللہ ہے سو اُس کو میں پہچانتا نہیں
میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام ۔۔۔ اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

اکبرؔ ہنوز ان سے ہے امیدوار لطف
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں!

جب وقف ہے زبان بتوں ہی کی راہ میں ۔۔۔ دل بھی نہ رہ سکے گا خدا کی پناہ میں

بدلے ہی گا اک دن دورِ فلک مایوس یہ ناحق ہم تم ہیں
گلزار میں ہے پھولوں کی دمک افلاک پہ تاباں انجم ہیں
کیسا یہ اثر اس دور میں ہے ساقی کی نظر بھی غور میں ہے
جو مست ہیں ان کو ہوش نہیں جو ہوش میں ہیں وہ گم صُم ہیں
ہر حال میں ہے خالق پہ نظر ہم ان میں نہیں ہیں اے اکبرؔ
جب نعمت ہو تو منطق ہے، جب آفت ہو تو گم صُم ہیں

ظلم جتنے ہیں ہمیں پر وہ کئے جاتے ہیں ۔۔۔ ہم بھی ایسے ہیں کہ اس پر بھی جئے جاتے ہیں
شیخ کے حق میں اٹھا رکھا ہے کیا رندوں نے ۔۔۔ ظرف انہیں کا ہے کہ سب کچھ یہ پئے جاتے ہیں

زمانِ حال میں اگلے فسانے امرِ ماضی ہیں ۔۔۔ جو تلواریں چلاتے تھے وہ اب اٹھکر پہ راضی ہیں
شراب اڑتی ہے پبلک میں روا ہے خونِ تقوی کا ۔۔۔ مزا ہے اب تو رندوں کو نہ مفتی ہیں نہ قاضی ہیں

وہ شرارت سے مرے گھر سرِ شام آتے ہیں ۔۔۔ یہ دکھانا ہے کہ غیروں کے پیام آتے ہیں

غیر کے ذکر میں کرتے نہیں میرا وہ لحاظ　　تذکرے آتے ہیں اور نام بنام آتے ہیں
اعتبار ان کا کر اکبرؔ جو ہیں پابند نماز　　ہیں یہی لوگ کہ جو وقت پہ کام آتے ہیں
وعظ کالج میں جو کہہ آتے ہیں اکثر اکبرؔ
کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

حور مس کو مئے گل گوں کو پری کہتے ہیں　　شیخ خوش ہوں کہ خفا، ہم تو کھری کہتے ہیں
اللہ اللہ یہ نور فلک و رنگ زمیں　　سچ تو یہ ہے کہ اسے جلوہ گری کہتے ہیں
حسن کے باب میں اکبرؔ کی سند ٹھیک نہیں
یہ تو ہر اک بتِ کمسن کو پری کہتے ہیں

میں نے دیکھی ہیں غزالوں کی بہت چالاکیاں　　ہائے ان آنکھوں کی سی ان میں کہاں بیباکیاں
روک دیں اُن میں حیا نے نشہ کی بیباکیاں　　رہ گئیں میری تمنا کی وہ سب چالاکیاں
ایک گردش میں کیا خون دو عالم کو مباح　　چشمِ مستِ ناز کی اللہ رے سفاکیاں
بحرِ غم کو کر دیا افسردگی نے منجمد　　ہو چکیں دردِ آشنا دل کی وہ سب تیراکیاں
دیکھ تو لے دستِ ساقی میں مئے گل گوں کا جام　　شیخ کی نیت کی رہ جائیں گی ساری پاکیاں
عیش باغ اکبرؔ کا جو تھا اب وہ اک غم خانہ ہے
ذکر مرگ آرزو ہے اور گرد و باکیاں

کچھ غم نہیں اگر میں مایوس ہو گیا ہوں　　اب یاس سے بہت کچھ مانوس ہو گیا ہوں
کافی ہے سوزِ باطن انوار معرفت کو!
اپنی ہی شمعِ دل کا فانوس ہو گیا ہوں

کتنی باتیں پیہم اِس دورِ فنا میں ہو چکیں　　ابتدائیں کتنی داخل انتہا میں ہو چکیں
سوچ تو دل میں تو اے مصروف حالِ صبح وشام　　کتنی صبحیں ہو چکیں اور کتنی شامیں ہو چکیں
فکرِ دنیا انبساطِ دل سے ہے نا آشنا
آپ کی کلیاں شگفتہ اس ہوا میں ہو چکیں

———— ۰۰۰ ————

ہر ایک یہ کہتا ہے اب کار دیں تو کچھ بھی نہیں　　یہ سچ بھی ہے کہ مزا بے یقیں تو کچھ بھی نہیں
تمام عمر یہاں خاک اڑا کے دیکھ لیا　　اب آسمان کو دیکھوں زمیں تو کچھ بھی نہیں
مری نظر میں تو بس ہے انھیں سے رونق بزم　　وہی نہیں ہیں جو اے ہم نشیں تو کچھ بھی نہیں
حرم میں مجھ کو نظر آئے صرف زاہد خشک　　مکان خوب ہے لیکن مکیں تو کچھ بھی نہیں
ترے لبوں سے ہے البتہ اک حلاوتِ زیست　　نبات، قند، شکر انگبیں تو کچھ بھی نہیں
دماغ اب تو مسوں کا ہے چرخ چارم پر　　بڑھا دیا مری خواہش نے تھیں تو کچھ بھی نہیں
بہ قول حضرت محشرؔ کلام شاعر کا　　پسند آئے تو سب کچھ نہیں تو کچھ بھی نہیں
وہ کہتے ہیں کہ تمہیں ہو جو کچھ ہو اے اکبرؔ
ہم اپنے دل میں ہیں کہتے ہمیں تو کچھ بھی نہیں

———— ۰۰۰ ————

ہے دلیلوں سے نہیں پیدا یقیں کیونکر کریں　　سارا عالم کہہ رہا ہے ہاں نہیں کیونکر کریں
کس طرح دنیا کو چھوڑیں ہے بنائے زندگی　　ہے مدارِ کار ملّت ترک دیں کیونکر کریں
مغربی علم و ہنر تو خوب ہے اکبرؔ مگر
اپنی اس تعلیم پہ ہم آفریں کیونکر کریں

———— ۰۰۰ ————

غضب ہیں ظاہری صورت کے جلوے بزم ہستی میں　　حقیقت پر نظر رہتی نہیں غفلت کی مستی میں

فلک دیتا ہمیں کچھ اوج رخ کرتے جو پستی کا ‏ خیالوں کی بلندی نے بٹھا رکھا ہے پستی میں

کسی کو یاں بقا نہیں ۔ کوئی سدا رہا نہیں ‏ یہاں کا رنگ ہی یہ ہے ہمیں تو کچھ گلا نہیں

ہمارا دور ہو چکا ۔ زمانہ اب گیا بدل ‏ جہاں کا وہ چلن نہیں ۔ فلک کی وہ ادا نہیں

بڑے جو ہیں وہ بے ثمر ، جو خُرد ہیں وہ خیرہ سر ‏ عطا نہیں کرم نہیں ادب نہیں وفا نہیں

جو مال ہی پہ ہے نظر ۔ تو خوں ہو اور ترا جگر ‏ مرض ہے جس کو حرص کا ، کبھی اسے شفا نہیں

یہی تھی شرطِ عاشقی ۔ کبھی مری خبر نہ لی ‏ یہ کیا سبب نظر تری ۔ مری طرف ذرا نہیں

غرور تھا ، نمود تھی ۔ ہٹو بچو کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں ۔ لحد کا بھی پتا نہیں

بوسۂ زلفِ سیہ فام ملے گا کہ نہیں ‏ دل کا سودا ہے مجھے دام ملے گا کہ نہیں

خط میں کیا لکھا ہے قاصد کو خبر کیا اس کی ‏ پوچھتا ہے مجھے انعام ملے گا کہ نہیں

میں تری مست نظر کا ہوں دعا گو ساقی ‏ صدقہ آنکھوں کا کوئی جام ملے گا کہ نہیں

قبر پہ فاتحہ پڑھنے کو نہ آئیں گے وہ کیا ‏ جان دینے کا کچھ انعام ملے گا کہ نہیں

بُو کسی سمت سے آتی نہیں ہمدردی کی ‏ مجھ کو مجھ سا کوئی ناکام ملے گا کہ نہیں

جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ ‏ کیوں میں پوچھوں وہ دل آرام ملے گا کہ نہیں

آرزو مرگ کی تم کرتے ہو اکبر لیکن
سوچ لو قبر میں آرام ملے گا کہ نہیں

جس خرابی کا نہیں باقی رہا غم کیا کریں ‏ مرگ دل سے ہو گئی تسکین ماتم کیا کریں

تیغ قاتل چل رہی ہے ان دنوں مثلِ نسیم ‏ ہے بہارِ زخمِ دل کشِ فکرِ مرہم کیا کریں

مرشدوں میں سے تو ہر اک جانتا ہے اپنا کام
ہاں مرید اب تک نہیں واقف ہوئے ہم کیا کریں
شیخ کے آگے نہ مے پینا نہیں از راہِ خوف
گردنِ مینا کو اس کے سامنے خم کیا کریں
خوفِ حق عشقِ بتاں نازک ہیں دونوں مسئلے
سخت مشکل ہے زیادہ کیا کریں کم کیا کریں
کچھ مزا گیہوں کا کچھ حوّا کے کہنے کا خیال
آپ ہی کہئے کہ اس موقع پر آدم کیا کریں

میری یہ بے چینیاں اور ان کا کہنا ناز سے
ہنس کے تم سے بولتے ہیں اور اب ہم کیا کریں

بے وقت کا راگ ہے نہ سنئے
واعظ کو مگر جھنجوڑیئے کیوں
اکبرؔ سے نہ کہیے رائے سرجن
امیدِ مریض توڑیئے کیوں

ہے لگا ہوا اس قدر مرکز مگر کوئی نہیں
فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں
کہتی ہیں آہیں کریں گے تیرے دل کا ہم رفارم
سب مگر شہرت طلب ہیں با اثر کوئی نہیں

کیمپ میں پاتا ہوں یاروں کو جو کودن بیشتر
یہ اثر ہے اصطبل کا ورنہ خر کوئی نہیں

اِدھر اُترا ہے چہرہ کوہ کن کا کوہ پر چڑھ کر
اُدھر کب تخت پر سے حضرت پرویز اُترے ہیں
حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہلِ ہوٹل کو
وہاں قرآن اترا ہے یہاں انگریز اُترے ہیں

مرے الفاظ کا رنگ آج مستانِ سخن دیکھیں
یہ شیشے بادۂ مضموں کے کتنے تیز اُترے ہیں

دہر میں سوختہ گرمیِ بازار نہ ہو
دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہ ہو

نقشِ دل ہو صفتِ معنیٔ رنگیں اے دوست
رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہ ہو

جنگ جوئی فصحا رکھ نہیں سکتے جائز
ان کی خواہش ہے کہ لفظوں کی بھی تکرار نہ ہو

سانس کی طرح چلے منزلِ ہستی میں بشر
مدّعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو

نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کر لے قطع
وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو

سرو سے بھی رہوں آزاد تر اس گلشن میں
نخلِ ہستی پہ مرے برگ کا بھی بار نہ ہو

مقدرت شرط ہے ہر چند کہ ہو قدر شناس
بے بصیرت نہ سمجھ لو کہ خریدار نہ ہو

بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اے اکبرؔ
برقِ خرمن کہیں یہ گرمیٔ گفتار نہ ہو

اے بتو بہرِ خدا در پئے آزار نہ ہو
خیر راحت نہ سہی زیست تو دشوار نہ ہو

یارب ایسا کوئی بت خانہ عطا کر جس میں
ایسی گذرے کہ تصوّر بھی گنہگار نہ ہو

معترض ہو نہ مری عزلت و خاموشی پر
کیا کروں جبکہ کوئی محرمِ اسرار نہ ہو

کیا وہ مستی کہ دمِ چند میں تکلیف خمار
مست وہ ہے کہ قیامت میں بھی ہشیار نہ ہو

جان فرقت میں نہ نکلی تو مجھے کیوں ہو عزیز
دوست وہ کیا جو مصیبت میں مددگار نہ ہو

ناز کہتا ہے کہ زیور سے ہو تزئینِ جمال
نازکی کہتی ہے سرمہ بھی کہیں بار نہ ہو

دل وہ ہے جس کو ہو سودائے جمالِ معنی
آنکھ وہ ہے کہ جو صورت کی خریدار نہ ہو

دلِ پُر داغ کو ارماں کہ گلے ان کو لگائیے
ان کو یہ ڈر کہ گلے کا یہ کہیں ہار نہ ہو

عاشقِ چشمِ سیہ مست تو زنہار نہ ہو
دیکھ اس جان کی گاہک کا خریدار نہ ہو

ہر غبارِ رہِ الفت ہے مرا سرمۂ چشم
دل یہ کہتا ہے کہ یہ خاک در یار نہ ہو

لن ترانی کی خبر عشق نے سن رکھی ہے — پھر بھی مشکل ہے کہ وہ طالب دیدار نہ ہو
تم کو سودا لئے ستم کیوں ہی جو ہو شوق فروغ — کیا تلطف سببِ گرمیٔ بازار نہ ہو
قیمتِ دل تو گھٹانے کا نہیں میں اکبرؔ
بے بصیرت نہیں ہوتا جو خریدار نہ ہو

قلزم کی تہ ٹٹولو یا ابر شب[1] میں جھولو — جب بھی یہی کہوں گا اللہ کو نہ بھولو
زخمی کیا جو تم نے ترچھی نظر سے مجھ کو — برچھی کا یہ تو پھل ہے اس پر بہت نہ پھولو
باغ و چمن چھڑایا دورِ فلک نے ہم سے — سائے میں اپنے ہم کو لے لو اب اے ببولو
خاکی نہاد ہم ہیں مائل ہیں خاک ہی پر — شعلوں سے کوئی کہہ دے تم آسمان چھو لو
برباد و منتشر بھی ہو گے اسی ہوا سے — کس زعم میں اُٹھے ہو تن کر تم اے بگولو
ہنگامۂ جہاں سے آزردہ ہو گے اکبرؔ
گوشے میں جا کے بیٹھو اور جام و سبو لو

ہو اگر ہمت عالی دلِ آگاہ کے ساتھ — غیر ممکن ہے محبت نہ ہو اللہ کے ساتھ
طفلِ دل چھوڑے نہ دامانِ قناعت ہرگز — یہی بہتر ہے رہے اپنے بہی خواہ کے ساتھ
اس ترقی کو ترقی میں کہوں گا اکبرؔ — خود بھی بڑھتے رہیں احباب جو تنخواہ کے ساتھ
بے بصیرت پہ ہدایت نے کیا کچھ نہ اثر — ہے یہ افسوس کہ آنکھیں نہ کھلیں راہ کے ساتھ
رنگ تیرا ہمیں مطبوع نہیں اے دنیا — تجھ میں ہم جی تو رہے ہیں مگر اکراہ کے ساتھ
دوست کہتے ہیں تغزل نہیں تجھ میں اکبرؔ
دل لگانا ہی پڑا اب بتِ گمراہ کے ساتھ

---

[1] جہاز

دیکھئے ربطِ نسیمِ سحر و غنچہ و گل
یونہیں دل کھول کے ملتے ہیں ہوا خواہ کے ساتھ

شورِ تحسین تو سخن پر ہے تمہارے اکبرؔ
زر کی جھنکار بھی سنتے ہو کہیں واہ کے ساتھ

ہو گیا عشق تری زلفِ گرہ گیر کے ساتھ
سلسلہ دل کا ملا تھا اسی زنجیر کے ساتھ

لذتیں کرتی ہیں انسان کو دنیا میں ہلاک
زہر دیتی ہے یہ ظالم شکر و شیر کے ساتھ

پیار کے ساتھ خوشامد بھی کروں گا شبِ وصل
ہے یہ لازم کہ دعائیں بھی ہوں تدبیر کے ساتھ

جنبشِ ابروئے قاتل کا اشارہ ہے یہی
کام چلتا ہے جو دنیا میں تو شمشیر کے ساتھ

عمر زنداں میں کٹی شوقِ رہائی رخصت
ہو گیا انس مرے پاؤں کو زنجیر کے ساتھ

یاں کے معشوقوں کو مرشد نہ کریں کیوں آزاد
زہرہ جب ناچ رہی ہے فلکِ پیر کے ساتھ

مست ہے نغمۂ بلبل سے چمن میں اکبرؔ
آپ محفل میں سنیں راگ مزامیر کے ساتھ

میری تقدیر موافق نہ تھی تدبیر کے ساتھ
کھل گئی آنکھ نگہباں کی بھی زنجیر کے ساتھ

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ

ناتوانی مری دیکھی تو مصوّر نے کہا
ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

ہو گیا طائرِ دل صیدِ نگاہِ بے قصد
سعیِ بازو کی یہاں شرط نہ تھی تیر کے ساتھ

لحظہ ہے ترقی پہ ترا حسن و جمال
جس کو شک ہو تجھے دیکھے تری تصویر کے ساتھ

بعد سیّد کے میں کالج کا کروں کیا درشن
اب محبت نہ رہی اس بتِ بے پیر کے ساتھ

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

رات پروانہ یہ کہتا تھا عجب ناز کے ساتھ — خضر کا کام نہیں سالکِ جانباز کے ساتھ
شانِ مذہب پہ رہا فلسفہ حیران مدام — اس قدر جوشِ جنوں اور اس اعزاز کے ساتھ
کیا ہوا کوئی جو اکبر کا ہم آہنگ نہیں
باغ میں نغمۂ بلبل بھی نہیں ساز کے ساتھ

مجھ کو محبت اب نہ رہی زندگی کے ساتھ — کیا زندگی گذر نہ سکے جب خوشی کے ساتھ
خلق نکو کو سب نے خوشامد سمجھ لیا — کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب آدمی کے ساتھ

یہ ابرِ زلف یہ برقِ نظر معاذ اللہ — اگرچہ حسین ہے دل کش مگر معاذ اللہ
میں کیا کہوں شب فرقت میں مجھ پہ کیا گذری — عجیب حال رہا رات بھر معاذ اللہ
بتوں کے عشق میں کیا کچھ نہیں کیا میں نے — بہت رہی ہے لب شیخ پر معاذ اللہ
طلسم حسنِ بتاں کے نہ پوچھئے احوال — دہن کا ذکر ہی کیا ہے کمر معاذ اللہ
جناب شیخ پھر آخر بسر کریں کیونکر — جدھر اٹھاتا ہوں آنکھیں ادھر معاذ اللہ
جو منھ لگائے وہ بت شیخ بھی پڑھیں الحمد — یہ دور ہی سے ہے بس اس قدر معاذ اللہ
فریبِ چشم ہے خوانِ جہاں کا رنگ اکبر
مزا زبان کا فتنہ اثر معاذ اللہ

یہ عمر یہ حسن اور ناز و ادا اس پر یہ سنگار اللہ اللہ — مستیٔ نگہ اُف اُف کی جگہ سینے کا ابھار اللہ اللہ
یہ گیسوئے پیچاں دام خرد یہ نرگس قتل دشمنِ دیں — یہ عارضِ رنگیں غیرتِ گل ہستی کی بہار اللہ اللہ
گالوں میں ترے کندن کی دمک بالوں میں ترے عنبر کی مہک — سینے پہ جواہر کی یہ چمک اور اس پہ یہ ہار اللہ اللہ
بکھری ہوئی زلفیں دام بلا یہ جنبش مژگاں تیرِ قضا — تقویٰ کی عدو یہ لغزشِ پا یہ رنگِ خمار اللہ اللہ

خود خامۂ قدرت نازاں ہے ہر چشمِ تماشا حیراں ہے　　اس صفحۂ عنصرِ خاکی پر یہ نقش و نگار اللہ اللہ

اسلام میں اکبرؔ کو یہ غلو یہ رنگ ورع یہ زہد کی بُو

اور اُس بُتِ کافر کا ان کو یہ عشق یہ پیار اللہ اللہ

کیا رہے دورِ فلک میں کوئی تمکین کے ساتھ　　جب زمانہ نہ چلے ایک ہی آئین کے ساتھ

غرب کی مدح بھی ہے شرق کی تحسین کے ساتھ　　ہم پیانو بھی بجانے لگے اب بین کے ساتھ

اس تماشا گہہ ہستی میں مجھے حیرت ہے　　اک نیا فلسفہ ہو جاتا ہے ہر سین کے ساتھ

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا　　اُنس اس وجہ سے کم رکھتے ہیں یاسین کے ساتھ

مخلصانہ جو نہ ہو مدح تو کیا لطف آئے　　چشم غمازکی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ

دل دیا، مال دیا۔ پیار کیا اُن کو مگر

ان بتوں کو وہی کاوش ہے مرے دین کے ساتھ

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ　　حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

سوچ تجھ کو ہے اگر آیندہ پولیٹکس کی　　لے نتائج سے مدد اور ہسٹری میں فال دیکھ

شوق طول و پیچ اس ظلمت کدہ میں ہے اگر　　بات بنگالی کی سُن بنگالنوں کے بال دیکھ

دل یہ کہتا ہے کہ ہجرت ہند سے لازم ہے اب　　عقل کہتی ہے کہ اکبرؔ اور دو اک سال دیکھ

حسن میں پڑ کر نظر مذہب اگر جاتا ہے جائے

قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبرؔ مال دیکھ

ہنر سے بھی فوائد ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے　　سبب یہ ہے کہ ہم آپس میں یکدل ہو نہیں سکتے

حکومت ایشیا پر قسمتِ مغرب میں ہے جب تک　　کمالات اس کے جو ہیں ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے

اثر ہے طاعت و حسنِ عمل کا گو کہ قیمت پر — مگر اس انجمن میں لوگ داخل ہو نہیں سکتے

معیّن ہی نہیں جن کے اصول و ماخذ اے اکبرؔ

قیامت تک وہ سرداری کے قابل ہو نہیں سکتے

اگر اندازۂ قوت سے تمنا نہ بڑھے — رنج پیدا ابھی جو ہو دل میں تو اتنا نہ بڑھے

حرص گھٹ جائے وہی نعمت عظمیٰ ہوگی — یری دولت نہیں بڑھنے کی تو اچھا نہ بڑھے

اسی مٹّی کو دیکھ اکبرؔ اگر ذوقِ تعقّل ہے — کہیں ٹہنی کہیں پتّی کہیں غنچہ کہیں گل ہے

وہی انساں وہی آنکھیں وہی جینا وہی مرنا — کہیں اللہ اکبر ہے کہیں الحاد کا غل ہے

گلستانِ سخن ہے بزم ساقی فیضِ معنی سے

زبانِ خامہ اکبرؔ ہے یا منقارِ بلبل ہے

منظور مجھے شکوۂ بیدادِ بتاں ہے — للّٰہ بتا دے کوئی اللہ کہاں ہے

ہوا ہوں شاہ جنوں کی خوش انتظامی سے — خدا بچائے مجھے ہوش کی غلامی سے

نشان کھو کے بگولے کی طرح اٹھتے ہیں — تو خاک خوش ہوں ہم ایسی بلند نامی سے

اٹھے گا فتنۂ محشر تو ان کا کیا نقصان

وہ باز آئیں گے کیوں مشق خوش خرامی سے

رنگ دیکھے جہانِ فانی کے — کھیل ہیں دورِ آسمانی کے

شیخ سے مجھ سے اب نہیں ہے بگاڑ — ہو چکے ولولے جوانی کے

منزلوں دور اُن کی دانش سے خدا کی ذات ہے
خوردبین اور دوربین تک ان کی بس اوقات ہے

تکلف انہیں کے لئے کیجئے
فقیروں کی کیا ہے جہاں پڑ رہے
بتوں سے بھی لڑتی نہیں یاں تو آنکھ
برہمن ہیں لندن تلک لڑ رہے

طلب ہے حق کی تو مل آ کے ہم سے مستوں سے
نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے

حلقے نہیں ہیں زلف کے حلقے ہیں جال کے
ہاں اے نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کے
پہونچے ہیں تا کمر جو ترے گیسوئے رسا
معنی یہ ہیں کمر بھی برابر ہے بال کے
بوس و کنار و وصل حسیناں ہے خوب شغل
کمتر بزرگ ہوں گے خلاف اس خیال کے
قامت سے تیرے صانعِ قدرت نے اے حسیں
دکھلا دیا ہے حشر کو سانچے میں ڈھال کے
شانِ دماغ عشق کے جلوے سے یہ بڑھی
رکھتا ہے ہوش بھی قدم اپنے سنبھال کے
زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں
سب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے
ہستیٔ حق کے سامنے کیا اصل این و آں
پتلے ہیں سب یہ آپ کے وہم و خیال کے
تلوار لے کے اٹھتا ہے ہر طالب فروغ
دورِ فلک میں ہیں یہ اشارے ہلال کے
پیچیدہ زندگی کے کرو تم مقدمے
دکھلا ہی دے گی موت نتیجہ نکال کے

دل کش صدائے صُور تو ایسی نہ تھی مگر
تعظیم حشر کے لئے سب اُٹھ کھڑے ہوئے
تہذیب مغربی کی بھی ہے وارنش غضب
ہم کیا جناب شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

نکل جائے دم غم سے جب آہ نکلے — مصیبت میں ہوں کوئی تو راہ نکلے
میں سمجھا تھا اے گنجِ قناعت کا ساتھی — مگر آپ تو شائقِ جاہ نکلے
مزاج شریف ان میں باقی نہیں ہے — تو کیا منہ سے الحمدللہ نکلے

ترے بعد اکبرؔ کہاں ایسی نظمیں
وہ دل ہی نہ ہوں گے کہ یہ آہ نکلے

دل زلف کے کوچے میں شاداں نہ رہا پھر کے — صد شکر کہ بچ نکلا احسان سے کافر کے
ایمان کے دشمن ہیں جلوے بتِ کافر کے — فتنے تو ذرا دیکھو ترکیبِ عناصر کے
اے غولِ ہوس کب تک یہ شمع فریب آخر — رہرو تو ترے سب ہیں ظلمت ہی میں ہیر پھر کے
بھائے جو نہ ہم تجھ کو کر ناز نہ اے دنیا — ہم عرش پہ پہونچے ہیں نظروں سے تری گر کے
باطن نہ کرے تیرہ مقبول ہے وہ ظاہر — رکھتے ہیں نظر ہم بھی منکر نہیں ظاہر کے
گذرے جب ادھر سے وہ سرگرم فغاں تھا میں — تسکین تو کیا دیتے دیکھا بھی نہیں پھر کے
اسٹیج پہ دنیا کے کیا سین دکھاؤ گے — کیا لطف اٹھا پردہ درجے سے اگر گر کے
دنیا کو اقامت کا سمجھے ہو محل شاید — ایسے تو نہیں ہوتے سامان مسافر کے

حصے میں بتوں ہی کے آئی تری عمر اکبرؔ
اللہ کو اب دے دے دو دن تو یہ آخر کے

میں شیفتہ ہوں آپ سے بے مثل حسیں کا — حیراں ہوں مرے کام سنور کیوں نہیں جاتے
جب کہتا ہوں مرتا ہوں مری جان میں تم پر — فرماتے ہیں مرنے ہو تو مر کیوں نہیں جاتے
وہ نیند میں ہیں شہر میں پھرنے لگے پہرے — پوچھے کوئی اکبرؔ سے یہ گھر کیوں نہیں جاتے

دشمنِ راحت جوانی میں طبیعت ہو گئی — جس حسیں سے مل گئیں آنکھیں محبت ہو گئی
باغِ ہستی میں مری ناکامیوں کا رنگ دیکھ — جو تمنا دل میں آئی داغِ حسرت ہو گئی
کھو دیا تمکینِ دیں کو تو نے اے نقشِ نمود — عزّت اصلی نثارِ نامِ عزّت ہو گئی
شیخ دم سازِ پیانو ہو کے بھولے اپنی لے
گو سُریلے ہو گئے لیکن بُری گت ہو گئی

ہر جنبشِ نگاہِ خرد اک حجاب ہے — عارض پر ان کے جلوۂ ہستی نقاب ہے
آرام کی تلاش نے رکھا ہے بے قرار — ہر خواہشِ سکوں سببِ اضطراب ہے

نہ روحِ مذہب نہ قلبِ عارف نہ شاعرانہ زبان باقی — زمیں ہماری بدل گئی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی
شبِ گذشتہ کے ساز و ساماں کے اب کہاں ہیں نشان باقی — زبان شمعِ سحر پہ حسرت کی رہ گئی داستان باقی
جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر — خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں یقین رخصت گمان باقی
فضول ہے ان کی بد دماغی کہاں ہے فریاد اب لبوں پر — یہ وار پر وار اب عبث ہیں کہاں بدن میں ہے جان باقی
میں اپنے مٹنے کے غم میں نالاں ادھر زمانہ ہے شاد و خنداں — اشارہ کرتی ہے چشمِ دوراں جوان باقی جہان باقی
اسی لئے رہ گئی ہیں آنکھیں کہ میرے مٹنے کا رنگ دیکھیں — سنوں وہ باتیں جو ہوش اُڑائیں اسی لئے ہیں یہ کان باقی
تعجب آتا ہے طفلِ دل پر کہ ہو گیا مستِ نظمِ اکبر
ابھی مڈل پاس تک نہیں ہے بہت سے ہیں امتحان باقی

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے — ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے
ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ ہیں باتیں — اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے
اُس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ — مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق دہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا — مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلّی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو، یاں جی میں کہ سب سہہ لو — ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے — ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبّا فطرت کے کرشمے ہیں — بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا — برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے

سچ کہتے ہیں شیخ اکبر ہے طاعتِ حق لازم
ہاں ترکِ مے و شاہد یہ ان کی بزرگی ہے

دیکھیں پروانے کو دعووں پہ ابھرنے والے — عشق اسے کہتے ہیں یوں مرتے ہیں مرنے والے

نہ رہا یاد انہیں کیا اثرِ فصلِ خزاں — کیوں جوانانِ چمن پھر ہیں سنورنے والے

تیز رفتار نہ ہو اس قدر اے موجِ فنا — تجھ میں کچھ قطرے ہوا سے ہیں ابھرنے والے

حیرت انگیز ہے یہ رعبِ بتاں اے اکبر
ان سے اب ڈرتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے

جلوۂ گل نے چمن میں مجھے بے چین کیا — مل ہی جاتے ہیں تری یاد دلانے والے

دیدنی آج ہے اس بزم میں دنیا کا جمال — دم بخود بیٹھے ہیں عقبیٰ سے ڈرانے والے

چشمِ بد دور جنوں کی ہے ترقی مجھ میں — کیوں نہ ہو مست ہیں خود ہوش میں لانے والے

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں — جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

نہ انہیں ساز کی حاجت ہے نہ سامع کی تلاش — خوب ہیں فصلِ بہاری کے یہ گانے والے

تیغِ قاتل نے یہ کیا اپنے دکھائے جوہر
سر بکف پھرتے ہیں اب جان چرانے والے

ذوقِ عرفاں جو نہ ہو بادہ پرستی اچھّی
ہوش اگر دین سے غافل ہو تو مستی اچھّی

بُت جو مہنگے ہیں تو ہم یادِ خدا کیوں نہ کریں
ہم غریبوں کو وہی شے جو ہے سستی اچھّی

بحث اس وقت نہیں مقبرہ و مسجد کی
مگر الحاد سے ارواح پرستی اچھّی

شیخ ہوں شہر میں اور کمپ میں سیّد ہوں یہ کیا
جس میں مل جل کے رہیں سب وہی بستی اچھّی

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنّا میں خودکشی کر لی

نگاہِ نازِ بتاں پر نثار دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

جو حسنِ بت کی جگہ حلم مس ہوا قائم
تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

زوالِ قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب
تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی

شکوۂ بیداد سے مجھ کو تو ڈرنا چاہیئے
دل میں لیکن آپ کو انصاف کرنا چاہیئے

ہو نہیں سکتا کبھی ہموار دنیا کا نشیب
اس گڑھے کو اپنی ہی مٹّی سے بھرنا چاہیئے

جمع سامانِ خود آرائی ہے لیکن اے عزیز
جس کی صورت خوب ہو اس کو سنورنا چاہیئے

کیوں نہ لوں نامِ خدا اس بت کی صورت دیکھکر
لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہیئے

برسرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگذرد
ہجر کی شب کو بھی اے گردوں گذرنا چاہیئے

عاشقی میں خندہ روئی سالکوں کو ہے محال
ہے یہی منزل کہ چہرہ کو اترنا چاہیئے

ہر عمل تیرا ہے اکبر تابعِ عزمِ حریف
جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی
دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو
ہمیں سے داد بھی چاہیں خوش امتیازی کی

مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا
کہ قدر اٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی

بہت خلوص سے حاضر رہا میں خدمت میں
مگر حضور نے مجھ سے زمانہ سازی کی

خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا
کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی

ہمیشہ پیش نظر ہیں وضو شکن منظر
اس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی

ہم اپنے حال پہ افسوس کیا کریں اکبرؔ
خدا نے شان دکھائی ہے بے نیازی کی

چھڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہے نئی دھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی

یہ رنگ حسنِ گل یہ نغمۂ مستانۂ بلبل
اشارہ کرتی ہے فطرت ادھر آ دیکھ بھی سُن بھی

بڑے درشن تمہارے ہو گئے راجا کی سیوا سے
مگر من کا پنپنا چاہتے ہو تو کرو پُن بھی

ہوئے روشن یہ معنی چاند کیوں شاعر کو پیارا ہے
کمال اس میں یہ ہے عارض بھی ہے ابرو بھی ناخن بھی

جوش میں لائے صبا جس کو وہ خون اچھا ہے
بوئے گل جس کو ابھارے وہ جنون اچھا ہے

جوش میں آئے جو قرآں سے وہ خون اچھا ہے
کفر پر غصّہ دلائے وہ جنون اچّھا ہے

دل دھڑکنے لگا آئی جو نظر اس کی جھلک
بہر تاثیر محبّت یہ شگون اچّھا ہے

ہاتھ اٹھائیں گے نہ یہ دامن منصوری سے
اہل تہذیب کو دنیا میں یہ دون اچّھا ہے

دوپہر کو مرے گھر آئی مس رشک قمر
کہہ دیا میں نے کہ یہ نون کا مون اچّھا ہے

مرا دل ان بتوں کے ہاتھ سے واللہ ٹوٹا ہے
خدا ہی ان سے سمجھے گا خدا کے گھر کو لوٹا ہے

خوشی کا رنگ ہے دل میں نہ سرسبزی امیدوں کی
ہمارا باغ ویراں ہو گیا گل ہے نہ بوٹا ہے

ترے کوچے میں دل نالاں الگ ہے دین سے چھٹ کر
تعجب کیا ہے اس میں مدتوں کا ساتھ چھوٹا ہے

تو نے کب دل کی مرے اے بت عیار سنی
جو سنی بات بلا کر سر دربار سنی

چھوڑ اس بحث کو کچھ اور بیاں کر اکبر
یہ کہانی تری یاروں نے تو سو بار سنی

ابھرا ہے رنگ سودا دیوانگی ہری ہے
ہے جوش موسم گل جو پھول ہے پری ہے

شمع اور پتنگ سے ہے ہر صبح وعظ عبرت
یہ بھی مرے پڑے ہیں وہ بھی بجھی دھری ہے

دور گردوں میں کسی نے میری غم خواری نہ کی
دشمنوں نے دشمنی کی یار نے یاری نہ کی

حشر کا سودا ہوا ذوق جمال دوست میں
ہم نے بازار جہاں میں کچھ خریداری نہ کی

غم دیا اپنا مگر پروائے غم خواری نہ کی
دل ستانی آپ نے فرمائی دلداری نہ کی

ٹھٹھوں کی مشق سے میں نے نکالا اپنا کام
جب کسی نے قدر آہ و نالۂ و زاری نہ کی

شوق کی مستی میں میں دیوانہ ہو کر رہ گیا
حسن کے نشہ نے اس پر بیہوشی طاری نہ کی

کوئے جاناں کا پتہ دے کر میں پہونچا خلد میں
مجھ سے کچھ رضواں نے بحث ناجی و ناری نہ کی

شیخ بھی کھسکے مریدوں کو جو دیکھا منتشر
جب محیط آوارہ تھا مرکز نے خود داری نہ کی

وقت سائے کا ابھی آیا نہیں مغرب ہے دور
کیوں پسند اس برق وش نے مشرقی ساری نہ کی

جامہ زیبوں کی نظر بھی دلق اکبر پر پڑی
شان ہی کچھ اور تھی اس خرقۂ پارینہ کی

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

مستیٔ نشو و نما ہے فصلِ گل کا جوش ہے — ہے ہوا میں فیضِ ساقی ہر کلی مے نوش ہے

بزم میں ایمائے چشمِ ساقیٔ مے نوش ہے — وہ بہک جانے کے خطرے میں ہے جسکو ہوش ہے

شوقِ وصلِ شعلہ خوباں کیوں نہ ہو برسات میں — ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

حال میری بے قراری کا بھی کچھ سُن لیجئے — یہ بھی اک آویزہ ہو بجلی جو زیبِ گوش ہے

تا بکے دید حسیناں تا بکے وارفتگی — آنکھ میں جب تک نظر ہے سر میں جب تک ہوش ہے

آئینے سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس — شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے

کیوں نہ اپنے بل پہ نازاں ہو وہ زلفِ پُرشکن — اس کی خود بینی کو آئینہ صفائے دوش ہے

ہے اگر امید فردا ہی پہ صرف اس کی بنا
کل نہ ہوگا آج اکبرؔ کے جو دل میں جوش ہے

نورِ باطن کی تجلّی حرصِ دنیا میں کہاں — دامنِ طولِ امل اس راہ میں حق پوش ہے

جس کے آنکھیں ہیں وہ ہے دیوانہ چشم آفریں — عالمِ عرفاں میں جو ذی ہوش ہے بیہوش ہے

جب ضرورت ہوگی تقویٰ کی تو دیکھا جائے گا — اب تو بزمِ مغربی ہے اور نوشا نوش ہے

ان کا تیر پالسی اور شیخ و بابو کا گریز — خوب ہی لطفِ شکار روبہ و خرگوش ہے

اتحاد باہمی اس ملک میں آساں نہیں — کوئی سر سیّد ہے کوئی بابو آشوتوش ہے

کیسے کیسے زرنگار ایواں ملے ہیں خاک میں — ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے

حضرتِ منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ — دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

مفلسی میں بھی تکلّف دوست ہے طبعِ بلند
سرو بستاں بے بضاعت ہے مگر خوش پوش ہے

دشمن بھی ہیں افسوس میں۔ یارب یہ ہے حالت مری
جینا تو اب دشوار ہے۔ کب آئے گی ساعت مری

طاقت نہ ہو جب ضبط کی۔ اظہار غم کیونکر نہ ہو
ہر دم اب تو آتش فگن سینے میں ہے حسرت مری

شوخی اس کی دیکھو ذرا مجھ پر ظلم بے حد کیا
پوچھا میں نے کیوں ہے ستم۔ بولا یہ ہے عادت مری

پہلو میں وہ ہوں گے کبھی خوشیوں کی گھڑی وہ آئے گی
جاگے ہی گی اک وقت میں۔ سوتی گو ہے قسمت مری

اب بھی جو کہہ رہا ہو کہ پینا نہ چاہیئے　　اس دور عہد میں اسے جینا نہ چاہیئے
نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل　　بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

میں بت کا ہو رہا تو عبث شیخ کو ہے رنج
ایسے معاملات میں کینا نہ چاہیئے

دنیا میں امرِ حق کو کس طرح صاف کہیئے　　کرتا ہے دشمنی وہ جس کے خلاف کہیئے
یہ سرسری اشارہ کافی نہیں ہے حضرت　　اپنی زبان سے بھی لفظ معاف کہیئے

بے دشمن دیں راحتِ دنیا ہے تو کیا ہے　　قاتل ہو کوئی آنکھ تو جینے کا مزا ہے

ساتھ یاروں کے ہماری راحتِ دل اٹھ گئی　　ایک دو کا ذکر کیا محفل کی محفل اُٹھ گئی
قتل ہونے کی کسے امید تھی قسمت کی بات　　اتفاقاً میری جانب چشم قاتل اٹھ گئی

زلف میں دل کی گرفتاری بُری — سب مرض اچھے یہ بیماری بُری
ہوش سے عاشق کو بچنا چاہیئے — راہ دل میں یہ گرانباری بُری

آج سنئے آ کے اکبر سے کبیر
شیخ جی ہولی میں خودداری بُری

رُکتے ہیں دستِ دُعا اٹھتے ہوئے — ہے جو ہونا کیوں رہے گا بے ہوئے
کچھ بھی ہمدردی جوانوں سے نہیں — شیخ صاحب اب بہت بوڑھے ہوئے

ناچ ہے مغرب کا بزمِ دہر میں — جھومتے ہیں مشرقی بیٹھے ہوئے
نام یوسف سے ہوا یعقوب کا — یوں تو حضرت کے بہت بیٹے ہوئے

اللہ کا حال کچھ نہ پوچھو — دیکھا نہیں نام رکھ لیا ہے
واللہ ستم ہے یہ تکلف — کھایا کیا تم نے چکھ لیا ہے
سکّہ ہے کھرا مرے سخن کا — سب نے اس کو پرکھ لیا ہے

لن ترانی سے عیاں انوار پنہاں ہو گئے — ایک فقرے میں ہزاروں طور پنہاں ہو گئے
اے صبا اس باغ میں تیرا عمل ہے مشتبہ — ہنس دیئے گل ہو کے غنچے یا پریشاں ہو گئے
اس نے آنکھوں کے اشارے سے بڑھایا دل مرا — خواب میں دیکھا تھا دو کافر مسلماں ہو گئے
ناتوانی سے قناعت پر ہوئے مجبور ہم — ضعف کے اسباب عزت کے نگہباں ہو گئے
صبر و خودداری دلیری حق پرستی اب کہاں — رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے
ہو گیا آخر شکستِ دل سے کار دیں درست — داغ سینے کے چراغِ راہِ عرفاں ہو گئے

جلوہ ہائے منظرِ ہستی ہیں راحت میں مخل — وہم جب یکجا ہوئے خواب پریشاں ہو گئے

جو کہا اس نے کیا منظور کیا حرفِ نفی — ہم سراپا اب تو اس محفل میں جی ہاں ہو گئے

ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور — آپ خوش قسمت تھے بندر سے جو انساں ہو گئے

ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگزبیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

صورتِ لیلےٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس
شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

گرے جاتے ہیں ہم خود اپنی نظروں سے ستم یہ ہے — بدل جاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

طریقِ نو کو کیا سمجھا ہے تو منزل ترقی کی — نگاہِ پیش بیں میں جادۂ راہِ عدم یہ ہے

تحمل نالہ و فریاد کا ان سے کہاں ممکن — نہ ہوں برہم مری افسردگی پر مغتنم یہ ہے

نہ بے مہری کا شکوہ ہے نہ ہے سوزِ غمِ فرقت — تعارف آپ سے کیوں ہو گیا رنج و الم یہ ہے

کہاں تک رشکِ اکبر ساقی بزمِ حریفاں پر
سنبھالو دل کو تم اپنے تمہارا جامِ جم یہ ہے

جاری طریقِ فضل و عطا سب کے ساتھ ہے — دیکھو جو غور سے تو خدا سب کے ساتھ ہے

بیحد رسا ہیں گیسوئے دنیائے دوں کے پیچ — سب اسمیں ہیں پھنسے یہ بلا سب کے ساتھ ہے

کمبخت دل کو کیوں ہے لگاوٹ انہیں کے ساتھ
ان کو تو شوق ناز و ادا سب کے ساتھ ہے

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انہیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

سُنے جو اِس کو اُسے تحسین جو اِس کو برتے اُسے تردّد
ہماری نیکی اور ان کو برکت عمل ہمارا نجات اُن کی

بھلا دو میرے منہ سے بات اگر کوئی بری نکلی
یہ بیدردی ہے کہنا آہ بسمل بے سری نکلی

عدوِ جمعیتِ ملّت کا جو ہو ظن تھی اس پر
یہ کیا سمجھا عزیزوں نے مجھی پر کیوں چھری نکلی

عجب کہتے تھے تم جس کو وہ کمسریٹ کا خچر تھا
جسے شائستگی سمجھے تھے آخر کرِ کری نکلی

مجھے اس درس سے خواہش تھی روحانی ترقی کی
یہاں ہر چیز لیکن مادّی و عنصری نکلی

بتوں سے میل۔ خدا پر نظر یہ خوب کہی
شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی

فلیٹ نفیس، اسٹرک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

تمہاری خاطرِ نازک کا ہے خیال فقط
وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کہی

جناب شیخ کا ہو جاؤں معتقد معقول
نگاہ یار رہے بے اثر یہ خوب کہی

شباب و بادہ و فکرِ مآل کار چہ خوش
جنون عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

سوال وصل کروں یا طلب ہو بوسے کی
وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر یہ خوب کہی

حرف مطلب کی رسائی کیوں زباں تک ہو سکے
دل کو خودداری سکھا اکبر جہاں تک ہو سکے

وعدہ اقرار مفصّل کا تو کرتے ہو مگر
دیکھ لینا، وقت پر تم سے جہاں تک ہو سکے

سن رہا ہوں شوق سے دنیا کے قصوں کو مگر
دیکھتے رہنا جو ختم داستاں تک ہو سکے

نالہ و فریاد جائز ہے مصیبت میں مگر
صبر ہی بہتر ہے انساں کو جہاں تک ہو سکے

افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے
شاخ گلِ تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے
اس قوم سے وہ عادتِ دیرینۂ طاعت
بالکل نہیں چھوٹی ہے مگر چھوٹ رہی ہے
وہ راہ شریعت کی جہاں بچھتی تھیں آنکھیں
یہ کفر کے لشکر سے اسے کوٹ رہی ہے

فکر فردا میں عبث روز اک نئی تمہید ہے
آج تک ہم کیا ہوئے آیندہ کیا اُمید ہے
غافلوں کو جلوۂ ہستی بہار عید ہے
چشم بینا میں مگر یہ حشر کی تمہید ہے
قد موزوں دیکھئے جُوڑے کی بندش دیکھئے
کس قیامت کا ہے مصرع اور کیا تعقید ہے
مجھ کو اور ان کے مضامینِ کمر پر دسترس
ذہن کیسا بس یہ کہیئے غیب کی تائید ہے

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے
فنا اسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے
شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے
یہ دیکھتے ہو جو کاسہ سر غرور غفلت سے کل تھا مملو
یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے نظر ہو جس کی وسیع دیکھے
ابھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں یہ قلزم ابل رہا ہے
کہاں کا شرقی، کہاں کا غربی، تمام دکھ سکھ ہے یہ مساوی
یہاں بھی اک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو بدل رہا ہے
عروجِ قومی زوال قومی خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ ردّ و بدل کے اندر یہ امر پولٹیکل رہا ہے
جنہوں نے طاعت میں جان دی ہے انہیں کے حصّہ میں زندگی ہے
مقدموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے
خدا سے تم دل ملاؤ اپنا زبان کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لینا کہ پُر اثر ہے زبان سے جو نکل رہا ہے
جھکائیں اکبرؔ سر ارادت ہمیں تو امید کچھ نہیں ہے
اُدھر وہ شمشیر کھینچ رہی ہے اِدھر یہ خنجر سنبھل رہا ہے
مزا ہے اسپیچ میں ڈنر میں خبر یہ چھپتی ہے پانیر میں
فلک کی گردش کے ساتھ ہی ساتھ کام یاروں کا چل رہا ہے

جب آسمان اہل وفا ہی کا ہو رہے ہے — مومن کو چاہیئے کہ خدا ہی کا ہو رہے ہے
مجھ کو تو حبّ جاہ ہی ہے وجہ انتشار — دل میں تمہارے شوق جو شاہی کا ہو رہے ہے
اکبرؔ مریض ہے تو دعا بھی اسے سکھاؤ
ایسا نہ ہو کہ صرف دوا ہی کا ہو رہے ہے

گردن رفار مر کی ہر اک سمت تن گئی — بگڑی ہو قوم و ملک کی اُن کی تو بن گئی
لڑکے نئے طریق کی جانب جو کھنچ گئے — بوڑھوں کی آہ جانب چرخ کہن گئی
دم بھر میں جسم و روح کا قصّہ تمام تھا — مٹی میں مل گیا وہ یہ اپنے وطن گئی

دنیا میں بھی مست اثرِ نغمۂ کُن ہے — پردیس میں ہے روح مگر دیس کی دھن ہے
کی میں نے لگاوٹ تو بُتِ شوخ یہ بولا — کیوں کفر ہے بدنام جب ان میں بھی یہ گن ہے
ہنس دیتے ہیں بُت سن کے یہ اکبر کا لطیفہ
جب آپ کے درشن ہوں تو پھر پاپ بھی پن ہے

جانتی تھیں کہ ہنر شرط ہے قاتل کے لئے — دل لئے آپ کی آنکھوں نے مگر مل کے لئے
دل مرا ان کے لئے ہے وہ مرے دل کے لئے — ماسوا اس کے سب اندیشۂ باطل کے لئے
ہر قدم پر ہے فزوں لذّتِ سرگرمئ سعی — شوق نے خوب مزے دوریِ منزل کے لئے
ہے یہ وہ عہد کہ کی بزم کی تزئیں لیکن — آدمی مل نہ سکے رونقِ محفل کے لئے
دیدِ دنیا ہے رہِ عشق میں سالک کو مضر — خوب ہے قطعِ نظر قطعِ منازل کے لئے
مغربی کورس میں ہوتی ہے جوانی رخصت — اب تو پیری ہی ہے رندانہ مشاغل کے لئے
کیا ضرورت رہِ الفت میں سخن سازی کی
صدق کافی ہے بس اکبر اثرِ دل کے لئے

نہ پالیسی وہ رہی اور نہ آنجناب رہے — نئے طریق فقط جان پر عذاب رہے
اس انجمن میں اشارا ہے چشمِ ساقی کا — وہی مزے میں رہے جو یہاں خراب رہے
خزاں میں ہوش جب آئے گا خیر رولیں گے — بہار تک تو ہمیں نشۂ شراب رہے
امیدیں ہوتی تھیں پیدا تری لگاوٹ سے — نہ اب وہ لہر رہی اور نہ وہ حباب رہے
کہاں کا نام مجھے ہے نشان سے بھی گریز — مبارک آپ ہی کو خواہشِ خطاب رہے
اس اک گناہ کو منظور کیجئے تو مجھے
تمام اور گناہوں سے اجتناب رہے

مرے عشق کے سوز میں ہو نہ کمی۔ اجل آئے تو ایسی جفا نہ کرے
مری جان کو جسم سے کر دے الگ۔ مرے درد کو دل سے جدا نہ کرے

بُتِ شوخ کی دیکھ رہا ہوں نظر۔ مرے عشق کا کچھ بھی نہیں ہے اثر
جو میں کہتا ہوں کاش ہو تجھ میں وفا۔ تو وہ کہتا ہے ہنس کے خدا نہ کرے

مجھے عشق و وفا کی سند نہ ملے جو میں ضبط سے صبر سے کام نہ لوں
وہاں حُسن کے ناز میں آئے کمی۔ جو وہ حقِ ستم کو ادا نہ کرے

عدو فلک بھی رہا گردشِ زمیں بھی رہی ۔ مگر وہ در بھی رہا اور مری جبیں بھی رہی
نظر میں آیت اِیّاکَ نَستَعِیں بھی رہی ۔ صنم کے پاؤں پہ لیکن مری جبیں بھی رہی
تری اداؤں سے بڑھنے نہ پائی جرأت دل ۔ ہنسی جو لب پہ رہی تو جبیں پہ چیں بھی رہی
ہزاروں ظلم ہوئے بے کسوں پہ ہاں لیکن ۔ وہی فلک بھی رہا اور وہی زمین بھی رہی
خلوص ان میں نہ تھا اس سبب سے دل نہ ملا ۔ گئیں تو خوب اُڑیں اور چناں چنیں بھی رہی
کچھ انتظار میں موقع کے طولِ ہجر ہوا ۔ کچھ ابتدائے محبّت میں ہاں نہیں بھی رہی
میں کیا ہوں خوش اگر ان کو رہی نہ الفتِ غیر ۔ ملیں گے اس سے محبّت اگر نہیں بھی رہی
اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں مستند اکبرؔ
جسے مشاغلِ دنیا میں فکرِ دیں بھی رہی

دل ہمارا کس قدر نا عاقبت اندیش ہے ۔ ہو رہا اس کا کہ جو بے مہر و کافر کیش ہے

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آ کے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل دامِ بلا - میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامنِ دل کو جو کھینچ سکے - کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبتِ غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دمِ چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل - وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ نبھی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا - یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا - مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں وطن سے حزین و ملول پھرا نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غمِ ہجر میں جی سے گیا جو گذر - تو یہ اکبرِ زار نے خوب کیا
کہ علاجِ فراق تو تھا ہی یہی - بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

اللہ رے کامیابی اُس چشمِ پرفسوں کی | عقلیں ہزار ابھریں تابع رہیں جنوں کی
تنویر چاہتا ہے گر آتشِ دروں کی | ہو اس کا محو جس نے مٹّی میں روح پھونکی
نشتر لگائے جا تو اے رنجِ نا اُمیدی | دل کو ابھی شکایت باقی ہے جوشِ خوں کی
اس وقت کوئی دیکھے تاثیرِ سازِ مغرب | جب ناچ ہو مسوں کا اور گت ہو ارغنوں کی
آفاق پر ہیں طاری آثارِ شامِ غم کے | اللہ دل کو قوت دے صبر کی سکوں کی

فطرت نے باغِ ہستی پیشِ نظر کیا ہے
دیکھو بہار اکبر اس روئے لالہ گوں کی

کیا پا گئے جو حرص کے کوچے میں سگ رہے | وہ کیا بُرے رہے کہ جو اس سے الگ رہے
اپنی جگہ سے تم نہ ہٹو گو ہوں گردشیں | ایسے رہو کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے

اکبرؔ انہیں کو لذت یاد خدا ملی
سمجھے جو کافری کو اور اس سے الگ رہے

دن رات کی یہ بے چینی ہے یہ آٹھ پہر کا رونا ہے
آثار بُرے ہیں فرقت میں معلوم نہیں کیا ہونا ہے

دنیا کے لئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آپ ایک طرف
اب شہر خموشاں عالم ہو مٹی ہے لحد کا کونا ہے

کیوں پست ہوئی ہے ہمت دل کیوں روک رہی ہے مایوسی
کوشش تو ہم اپنی سی کر لیں ہوگا تو وہی جو ہونا ہے

ترکیب و تکلف لاکھ کرو فطرت نہیں چھپتی اے اکبرؔ
جو مٹی ہے وہ مٹی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے

نظر لطف سے بس اک ہمیں محروم رہے
اور کیا عرض کریں آپ کو معلوم رہے

جوششِ سودا کو طبع لاابالی چاہیئے
منظر مجنوں کو تصویر خیالی چاہیئے

ان کے مضمون کمر کا باندھنا آساں نہیں
مدتوں مشاقیِ نازک خیالی چاہیئے

ہر درِ مے خانہ اکبرؔ کے لئے دل کش نہیں
بادہ صافی چاہیئے اور ظرف عالی چاہیئے

نظر کن سوئے او تا نور چشم قدسیاں باشی
بنہ سر بر زمینِ کوئے او تا آسماں باشی

زفیض راستی چوں سرو گشتی اندریں گلشن
بزن گامے براہ سعی تا سرور رواں باشی

شریک بزم کسی بودن ترا با ہمدماں اکبرؔ
ازاں بہتر کہ در بزمِ حریفاں شادماں باشی

چل رہی ہے جس طرح دنیا کو چلنے دیجئے
مل رہی ہے ہاتھ اگر منطق تو ملنے دیجئے

قوم اب کہاں ہر اک کی خوشی غم کے ساتھ ہے
سچ تو یہ ہے کہ میں کا مزا ہم کے ساتھ ہے

دل کو آماجگہ تیرِ قضا کرتی ہے
حسن کا حق وہ نظر خوب ادا کرتی ہے

تمہاری چشمِ فتاں سب کے دل سے ساز کرتی ہے
ہماری آرزو کو کیوں نظر انداز کرتی ہے
بہار آئی ہے گویا اب نجائے گی گلستاں سے
کھلی پڑتی ہیں کلیاں بھی ہوا بھی ناز کرتی ہے
اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا
اگر سمجھو تو ہر پتّی بیانِ راز کرتی ہے

شیخ نے ناقوس کے سُر میں جو خود ہی تان لی
پھر تو یاروں نے بھجن گانے کی کھل کر ٹھان لی
مدّتوں قائم رہیں گی اب دلوں میں گرمیاں
میں نے فوٹو لے لیا اس نے نظر پہچان لی
رو رہے ہیں دوست میری لاش پر بے اختیار
یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اس کی جان لی
میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا
رہ گئے نغمے حُدی خوانوں کے ایسی تان لی
حضرت اکبرؔ کے استقلال کا ہوں معترف
تا بہ مرگ اُس پر رہے قائم جو دل میں ٹھان لی

اب خاک پہ ہیں کل تخت پہ تھے اک زیست کی حالت وہ بھی تھی
اللہ کی قدرت یہ بھی ہے اللہ کی قدرت وہ بھی تھی
پریاں بھی لگاوٹ کرتی تھیں اب دیو بھی مجھ سے کھنچتے ہیں
فطرت ہی کی صورت یہ بھی ہے فطرت ہی کی صورت وہ بھی تھی

انسان فقط عجز و دعا ہی کے لئے ہے　　جو عزّت و عظمت ہے خدا ہی کے لئے ہے

حیرت میں ختم ہو گئی انشائے زندگی　　حل ہو سکا نہ ہم سے معمّائے زندگی
اس زندگی نے خود ہی کیا ہے تجھے اسیر　　تجھ کو یہ کیوں ہے شوق و تمنّائے زندگی

جانتے ہیں کہ سدا خونِ جگر پینا ہے　　پھر خوشی کیا کہ ابھی ہم کو بہت جینا ہے

تجھے اُن سے ہے سرِ دوستی تری آرزو بھی عجیب ہے
وہ ہیں تخت پہ تو ہے خاک پر وہ امیر ہیں تو غریب ہے
پئے حفظِ جاں ہیں جو کوششیں وہ اجل کے ساتھ ہیں سازشیں
اور اسی روش پہ ہیں خواہشیں یہ معاملہ بھی عجیب ہے
ترا جلوہ زیبِ خیال ہے وہی وجد ہے وہی حال ہے
تری انجمن سے ہوں دور اگر مرا دل تو مجھ سے قریب ہے
اسے انجمن کا خیال کیا جو ہو محو تاروں کی چال کا
وہ نظر زمین پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے
جو خدا کا حکم ہے خوب ہے مجھے توبہ کرنے میں عذر کیا
مگر ایک بات ہے واعظا کہ بہار اب تو قریب ہے

پیش آ جائے جو مسجد تو نمازی بھی سہی　　بت جو موقع پہ ملیں دست درازی بھی سہی
گالیاں اس نے جو دیں وصل کا طالب میں ہوا　　کہدیا صاف کہ ترکی ہے تو تازی بھی سہی
تارک الوضعوں میں دو چار نے پایا ہے عروج　　خیر اتنے شہدا تھے تو یہ غازی بھی سہی

اس نے یہ کہہ کے تھیٹر میں غزل گائی مری	تیری خاطر سے اک آہنگ حجازی بھی سہی

ایک دن چشم کرم بھی ہو ادھر اے قاتل
ظلم کے ساتھ کبھی بندہ نوازی بھی سہی

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوا الابصار کی	چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی
سوز جاں ہوتی ہے جنبش ابروئے خمدار کی	آگ کر دیتی ہے دل کو آب اس تلوار کی
ہے گرانی قلب پر اوہام کے انبار کی	حاجت اس خرمن کو ہے برقِ نگاہ یار کی
دھوم ہے زیرِ فلک حسن و جمال یار کی	ذرّے ذرّے سے عیاں ہے آرزو دیدار کی
دست گل چیں پھر رہا ہے شاخ گل پر بے دریغ	کون سنتا ہے چمن میں عندلیب زار کی
الفت ان کی نرگس فتاں کی ہے آرام سوز	نیند اڑا دیتی ہے یاد اس فتنۂ بیدار کی

دستِ گلچیں کے لئے فطرت میں ہیں یہ کاوشیں	چشم بلبل کے لئے زحمت نہیں ہے خار کی
وہ ادا اس وقت تم نے کی کہ دل تڑپا دیا	اب نہ کہنا بے محل کیا تھی ضرورت پیار کی
خوش ہو دنیا جانتی ہے یہ بھی یونہی ہونگے خوش	خلق و عالم کو خبر کیا میرے حالِ زار کی
سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو	حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی
غیر بے ترکیب کیا جانے بھلا آدابِ عشق	کیجئے گا آپ اک دن قدر میرے پیار کی
ہے زلیخا کا سا گاہک حضرت یوسف سا مال	دیدنی ہے آج رونق مصر کے بازار کی

شعر تر اکبر کے سن اے سامعِ عالی دماغ
قدر کر اے آسماں اس ابر گوہر بار کی

کیا ہے مذہب۔ ایک ملکی اور سوشل انتظام	یہ نہیں پہچان ہر گز کافر و دیندار کی

صورت و الفاظ کا اکثر نہیں ہے اعتبار
ہیں فقط یہ عادتیں رفتار کی گفتار کی
ہیں ہر اک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی
یاد رکھ تو بات یہ اک محرم اسرار کی

مفتون ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے
آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے

ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں
اٹھے جو ہیں بگولے بر باد ہوں گے تن کے
گونجی بہت ہے اس میں فریادِ بیکسوں کی
ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبد کہن کے
غربت میں عمر گذری نام و نشاں نہ پوچھو
نقشے بھی ذہن میں اب باقی نہیں وطن کے
زخموں سے چُور ہیں ہم اس کا خیال کس کو
چرچے ہیں ہر طرف بس تیرے ہی بانکپن کے
تھی نیک سعی تیری اے بادِ صبح گاہی
تجھ کو کیا معطر کلیوں نے پھول بن کے

مغرب کا وعظ ادھر بھی اے پیرِ ملت تو
اس شہر میں بھی مر دے محتاج ہیں کفن کے

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جان
حشر کہتا ہے منالی جائے گی
اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی
بے تکلف چاہیے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائے گی
کیا غمِ دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھا لی جائے گی
زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے لے کر چلا لی جائے گی
شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگا لی جائے گی

یادِ ابرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

پاس خاطر تھا اگر تو رنج کیوں ہم کو دیئے
اب عبث ہے اس کی پرسش دل بھر آیا رو دیئے
بوسہ رخ کی طلب تیرِ مژہ سے رک گئی
اس نے شوخی سے رہِ گلچیں میں کانٹے بو دیئے

مری رسائی ہے دیر میں بھی حرم میں بھی میری منزلت ہے
بتوں سے بوسے کی ہے توقع خدا سے امید مغفرت ہے
جھکا ہے سر اپنا پائے بت پر زبان پر ہے گلا جفا کا
مرے عمل میں ہے طرزِ سید غزل میں انداز لاجپت ہے

وصل نے کب مجھے سلایا ہے
ہجر ہی نے سدا رلایا ہے
میں نے کب کی نگاہ گل کی طرف
تم نے کیوں مجھ سے منہ پھلایا ہے
کیا خوشی ہو جو کوئی آ کے کہے
کہ انہوں نے تمہیں بلایا ہے

نہ وہ بت کدے کہیں رہ گئے نہ وہ دلبری کو صنم رہے
نہ وہ دن رہے نہ وہ ہم رہے نہ وہ دل رہا نہ وہ غم رہے
اب انہیں کے کوچہ کی دھوم ہے نہیں کرتا ذکر ارم کوئی
انہیں ضد بھی تھی ایسی بات کی کہ نہ ذکرِ باغ ارم رہے
مری رندیوں کا ہے خاتمہ نہ وہ مستیاں نہ وہ ولولے
نہ مئے کہن کا رہا نشاں، نہ طریقِ محفلِ جم رہے

مجھے کیا امید فروغ کی کہ بتوں کی تو ہے یہی خوشی
نہ یہ دل رہے نہ زبان رہے نہ خدا رہے نہ حرم رہے

کہاں وہ اب لطف باہمی ہے محبتوں میں بہت کمی ہے
چلی ہے کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے
مری وفا میں ہے کیا تزلزل مری اطاعت میں کیا کمی ہے
یہ کیوں نگاہیں پھری ہیں مجھ سے مزاج میں کیوں یہ برہمی ہے
وہی ہے فضلِ خدا سے اب تک ترقیِ کارِ حسن و الفت
نہ وہ ہیں مشقِ ستم میں قاصر نہ خون دل کی یہاں کمی ہے
عجیب جلوے ہیں ہوش دشمن کہ وہم کے بھی قدم رُکے ہیں
عجیب منظر ہیں حیرت افزا نظر جہاں تھی وہیں تھمی ہے
نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے یا جناب مکرمی ہے
کہاں کے مسلم کہاں کے ہندو بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے
نظر مری اور ہی طرف ہے ہزار رنگ زمانہ بدلے
ہزار باتیں بنائے ناصح جمی ہے دل میں جو کچھ جمی ہے
اگرچہ میں رند محترم ہوں مگر اسے شیخ سے نہ پوچھو
کہ اُن کے آگے تو اس زمانے میں ساری دنیا جہنمی ہے

جلوۂ دہر اپنا تماشا کرے فلسفہ الفاظ تراشا کرے

نہیں ہے علم ان میں جہل کی مستی کا جھگڑا ہے ۔۔۔ یہ باتیں غیر ثابت ہیں زبردستی کا جھگڑا ہے
فقط اک ہستی اعلیٰ کا پرتو دل میں پڑتا ہے ۔۔۔ جو کچھ اس کے سوا ہے وہم کی ہستی کا جھگڑا ہے

مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی ۔۔۔ مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست ۔۔۔ سلایا شب گور نے سو رہے

رشی ماشا سے نمبر پائیں کیوں خیر الامم پہلے ۔۔۔ ہمیں دل میں کریں انصاف تم پہلے کہ ہم پہلے
جماعت اور صف بندی کا ایما لعد کو ہوگا ۔۔۔ عزیزوں سے کہو مسجد میں تو رکھیں قدم پہلے
مقلد لیڈر مرحوم کے اتنا نہیں سمجھے ۔۔۔ غریبی اور محنت پہلے یا جاہ وحشم پہلے
کوئی صاحب نہوں ۔ للّٰہ ناخوش سن کے یہ مصرع ۔۔۔ خیالِ حُبِّ قومی پیچھے اور فکرِ شکم پہلے

نہ جوتی ہے زمیں تم نے نہ تم نے بیج بوئے ہیں
یہ کیا معنے کہ ہو لے بارشِ ابرِ کرم پہلے

نہیں ملنے کا لطف اس قوم بے تقوی و بے حس سے ۔۔۔ مگر یہ بھی تو مشکل ہے کہ پھر آخر ملیں کس سے
سنورنے کے سوا یہ بے بصیرت کرتے ہی کیا ہیں ۔۔۔ چمن کی کیا حفاظت ہو رہی ہے چشم نرگس سے
محبت کا تو عنصر ہی نہیں ان کی طبیعت میں ۔۔۔ لگاوٹ ہے فقط وہ بھی کبھی اِس سے کبھی اُس سے

خیال دوڑا : نگاہ اٹھی قلم نے لکھا ۔ زبان بولی ۔۔۔ مگر وہی دل کی الجھنیں ہیں کسی نے اس کی گرہ نہ کھولی
لطافتوں کے نزاکتوں کے عجیب مضموں ہیں چمن میں ۔۔۔ صبا نے جھٹکا ہے اپنا دامن مسک گئی ہے کلی کی چولی
خیال شاعر کا ہے نرالا کہہ گیا ایک کہنے والا ۔۔۔ شباب کے ساتھ یوں ہے رندی کہ جیسے پھاگن کے ساتھ ہولی
کہو یہ رندان ایشیا سے کہ بزمِ عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں ۔۔۔ اٹھا ان کھٹولا ہے اب ہنسوں کا گئی پری جان کی وہ ڈولی

تجربہ اور حساب پنج ضروری سمجھ
لاکھ کوئی کلّا و حاشا کرے

اُردو پہ یہ خدمتِ برگشتہ ہی بار
خیر اب اس کام کو بھاشا کرے

ہوس میری بصد حسرت بتوں کے منہ کو تکتی ہے
نہیں معلوم اب کیوں کافری مجھ سے کھٹکتی ہے

خموشی سے طریق راست پر قائم رہ اے اکبرؔ
نہ جا گفت و شنود دہر پر خلقت ہے بکتی ہے

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے
خدا باہر ہے حدِّ دوربیں سے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت
کبوتر اڑ گئے انجن کی بیں سے

بساطِ حلقۂ میونسپل دیکھ
تجھے کیا کام ہے جاپان و چیں سے

مہوشوں کی مہربانی ہو چکی
چار دن کی چاندنی تھی ہو چکی

عاقبت کا اب خیال آنے لگا
شورشِ عہدِ جوانی ہو چکی

قوم کی مسجد میں کیجے جھاڑ پھونک
اسپتالوں میں وہ اچھّی ہو چکی

آج تم کرتے ہو ذکر اختلاط
مدتیں گزریں کہ دھلی ہو چکی

ہر عمل کو کوئی راہ اب اے خدا نہیں ہے
میں کچھ سند نہیں ہوں ہم کا پتا نہیں ہے

تعلیم و تربیت کا ہے اختلاف ہر جا
جو کورس ایک کا ہے وہ اور کا نہیں ہے

ہر سر میں ہے یہ سودا دائم چرا نگویم
وہ کون ہے جو واعظ بن کر اٹھا نہیں ہے

اونچے بہک رہے ہیں نیچے دبک رہے ہیں
ہے پیٹ ہی کا سودا دل کا پتا نہیں ہے

جس کو بقا نہیں ہے وہ دل کشا نہیں ہے
جس کو فنا نہیں ہے اس کا پتا نہیں ہے

اے وہ کہ بے کسوں کو آتی ہے یاد تیری
میرا بھی کچھ سہارا تیرے سوا نہیں ہے

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے — مزا تو بے حد آتا ہے مگر ایمان جاتا ہے
بنوں کونسل میں اسپیکر تو رخصت قرأتِ مصری — کروں کیا ممبری جاتی ہے یا قرآن جاتا ہے
زوالِ جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے — کہ دنیا کو بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے
نئی تہذیب میں دقّت زیادہ تو نہیں ہوتی — مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے
تھیٹر رات کو اور دن کو یاروں کی یہ اسپیچیں — دُہائی لاٹ صاحب کی مرا ایمان جاتا ہے
جہاں دل میں یہ آئی کچھ کہوں وہ چل دیا اٹھ کر — غضب ہے فتنہ ہے ظالم نظر پہچان جاتا ہے

چناں بردند صبر از دل کے قصّے یاد آتے ہیں
تڑپ جاتا ہوں یہ سن کر کہ اب ایران جاتا ہے

معزز مسلم مے نوشس اب ہے گو وہ فاسق ہے — شریک اس کے ہیں فاتح اور فلیٹن کے مطابق ہے
یہ دعویٰ ہے غلط تو ڈارون صاحب خطا بخشیں — خدا انسان کا خالق خدا بندر کا خالق ہے

نہیں ہے خضر کی حاجت جو شوقِ دل محرّک ہے — کوئی حامی نہیں میرا تو خیر اللہ مالک ہے
قلم کھینچے کہاں تک صورتیں دنیا کی حالت کی — تصور ہی میں طاقت ہے وہی عمدہ گرافک ہے
مجھے اک بوسہ دینے میں بھی وہ مس بخل کرتی ہے — نصیب اچھے نہیں میرے لئے حاتم بھی ممسک ہے
یہاں حدّ سماعت کو نہیں کچھ دخل لے صاحب — یہ مانا آپ قابض ہیں مگر اللہ مالک ہے
جو گذروگے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھوگے — شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے
خیالِ آخرت کا حس نہیں جس کی طبیعت میں — اسے کیوں منطقی دنیا میں کہتے ہیں یہ مدرک ہے
خدا ہی کو فقط حاصل ہے حقِ دلبری اکبرؔ — دیا دل جس نے دنیا کو حقیقت میں وہ مشرک ہے

فطرتی سلسلے میں لطف بھی ہے قہر بھی ہے — خوانِ الواں پہ یہاں شہد بھی ہے زہر بھی ہے

اسی میداں میں ہوا تشنہ لبی سے میں ہلاک — اسی میدان کے آغوش میں اک نہر بھی ہے
کیمپ ہی میں نظر آتی ہے انہیں قوتِ قوم — ورنہ بسنے کو تو دیہات بھی ہے شہر بھی ہے

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی
اب نشو و نما کا وقت نہیں اب عمر نہیں امیدوں کی
دنیا سے لگاوٹ کیا میں کروں قوت ہی نہیں تمہیدوں کی
تفریح و سفر کا شوق نہیں دہلی ہے نہ اب کلکتہ ہے — عشرت کے لئے کافی ہے دعا ہاشم کا خیال البتہ ہے

آپ سے بے حد محبت ہی مجھے — آپ کیوں چپ ہیں یہ حیرت ہی مجھے
شاعری میرے لئے آساں نہیں — جھوٹ سے واللہ نفرت ہے مجھے
زورِ رندی ہے نصیب دیگراں — شاعری کی صرف قوت ہے مجھے

نغمہ یورپ سے میں واقف نہیں — دیس ہی کی یاد ہے بس گت مجھے
دے دیا میں نے بلا شرط ان کو دل — مل رہے گی کچھ نہ کچھ قیمت مجھے
برہمن سے میں نے کر لی دوستی
بت بھی اب کہنے لگے حضرت مجھے

قبل از غرور و ناز حکومت کی فکر کر — فرعونیت کے واسطے سامان چاہیئے
میں نے جو دل کو پیش کیا اس کے سامنے — کہنے لگا وہ شوخ مجھے جان چاہیئے
پنڈت کو بھی سلام ہے اور مولوی کو بھی — مذہب نہ چاہیئے مجھے ایمان چاہیئے

نہیں دشوار کچھ صحت پر اس کی شرط بُدنا ہے   جو دنیا دار ہے وہ قاعدے کی رو سے ادنیٰ ہے
سند مجھ کو ملی تو جل گئے واعظ لگے کہنے   خری کی ہو گئی تکمیل باقی صرف لدنا ہے

کسی محفل میں تم اکبرؔ اگر چمکے تو کیا چمکے   سند جب ہے کہ ابھرے ذکرِ حق نامِ خدا چمکے
یہ جگنو بھی نئی ہی روشنی سے ملتے جلتے ہیں   اندھیرا ہی رہا جنگل میں گو یہ جا بجا چمکے

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی   واعظ کی بات رہ گئی ساقی کی چل گئی
تیار تھے نماز پہ ہم سُن کے ذکرِ حور   جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے   صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام   پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی
عقبیٰ کی باز پرس کا جاتا رہا خیال   دنیا کی لذتوں میں طبیعت بہل گئی

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی   لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو   دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی
چشمِ غفلت کی ہے دنیاوی نتائج پر نظر   دیدۂ تحقیق میں دینی خوش انجامی بھلی
پختہ ہو کر اپنی شاخ و بن سے ہوتا ہے جدا   اے ثمرِ چشمِ محبت میں تری خامی بھلی

میدانِ عمل لیگ کا محدود ہے بے شک   ہاں رقبۂ مجلس کی کوئی ناپ نہیں ہے

ہے کاماہی کا ما جو پڑھے دہر کا نامہ جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گذرتی ہے
نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو یہی ذرّے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے
وہ دو ذرّے بلا اذنِ خدا مل ہی نہیں سکتے کہ جن کے میل سے سائنس کی قوت ابھرتی ہے
جو ہیں اہل بصیرت اکثر آنکھیں بند رکھتے ہیں نظر اچھے دلوں کو بھی کبھی بدنام کرتی ہے
زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستوں کی
ہم آہنگ ہو جاتی ہے نیت کی خوبی کام کرتی ہے

آج وہ ہنستے ہیں میرے جُبّہ و شلوار پر ایک دن اُن کو فلک بندھوائے دھوتی تو سہی
اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے اُن کو بہت کمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی
اپنی دھن میں آبرو کی کچھ نہیں پرواہ انہیں
نذر معجون ترقی ہو یہ موتی تو سہی

فساد اٹھتا ہے فتنہ آپ کی محفل سے اٹھتا ہے عدو پہلو میں ہو لیکن تو وہ مشکل سے اٹھتا ہے
ہمارے شعلۂ غم کا یقیں تم کو نہیں آتا تمہیں کیونکر دکھائیں دل میں جو جتا دل سے اٹھتا ہے
اٹھانا بار الزام ستم کا شاق ہے سب پر بہ آسانی مگر یہ بار اس قاتل سے اٹھتا ہے
سخن وہ دل نشین ہے جوش خاطر سے جو پیدا ہو کہ دل میں بیٹھ جاتا ہے وہی جو دل سے اٹھتا ہے
الٰہی فرقتِ محبوب میں کیونکر بسر ہو گی نہ دل اٹھتا ہے الفت سے نہ صدمہ دل سے اٹھتا ہے
سوا میرے کہ بیٹھا ہوں تو اٹھ جانے کا ایما ہے بٹھایا جاتا ہے پھر جو تری محفل سے اٹھتا ہے
نزاکت پر ستم ہے ان کا جوڑا اس قدر بھاری دوپٹہ ہے مصیبت پائچہ مشکل سے اٹھتا ہے

بُت زہرہ جبیں نے بھیرویں چھیڑی ہے اے اکبرؔ
نمازِ صبح کو اس وقت تو محفل سے اٹھتا ہے

عجب فتنہ خرامِ نازکِ قاتل سے اٹھتا ہے
سنبھلتا ہی نہیں دامن قدم مشکل سے اٹھتا ہے

تحمل تا کجا ٹوٹتا ہے اک لشکرِ مصیبت کا
مدد یا رب قدم اب صبر کی منزل سے اٹھتا ہے

ہوئی مدت کہ دنیا سے مرا دل اٹھ گیا لیکن
ہنوز اک شعلہ یادِ رفتگاں میں دل سے اٹھتا ہے

اٹھاتے یوں تو سب ہیں بارِ دنیا طوعاً و کرہاً
خوشی کے ساتھ لیکن یہ فقط غافل سے اٹھتا ہے

نہ پائے گا کبھی اصلی مسرت طالبِ دنیا
پر اس کا ہاتھ کب اس سعیِ لاحاصل سے اٹھتا ہے

ترقی کی ادھر گھوڑ دوڑ ادھر یہ پیرِ ناطاقت
وہ آسانی سے کیا دوڑے گا جو مشکل سے اٹھتا ہے

سراپا اک نگاہِ شرمگیں ہے وہ پری پیکر
کجا آنکھیں اٹھانا آپ وہ مشکل سے اٹھتا ہے

ہجومِ آرزو اس دودِ آہ دل سے ہے ثابت
ورودِ کارواں ہو تب دھواں منزل سے اٹھتا ہے

فغاں ہی کی صدا گرداب کی جانب ہے اب اکثر
خوشی کا غلغلہ کمتر لبِ ساحل سے اٹھتا ہے

اثر ہے شوق کا صحرائے مجنوں میں یہ اے لیلیٰ
بگولے پر بگولا سایۂ محمل سے اٹھتا ہے

کچھ ایسی دل فریبی ہوتی ہے اشعارِ اکبرؔ میں
کہ شورِ مرحبا ہر گوشۂ محفل سے اٹھتا ہے

حکیمانہ بذلہ سنجیاں

(متفرق اشعار، رباعیات، قطعات اور منظومات)

پڑھ کے انگریزی میں دانا ہو گیا
کم کا مطلب ہی کماتا ہو گیا

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

شاعرانہ داد اچھی دی یہ مجھ کو چرخ نے
تیغ ابرو کا تھا عاشق ،خاں بہادر کر دیا

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا
ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطف جب رہیں ہیں فیشن کے ساتھ بہنا

کہتے ہیں شاعری یہ تری بے اصول ہے
کہتا ہوں صاف میں تو نہیں تجھ کو مانتا
میں نے کہا کہ آپ کی کرتا جو پیروی
تو آپ کے سوا کوئی مجھ کو نہ جانتا

بی۔ اے کی کمال کامیابی ہے یہی
سروس کے لگاؤ سے معزز بننا

بہتر ہے یہی اے دل کہہ "لیت" "نہ تو" "لولا" دنیا کے حوادث پر واللہ سکوت اولیٰ

شایق تحقیق کے یہ مضمون سُن لیں انساں کی شکل جیسے میمون بنا
پاجامہ بھی یونہی ارتقا سے بدلا سمٹا اُبھرا غرضکہ پتلون بنا

حکم انگلش کا ملک ہندو کا اب خدا ہی ہے بھائی صلّو کا

بوزنے کو ارتقا نے کر دیا انساں تو کیا انقلاب حرف نے مولی کو ولیم کر دیا

ناواقف وزن و شعر جو مجھ کو کہے اس کے آگے ضرور ہے چپ رہنا
بلبل کو بھی بے سُرا وہ کہدے گا کبھی ایسے سنجیدہ شخص کا کیا کہنا

مغرب کی لُعبتوں نے اسٹیج کو سنوارا بجنے لگا پیانو چپ ہو گیا چکارا
بیتاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا دل میرود زدستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

گم ہیں مری نظر سے وہ ساحل دل آویز ناکامیوں کی موجیں بہنے لگیں بہت تیز
اسٹیمر اپنی ہم کو دیتے نہیں یہ انگریز کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

مشرق کے حق میں مہلک مغرب سے ہے یہ پیوند بدنامیوں سے بچ تو اے مصلح ہنر مند
مصلح یہ بولا اکبر کی سعی میں نے ہرچند درکوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

خوش چشم آہوؤں کی صحرا ہیں یہ اچھل کود — موسم بھی روح پرور ساقی بھی حسب مقصود
فطرت کا حکم نافذ تقوی کی فکر بے سود — حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

فہمیدن معانی ہر طبع کے تواند — لذت بیابد آں دل کو راز ہا بداند
موجے بسینہ خیزد در شوق غرق ماند — گو مطرب حریفاں ایں نظم من بخواند
در وجد و حالت آرد پیران پارسا را

یہ صندوق کتب بھاری ہے یارب اٹھ نہیں سکتا — یہ ہے مذہب تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا
ہوا پر دی جگہ اللہ نے غربی مشینوں کو — زمیں سے غمزہ انجینری اب اٹھ نہیں سکتا

مشرق پہ ہے گو کہ ضعف پیری غالب — ہر چند کہ ہے غم اسیری غالب
مستی اکبر کی رقص مس سے نہ رکی — بھونرے پہ ہو سکی نہ بھنبھیری غالب .

اکثر اسی ہوس میں بنے ہیں کلوخ کمپ — اس کے خوشا نصیب جسے ہو رسوخ کمپ
اب شیخ شہر رہ گئے مُردوں کے واسطے — زندوں کو لے مریں گے ہمارے شیلوخ کمپ

شیعۂ من بے محیط و سنیم بے مرکز است — می روم سوئے کلیسا طالبم دخت رز است

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزور تیغ — یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزور موت

پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے — ہر چہ از باپ میرسد نیکو است

ہو گئی اب خیال کی اصلاح　　ہر چہ از آپ میرسد نیکو است

بہ دین نیچری بستیم اُمید　　ترقی را چہ آمادہ بر آمد
و لے از تجربہ بہ ثابت شدہ ہیچ　　چو دُم بر داشتم مادہ بر آمد

مارا فلک نشاند بہ پہلوے آں صنم　　مدہوش لذتیم و ندانم دگر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر　　کہ زن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد

رفت د نہال ڈارون آں شوخ　　بوزنہ ماند و آدمی گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند　　پئے نیکاں گرفت مردم شد

ما نیچری شدیم و نداریم آگہی　　با دیگراں نوشتہ کلک قضا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز جبرئیل　　احمد چہ گفت داد چہ شنید و خدا چہ کرد

ہیٹ را نہ بر سر من جائے دستار اے عزیز　　مرد تا مسٹر تواند شد چرا قبلہ شود

خدا کا گھر نہ رکھا دل کو بنگلوں میں مکین ہو کر　　بھلا یا عرش کو اس قوم نے کرسی نشیں ہو کر

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر　　کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیمبر نمبر

بے پاس کے تو سائنس کی بھی اب نہیں ہے آس　　موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

مصارفِ مئے لندن نہ ہو سکے برداشت   غرضکہ یاروں میں افیون ہی گھلی آخر

شیخ نے عشق بتاں کے وہ طریقے سوچے   کہ ہوئے دیر میں بھی اب بڑے حضرت مشہور

مشرق سے تجھے اگر ہوئی ہے نفرت   للہ اکبر نماز مغرب تو نہ چھوڑ

شیخ صاحب کا نکل سکتا ہے مطلب کیونکر   نظر آسکتی ہے اب رونق مذہب کیونکر
کار دنیا سے فراغت ہی عزیزوں کو نہیں   پھر کہیں ان سے اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ کیونکر

میں ہوا ان سے رخصت اے اکبر   وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

پائے در پتلون و دل در پیشواز   چند روزے باہمیں حالت بساز

کر لیا بی بی نے ان کی انٹرنس اس سال پاس   والدہ صاحب تو ہیں خاموش لیکن خوش ہیں ساس

لاٹھی شباں اٹھائے اگر ذئب کے خلاف   ہے ظلم اس کو کہیے جو تہذیب کے خلاف

موجِ نصیحت اک طرف دل کی روانی اک طرف   کل شیخ پورہ اک طرف میری جوانی اک طرف

فقط بسکٹ ہی کھاتا ہوں بلا چائے   نئی ملت کا ہوں میں زاہد خشک

انجن کو یہ آگ ہو مبارک　　انگریز کو بھاگ ہو مبارک
دہلی کو سہاگ ہو مبارک　　قومی ہمیں راگ ہو مبارک

کمیٹی میں جتنے ہیں ارکان لیگ　　بفضل خدا سب ہیں میرے کلیگ
مگر ان سے ہے مجھ کو تخصیص خاص　　کہ ہے نام کے ساتھ جن کے علیگ

بنگلہ دیکھو تو صرف واحد حاضر　　اس پر یہ غضب کہ جمع غائب بالکل

بدلی کے سبب سے چاند آیا نہ نظر　　بیٹھے رمضان کے نمازی ہیں ملول
سائنیس نے کر لیا تھا منظور انتیس (۲۹)　　نیچر نے کہا کہ تو سہی تیس وصول

ہیٹ ہی کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول　　دخل انگریزی پہ اُردو کی شکایت ہے فضول

ختنہ قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم　　مُہر ابراہیم باقی دین ابراہیم گم
حسرت عشاق بازار جہاں میں کچھ نہ پوچھ　　رز ہیا، زر ندارد مس کی کثرت سیم گم
شہر دل کے واسطے اب ان بتوں سے کیا لڑیں　　کر چکے ہیں بھائی صاحب ہم تو ہفت اقلیم گم

وہ منانے میں بھی بناتے ہیں　　کہتے ہیں مان جاؤ منسا رام

دانم کہ سادگی و خاموشی است اولے　　تقلید دہر لیکن بربودہ است وہوشم
سودائے گفت و رسم وضع صلیب و ربہ　　دانم چرا نگویم دارم چرا نپوشم

کریما بہ بخشائے بر حال قوم صلوٰۃ است رائج در ایشاں نہ صوم

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم
کوئی یہ شیخ سے کہہ دے کہ سنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب ادھر دولت جدھر دولت ادھر چندہ
جدھر چندہ اُدھر آنر جدھر آنر اُدھر بندہ

رہ گیا دل ہی میں شوق سایۂ الطاف خاص
مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڈ روم میں
کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر
تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

مغربی ڈھول کا سر میں نہ پہونچا تھا اثر
اس قدر بات بہت خوب تھی عمامے میں

ابھرے ہیں عیب ان کے اور خوبیاں دبی ہیں
بے دین اگر نہیں ہیں تو شیخ جی غبی ہیں
اپنوں کو بد بنایا بندر کو جد بنایا
بت کو صمد بنایا کیا خوب قرطبی ہیں
اپنی ہوس کے آگے ملّت کو چھوڑ بھاگے
اور کہہ دیا کہ ہم تو اس عہد کے نبی ہیں

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں
پئے تکریم مہماں بن سنور کے بیبیاں آئیں
طریق مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں
دلوں میں ولولے اٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں

اُمنگیں طبع میں ہیں شوق آزادی کا بلوا ہے
کھلیں گے گل تو دیکھو گے ابھی کلیوں کا جلوا ہے

مجھے سنا کے یہ کہتا تھا ایک طفل ذہین
یہ سچ ہے ہم میں وفا و ادب کی بو بھی نہیں

سبب ہے اس کا مگر صرف ضعف ملّت و دیں   جناب قبلہ و کعبہ ہیں خود ہی دیر نشیں

کسی میں دم ہی نہیں ہے تو دم بھریں کس کا   بزرگ ہی نہیں باقی ادب کریں کس کا

دین و تقویٰ سے بہت دور ہوا جاتا ہوں   بادۂ عیش سے مخمور ہوا جاتا ہوں
مری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت   ترک لاحول پہ مجبور ہوا جاتا ہوں

جسے موقع ملا وہ جا بسا بستی سے بنگلے میں   مزا دیتی ہے ٹھمری اُلفت قومی کی جنگلے میں

شیخ جی دیر میں بیٹھے ہوئے گاتے تھے بھجن   نگراں سوئے برہمن تھے بشوق بھوجن

میں نے ٹوکا تو لگے کہنے مناسب نہیں کد   ہر کسے مصلحتِ خویش نکو می داند

بہت روئے وہ آنسو پونچھوں میں حکمت اس کو کہتے ہیں   میں سمجھا خیر خواہ اُن کو حماقت اس کو کہتے ہیں

سنئے شیخوں کو کفر سے پاکے قریں۔ یہی کہتی تھی گوہر زہرہ جبیں
یہ موئے تو صریح ہیں دشمن دیں۔ ارے ان کا تو کوئی خدا ہی نہیں
نئی سڑکوں پہ چل کے تھکیں گے بہت۔ بڑے لوگوں کے منہ کو تکیں گے بہت
یہ کمیٹیوں میں تو بکیں گے بہت۔ ولے سجدے میں شوق دعا ہی نہیں

سنا کے مصرع یہ شیخ صاحب بہت زیادہ ہنسا چکے ہیں

ہماری گردن وہ کیوں نہ ماریں جو ناک اپنی کٹا چکے ہیں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ   گھر میں بیٹھے ہوئے والتّین پڑھا کرتے ہیں

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب نہ نشیمن   پیڑوں پہ نہ وہ طائر صحرا پہ نہ وہ جو بن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں   املی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے   کونسل میں بہت سیّد مسجد میں فقط جُمّن

جور فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں   تفرقہ دیکھئے ذرا ہم پہ یہ ہیں عجیب دن
عقل سپرد ماسٹر۔ مال سپرد آنجناب   جان سپرد ڈاکٹر روح سپرد ڈارون

بڑے گنگناتے تھے لالہ نرنجن   نہ آنکھوں میں انجن نہ دانتوں میں منجن
چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے   کہاں کھینچ لے جائے گا ہم کو انجن

دین سے دور ہیں مسجد سے پھرے جاتے ہیں   پھر بھی اس بت کی نگاہوں سے گرے جاتے ہیں
میں نے مانا کہ کلیں تیز چلی ہیں لیکن   آپ شہتیر نہیں ہیں کہ چرے جاتے ہیں
دو خبر ان کو خدا سے جو پھرے جاتے ہیں   کہ بتوں کی بھی نظر سے وہ گرے جاتے ہیں

یہ ریڈیر شیخ جی پکارے کہ ہم تو اب بھی مطیع رب ہیں   کہا کسی نے یہ مسکرا کر بڑے میاں تو بڑے غضب ہیں
گریجویٹ ایک اٹھ کے بولا حضور پروا کریں نہ ان کی   ضعیف و خستہ، خراب و رسوا یہ میہمان دو چار شب ہیں

اکبرؔ کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں — گو اس نے بہت کہا۔ کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمر بتاں کا مفقود ہے ذکر — شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

بتوں نے وہ ترقی کی جمال روح پرور میں — کہ پھر ان کو جگہ دی قوم نے اللہ کے گھر میں
یہ معنی ہیں کہ پھر سب دل سے عاشق ہو گئے ان کے — مزا ہرّے میں اب وہ ہے جو تھا اللہ اکبر میں

شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے — اونٹ کے سو لغات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر ہیں قابض — کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

بنے بندر سے ہم انساں ترقی اس کو کہتے ہیں — ترقی پر بھی نیٹو بدنصیبی اس کو کہتے ہیں

یہ نہ پوچھو مجھ سے یہ کیوں ہوا اور ایسا کیوں نہیں — شیخ یہ سوچو تمہارے پاس پیسہ کیوں نہیں

سامنے کوچ پر جو لیٹی ہیں — کین صاحب کی پیاری بیٹی ہیں

ہوں علالت سے میں جو زیر علاج — روزہ میرا قضا ہوا ہے آج
حکم دیتا ہے مجھ کو اس کا دیں — اس لئے کی ہے دعوت مسکیں

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں — بزا خفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

نیست کس مصروف کار دیں بہ قلب مطمئن — یک فنا فی الانزاست و یک فنا فی الڈارون

جب کہا میں نے خدا سے آپ ڈرتے کیوں نہیں　　　وہ بگڑ کر بول اٹھے آپ مرتے کیوں نہیں
جب یہ حالت ہے طبائع کی تو کیوں کہتے ہیں لوگ　　　اکبر اٹھتے کیوں نہیں واعظ ابھرتے کیوں نہیں

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور　　　کہ ٹرکی کے دشمن سے جاکر لڑیں
تہِ دل سے ہم کوستے ہیں مگر　　　کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

حکومت سے سبکدوشی ہے حاصل　　　رکھو بحث ترقی کو نظر میں
غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت　　　رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

بے نمازوں میں ہیں وہ اور اس پہ شرماتے نہیں　　　یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

ان کے حسن اپنی ضرورت پہ نظر کرتے ہیں　　　گو خوشامد ہے بڑی چیز مگر کرتے ہیں

نہ دل پستا ہے بسکٹ پر نہ میں پوری سے لچتا ہوں　　　مذاقی حاشیے کو چھوڑ کر دونوں سے بچتا ہوں
دلِ رنگیں ہے یاں لیلا رچانے کی ضرورت کیا　　　اکیلا بیٹھ کر لیلا کی صورت خود ہی رچتا ہوں

یہ بنگالی ہیں جو ثابت ہوئے ہیں اس قدر اثقل　　　بحمد اللہ کہ غربی پیٹ میں میں خوب پچتا ہوں

ہے حکومت کی جب یہاں نہ رہی　　　حنفی نفی ہیں معطّل ہیں
ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں　　　اب ہمارے امام حنبل ہیں

(HUMble)

میں یہ کہتا ہوں مجھے اچھا کرو احسان ہو
وہ یہ کہتے ہیں کہ مر جاؤ تو کیا نقصان ہو
میں یہ کہتا ہوں مجھے بندہ بنا لو اپنا تم
وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے کہئے جو شیطان ہو

مانتے ہی جاتے ہیں ناداں جب اس کے قول کو
ہے یہی بہتر کہ واپس لیجئے لاحول کو

ہر آرزوئے دل کی تم ہیچ نہ کرو
لالچ میں بہت ضرر ہے لالچ نہ کرو
سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے
پلواینٹ یہ سخت ہے اسے پچ نہ کرو

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو
کہہ دیا صاف ہم نے اے مہراج
ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ما مقیمان کوئے دلداریم
یا ڈیپوٹیشن است یا غم مسیم

باتیں ہرگز خلاف عزت نہ کرو
دم بھر بھی شرارت و بغاوت نہ کرو
بدنام کرو نہ وضع انگریزی کو
پتلون پہن کے ترک طاعت نہ کرو

انہیں دھوتی مبارک ہو انہیں تہمد مبارک ہو
مجھے پتلون اور یاروں کو مجھ سے کد مبارک ہو

آنرا اگر ملے جو ہے نام و نمود میں — کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں
دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ — فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

کرتب دکھلائیں ممبری کے کیونکر — جو پیر ضعیف قوم مفتوحہ ہیں
بی لیگ سے کہہ دے کوئی حالت میری — کیوں مجھ سے خفا جناب ممدوحہ ہیں

مد نظر ہے ان کو مری صحت کا خیال — افسوس ہے یہی کہ حریص و خسیس ہیں
خود چکھ رہے اور مجھے دیتے ہیں یہ حکم — ایمان لائیے کہ یہ لڈو نفیس ہیں

ورچوئس[۱] دیکھتے ہیں وہ نہ سنر[۲] دیکھتے ہیں — فرنیچر دیکھتے ہیں اور ڈنر دیکھتے ہیں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں
انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں — الم ترکیف۔ بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں
مرید اُن کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

ووٹوں کے خواستگاروں میں شیخ جی گھرے ہیں — بارہ برس پر آخر گھوڑے کے دن پھرے ہیں

لینا تھا کام جن سے وہ مسخ ہو گئے ہیں — جو عزم تھے ہمارے وہ فسخ ہو گئے ہیں

---

۱ نیکوکار　　۲ فاسق - گنہگار

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اَنّ سے پنپے ہیں
ہماری بھی دعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو
مگر ہاں شیخ جی کی پالیسی سے ہم نہیں واقف
اسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

نونِ تنہا کو میں ہے کیوں میم سے لکھتے ہیں لوگ
مدّتوں تک میں نہیں سمجھا تھا اس مضمون کو
آج لڑبری لطیفہ یہ سنا اک دوست سے
میم نے ماہی کے نگلا حضرت ذالنون کو

ان کی کل کوششیں تھیں پولیٹکل
اس کو خالق کی جستجو نہ کہو
کمپ کے شیخ کو کہو مرحوم
قدس اللہ سرہٗ نہ کہو

ذرّہ ذرہ سے لگاوٹ کی ضرورت ہے یہاں
عافیت چاہے تو انسان زمیندار نہ ہو
شیخ صاحب یہ مئے سرخ مجھے تو ہے مفید
شغل کچھ آپ بھی فرمائیں جو انکار نہ ہو
مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو
پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو
توپ کی طرح چل اس عہد میں گو منہ ہو سیاہ
سرخروئی اب اسی میں ہے کہ تلوار نہ ہو
آپ کی جنبش ابرو سے ہوئے شیخ بھی چپ
سچ تو یہ ہے نہ چلے کام جو تلوار نہ ہو
ابر فکر آپ کا برسا تو بہت اے اکبرؔ
اعتراضات کی احباب میں بوچھار نہ ہو
کہدو اکبرؔ سے یہی لوگ ہیں اس وقت کے شیخ
آل سیّد کو بُرا کہہ کے گنہگار نہ ہو
دل ہے پیغام رساں جاتے ہیں خالق کی طرف
ہم کو کیا غم ہے اگر ریل نہ ہو تار نہ ہو
گو تبرک ہے یہ اے شیخ ولیکن ہے ثقیل
دیکھئے شب کی عبادت کہیں دشوار نہ ہو

شیخ صاحب کے تعلّق کی نہ قلعی کھل جائے
لاٹ صاحب کا کہیں حشر میں اظہار نہ ہو

مغرب نے سایہ ڈالا بتوں پر اثر کے ساتھ — ساری بھی ان کی ہوگئی غائب کمر کے ساتھ
ہستی ہی تیری کیا ہے کہ ہو ان کا ہم سفر — موجوں کا لے حباب نہ دے تو اُبھر کے ساتھ

احتمالِ فتنہ ہے ہر مجمعِ ملّت کے ساتھ — گشت کرتی ہے پولیس بھی شیخ کی جنت کے ساتھ
چھوڑ کر صحنِ حرم اکبرؔ ہے محوِ طوفِ دیر — عزتیں گو اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دل کش و آزاد و خوش رو ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے
ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ
اوجِ قومی سے شرافت کا ہُما گر جائے گا
ماکیاں سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ
ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو آختہ

کریما بہ بخشائے بر حالِ بندہ — کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ

نئی اور پرانی روشنی کی مکالمت

نئی روشنی کی تعلّی

پھرتے ہیں تذکرۂ کالج و اسکول کے ساتھ خیر مقدم ہے ہمارا ڈنر اور پھول کے ساتھ

معترض گو نہیں دینے کے کبھی بھول کے ساتھ مستقل چال میں ہم اپنی ہیں معمول کے ساتھ

عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں

دوسری پشت ہے چندے کی طلب گاری میں

پرانی روشنی کا جواب

بے ضرورت نظر آتا ہے تعلّی کا یہ فیئر معترض کون ہے جب آپ کی نیت ہی بخیر

اب تو سب آپ کے اپنے ہی ہیں کم رہ گئے غیر نہ حرم آپ کو بیگانہ سمجھتا ہے نہ غیر

آپ کو لطف گورنمنٹ سلامت رکھے

مستفید اس سے ہمیں تا بہ قیامت رکھے

غربا بھی ہیں مگر قوم کے اجزا اکثر غربا ہی سے تعلق میں ہے ان کو تو مفر

دور ہے ان سے خود آرائی مغرب کا اثر بحث ان کی بھی اسی بات پہ ہے ختم مگر

آپ کا دل نہ مغرب کا اگر سالک ہے

کیجئے چین، غریبوں کا خدا مالک ہے

آپ بنگلوں میں ہیں مسرور تو پھر ہم کو کیا آپ مسجد سے ہوئے دور تو پھر ہم کو کیا

آپ عہدوں پہ ہیں مغرور تو پھر ہم کو کیا جاہ ہے آپ کو منظور تو پھر ہم کو کیا

ہمیں ابھریں گے کبھی گو ابھی پستی میں ہیں

آپ دھبوں کی طرح دامن ہستی میں ہیں

ہر گھڑی فکر ہے بازاری بھی درباری بھی
اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی

ہے طریق جدید خشک مزاج
میرے حق میں قدیم چال اچھی
گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے
پھر بھی بسکٹ سے شیرمال اچھی

مچھر بدن سے سب کے پیتا ہے خونِ خالص
فضلہ اسے نہ سمجھو صاحب یہ پھین کیوں ہے
اڑنے کی طاقت اس کو فطرت نے کیوں عطا کی
یہ نشترِ ملایم ایرو پلین کیوں ہے

مشرق غربی جھپیٹ میں ہے
دل سینے میں تھا سو پیٹ میں ہے
کیوں اس کو ہے مولوی پہ ترجیح
کیا بات گریجویٹ میں ہے
کیسہ خالی ہے بکس خالی
جو کچھ ہے یہاں پلیٹ میں ہے

زباں اکبر کی اس طرز سخن پر ناز کرتی ہے
بھجن کی دھن میں تردید ثبت طناز کرتی ہے
معزز کرتی ہے ان کی نظر ممتاز کرتی ہے
بس اتنا ہے ورالحاد کو بھی باز کرتی ہے
معاشر کمپ میں کیوں جا بسے مجھ سے نہ پوچھ اے دل
مثالِ اولیں خود تجھ پہ کشف راز کرتی ہے

تدبیر حفظ جان بقیہ ضرور ہے
اس وقت مومنوں کو تقیہ ضرور ہے

لپٹ بھی جا۔ نہ رک اکبر۔ غضب کی بیوٹی ہے
نہیں نہیں پہ نہ جا، یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

جو پوچھا میں نے۔ ہوں کس طرح سے HAPPY پی　　کہا اس مس نے میرے ساتھ مے پی

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں　　بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

چکر آیا اک ایسا جھولا جھولے　　قومی عزت کی ہسٹری کو بھولے
جنت کا خیال ہے نہ باغ دل کا　　گملوں ہی پہ اب تو رہتے ہیں ہم پھولے

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے　　نوجوانوں کے لئے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنی قومی فقط الفاظ سہی　　چندا حباب کا اک شغل دل آویز تو ہے

اب تو اکبر بار ہے ہم پر نماز عید بھی　　تم اگر رکھ سکتے ہو روزہ خدا روزی کرے

بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی　　وہسکی سے ہو رہی صفائی دماغ کی

دربار سلطنت میں ہے کبر و خود پسندی　　مذہب میں دیکھتا ہوں جنگ اور گروہ بندی
رندی و عاشقی کا ہے شغل سب سے بہتر　　لمنیڈ ہے اور وہسکی بندہ ہے اور بندی

الفت نہ ہو شیخ کی تو عزت ہی سہی　　مرشد نہ بناؤ ان کو دعوت ہی سہی
بگڑا ہے جو دل زبان ہی کو روکو　　رونا جو نہ آئے غم کی صورت ہی سہی

رفتار ترقی یہ کہیں ناچ نہ ہو جائے　　یہ قرأت مصری کہیں کھماچ نہ ہو جائے

توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دل — مغرب کی مگر کوک سے یہ واچ (WATCH) نہ ہو جائے

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے — اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے
کہاں باقی رہے ہم میں وہ اورادِ سحرگاہی — وظیفے کی جگہ یا پانیر یا آئی۔ڈی[۱]۔ٹی ہے
گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبرؔ — کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وہسکی کبھی ٹی ہے

گل پھینکے ہے یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی
اغیار تو دنیا ہیں اٹھائے ہوئے سر پر — ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اٹھتا نہیں سر بھی
اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف — ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اُس بت کی کمر بھی

رات افسوس سے کہتے تھے یہ بلبنسی بھائی — ہم سے ناحق ہیں الگ کانفرنسی بھائی

ساحل نظر آتا ہے نہ مچھلی ہے نہ بلبنسی — کیا لہریں لیا کرتے ہیں یہ کانفرنسی

دیر میں محوِ بت بھی ہے وعظ میں قبلہ رو بھی ہے — شیخ ہمارا خوب ہے پیر بھی ہے گرو بھی ہے
بت پہ جو پھر پڑے تو خوش سجدے میں گر پڑے تو جا — وضع نئی، چلن نیا، مست بھی ہے وضو بھی ہے

یورپ میں گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی — لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی
ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ — دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ[۲] ہر جگہ

---

۱ یہ بھی ایک اخبار کا نام ہے لکھنؤ سے نکلتا تھا (INDIAN DAILY Telegraph) (مرتب)

۲ صابون

غلطی مجھ سے ضرور یہ ایک ہوئی ۔۔۔ پیدا وجہ نصیحت نیک ہوئی
لینا تھا لغت سے اور ہی لفظ کوئی ۔۔۔ مِس کو جو لیا یہ مجھ سے مسٹیک[۱] ہوئی

وہ تو گرجا پہ رُکا اور یہ گیا کعبے کو پھاند ۔۔۔ شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

وضع مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلّی نہ ہوئی ۔۔۔ ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

مسمریزم کے عمل میں دہر اب مشغول ہے ۔۔۔ مغرب و مشرق میں ایک عامل ہی اک معمول ہے
جسم و جاں کیسے کہ عقلوں میں تغیّر ہو چلا ۔۔۔ تھا جو مکروہ اب پسندیدہ ہے اور مقبول ہے
مطلعِ انوارِ مشرق سے ہے خلقت بے خبر ۔۔۔ مستند پر تو وہ ہے مغرب سے جو منقول ہے
گلشنِ ملّت میں پامالی سرافرازی ہے اب ۔۔۔ جو خزاں دیدہ ہے برگ اپنی نظر میں پھول ہے

کوئی مرکز ہی نہیں پیدا ہو پھر کیونکر محیط
جھول ہے بیچیدگی ہے ابتری ہے بھول ہے

حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پر گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

قابلِ رشک ہے زمانے میں ۔۔۔ دن وکیلوں کا رات عاشق کی

سُدیشی گورنمنٹ سے لچ گئی ۔۔۔ یہ ہائی پیرمنٹ سے پچ گئی

---

[۱] غلطی

افسردگی پر اس کے لگا دل جو تڑپنے — کل شب کو کہا میں نے یہ محبوب سے اپنے
گو پاس ترے رہ نہ گئی دولت و حشمت — ہے حسن خداداد ہی اور وہی صورت
سونے ہی کی بدھی پہ فقط مجھ کو نہیں غش — پھولوں کی بھی بدھی ہو ترے سینہ پہ دل کش
جو دل کہ تری پھولوں کی بدھی کو نہ پوچھے — برباد ہو ایسا کوئی آدھی کو نہ پوچھے

نہیں بدلی زبان اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے — میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں سٹ ڈون کہتا ہے

وضع سابق سے بُت ہندی کو سیری ہو گئی — ہو مبارک ملک کو مینا کنیری[۱] ہو گئی

ہیٹ پہنچی شیخ کے سر پر جو دل کے جوش سے — اور بھڑکے شعلہ ہائے فتنہ اس سرپوش سے
بن گئے صاحب۔ ہنر صاحب کا کیا ہے آپ میں — کیا کلیں ٹپکیں گی سقف بنگلہ خس پوش سے

باغِ امید کے پھل ہوتے ہیں روز ضائع — ہم کو خدا بچائے اولادِ ڈارون سے

بے دل ہمیں بروز سلونو نہ کیجئے — للہ بات مانئے نونو[۲] نہ کیجئے
کل[۳] کی صدا نہ خوبیٔ فطرت نہ لطف دید — بہتر یہی ہے خواہش فونو نہ کیجئے

مجھ خستہ کی ہستی نہیں کچھ آپ کے آگے — بُھرتے کی ہے کیا اصل مٹن چاپ کے آگے

ملک پر تاثیر چشم ووٹ طاری ہو گئی — مفت شیخ و برہمن میں فوج داری ہو گئی

---

[۱] طائر خوبصورت زرد رنگ۔ [۲] نہیں نہیں [۳] مشین

ہندوؤں کو کیوں نہ اب بھائی بنائیں صلح دوست آریہ مذہب میں بھی توحید جاری ہو گئی
ممبری پر جنگ ہو اس میں گئو کا کیا قصور ملک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہو گئی
کرتے ہیں بائیسکل پر خوب وہ دفع ریاح
اب تو بیلن ارغنوں کا یہ سواری ہو گئی

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

جن لوگوں نے مسلموں کو بہکایا ہے کامل کب ان کو علم و فن آیا ہے
جو فلسفی ہیں اصیل وہ ہیں خاموش الحاد تو ٹٹینیوں نے پھیلایا ہے

لیا صبح شب وصل اس کا بوسہ میں نے یہ سچ ہے اسی پر بول اٹھی وہ شوخ مس یہ فائنل پرچ ہے

تھا امن کسی قدر سو وہ دن بھی چلے ظاہر ہی کے سمت اہل باطن بھی چلے
مجلس پہ ہوا اضافہ کانفرنس مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

اس مس کی زبان رات جو لی میں نے دہن میں بولی کہ تری راہ ترقی میں یہ ہیج[1] ہے
میں نے کہا اسکالر مشرق ہوں میں اے مس چپ رہ کہ یہی میری سکنڈ لینگوایج[2] ہے

دنیا آخر کو تم سے لپٹی ہو ہی گئے تم غرضکہ ڈپٹی

---

[1] Hedge [2] Second language

کرتے کیا اُن سے بھینٹ خالی　　کر آئے ہم اپنی ٹینٹ خالی

شیعہ وسنّی میں جنگ اک دھوم دھامی ہوگئی　　چار یار اور پنج تن کی نیک نامی ہوگئی
کیا شرف بخشیں گی تم کو عرش پر یہ کاوشیں　　جب زمیں پر تم کو غیروں کی غلامی ہوگئی
ایک قرآن ایک قبلہ ایک اللہ اک رسول　　بدنصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہوگئی
مومنانِ امن جو کو دیر کی سوجھے گی اب　　جب حرم کے صحن میں بدانتظامی ہوگئی
اشتعالِ آتش افسردہ اس طوفان میں　　پختہ طبعوں سے الٰہی کیوں یہ خامی ہوگئی

جس نے کھولی بہر صلح و آشتی اپنی زباں
پیش حق مقبول اس کی خوش کلامی ہوگئی

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے　　اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

اکبرؔ بھی قومی کام کو اٹھے بشوق مغفرت　　ہزہائی نس کے ہم عناں ہزلولینس بھی ہوگئے

مجھ کو ہے پسند اس سبب سے یُو۔ پی　　یعنی یو پی کا قافیہ ہے روپی
ہے فصل بہاری بھی ہم آہنگ اس کی　　جب آتی ہے کرتی ہے اشارہ توپی

دور یونیورسٹی میں ان کی ترقی ہے ضرور　　شیخ جی مدیون ہیں اور قوم ڈگری دار ہے

---

al His Loveliness

شیخ کو گانٹھ لے سلیقے سے — چین کر مغربی طریقے سے
متفق اس پہ ہو گئے کہہ و مہ — اب تو یہ مسئلہ ہے مفتے بہ

ٹامی کے آگے ٹیمز کا دل چسپ پاٹ ہے — گنگو کی جاں فزائی کو گنگا کا گھاٹ ہے
ڈوبے ہوئے ہیں یہ بھی مگر اپنی بات میں — پیرو بھی بہہ رہے ہیں خیالی فرات میں

یہ اتنی ستر پوشی تیری اے شرقی غنیمت ہے — دیئے جا چندہ ۔ بس تعلیم کی غرقی غنیمت ہے

النظر الی الاٰبل کا تصور جو دل میں ہے — یہ وجہ ہے کہ آج نکتہ آنر ابل میں ہے
کمسریٹ اب بھی اس کا ہے محتاج دیکھئے — معذور اگرچہ اس کا قدم آب و گل میں ہے

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے — یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے — واں نہ پہونچے اور ہم سے چھٹ گئے

شوق ہے جن کا نہ طاقت یاپ کی — سب ہیں بس بڑھتی منا تے آپ کی
ہو چکے ہگلی کے بکچر ۔ اب ہمیں — فکر ہے گنگا کنارے جاپ کی
قطر جو کچھ ہو محیط اک انچ ہے — دھوم ہے ان کی کمر کی ناپ کی
شیخ جی قانع کے گھر میں لو جنم
ورنہ اب مٹتی ہے ہستی آپ کی

مل جاتا ہے دنیا سے اس کو جس شخص کا جتنا حصّہ ہے
ہے اتنی بات ٹھکانے کی باقی تو کہانی قصہ ہے

وہ فرماتے ہیں لے اکبر یہ روزہ اک قیامت ہے
بجا ارشاد ہوتا ہے مگر افطار جنت ہے

میں نے جو کہا دیکھو تو ذرا اب قوم پہ کیسا جوبن ہے
وہ ہنس کے لگے کہنے صاحب یہ قوم نہیں ہے پلٹن ہے

عزیزان وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس
چُرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے
یہ اتنی گو شمالی طفل مکتب کی نہیں اچھی
زبان آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے
مری ڈاڑھی سے رہتا ہے وہ بت انکار پر قائم
مگر جب دل دکھاتا ہوں تو فوراً مان جاتا ہے

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کا مافک ہے
یہ مانا شیخ جی نے چکھ لئے دس پانچ یہ کہہ کر
اگر قابض ہیں یہ بسکٹ تو ہوں اللہ مالک ہے

لگی لپٹی ہر اک سے یہ بری عادت تمہاری ہے
مری جاں اس میں اک دن احتمال فوجداری ہے

ترقی پر خدا کے فضل سے ہے بزم رنداں بھی
فقط پیر مغاں تھے آ گئے اب پیر نسواں بھی

شیخ بھی ہیں دیر کے سائل بس اتنا فرق ہے
مجھ کو بُت سا چاہیئے اُن کو سمو سا چاہیئے

کیا تعجب ہے دیا ووٹ جو لالہ کے لئے　　　بت تو تھے ہی مرے معشوق برہمن بھی سہی
کھول کر در کو کہا اُس بت اسکولی نے　　　جب نقاب اُٹھ گئی آگے سے تو چلمن بھی سہی
کاش کر لے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور　　　کیک تو روز ہے اک رات متنجن بھی سہی

سنتا ہوں قبر مری ریل میں آجائے گی
خود مٹا ہوں جب اسی راہ میں مدفن بھی سہی

قلی اک اس طبیعت کا ملا جو کل یہ کہتا تھا　　　مرے دل میں خیالات بلند آنے نہیں پاتے
سڑک پر کام میں تکلیف ہے بنگلے پہ بے لُطفی　　　یہاں سایا نہیں ہے اور وہاں گانے نہیں پاتے

کھٹملوں پر زجر و طعن و غیظ سے منہ موڑیئے　　　گرم پانی ڈالئے یا چار پائی چھوڑیئے

زندگی تھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے　　　کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہے دین ہائے
ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی شامت دیکھئے　　　ان کا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں یاسین ہائے

کیا خوشی اس کی مجھے۔ ان کو جو نوابی ملی　　　روغنی صاحب نے لی مجھ کو دہی آبی ملی

جیب سے مفروریِ زر بے تحاشا دیکھئے　　　جلوۂ بازار مغرب کا تماشا دیکھئے

نکلا بہ آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے　　　اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی
خواہش ہے اب یہ بعض محبّان قوم کی　　　نکلے کسی طرف سے یوں ہی اولڈ گرل بھی

اکبرؔ دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے ۔۔۔ لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

وہ ہیں ذی علم و معزز جن کا ارشاد و عمل ۔۔۔ طالبانِ حق کے دل کی کر رہا ہے رہبری
بعض اسپیکر نظر آتے ہیں تم کو یہ تو ہیں ۔۔۔ نوکری اور ممبری کی منڈوی کے چودھری

یہ غنچے میل کی اُمید کے کھلنے نہیں پاتے ۔۔۔ خدا اس پیٹ سے سمجھے کہ دل ملنے نہیں پاتے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی ۔۔۔ یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

نہ ان میں رنگ باغی کا نہ ان میں بو ہے داغی کی
یہ حجت ہے فقط درگاہ قومی پر چراغی کی

یہ پردہ در کو سوتے قوم کس نے بھیجا ہے ۔۔۔ کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن ۔۔۔ ازار بند کو کہہ دیں گے جس بیجا ہے

سدا سرحد پہ حاجت ہے رفل کی اور کاٹھی کی ۔۔۔ چلی جاتی ہے گستاخی لغندے خاں کی لاٹھی کی

باز آئیں گے نہ پولیٹکل انٹریگ سے ۔۔۔ جب کچھ نہیں تو لاگ لگائیں گے لیگ سے
اک شغل زندگی ہے بہار نمود ہے ۔۔۔ منظور دشمنی نہیں اپنے کلیگ سے

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے ۔۔۔ یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

اب کہاں دست جنوں تار گریباں اب کہاں — پانیر اور دست مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا — ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدعائے خاص — جس رُخ ہے قافیہ مرا مطلب بھی ہے وہی
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جناب شیخ — جس وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

کب حاضریِ شب کی اجازت طلب ہوئی — کیوں ضبطِ شوق دل کی ضمانت طلب ہوئی

کچھ اور بزلہ سنجیاں

بحرِ آزادی میں یہ کیسا تموّج ہو گیا — قاصراتُ الطرف[1] کو شوق تبرّج[2] ہو گیا

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

مرا کینہ نتیجہ ہے جفائے چرخ گرداں کا — مرا پینا ہے منبع سیل اشک چشم گریاں کا
مرا جینا ہے بس اک سلسلہ انفاس سوزاں کا — مرا سینا ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے، میرے گریباں کا
خدا سر دے تو سودا دے کسی دلچسپ میداں کا — خدا زر دے تو دل کو ذوق دے یورپ کے ساماں کا
خدا پر دے تو ہدہد کر دے بلقیس و سلیماں کا — خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا

---

[1] نیچی نگاہ والیاں [2] اپنا سنگار دکھاتے پھرنا۔

جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسی سنبلستاں کا

دور گردوں نے ابھارا دیر کو سچ ہے مگر
یہ نہ کہئے حضرت سید نے پھر کیا کرلیا
ان نگاہوں سے کہ جو تھیں خوگر طوف حرم
آفریں کہیے کہ بت خانے کو اپنا کرلیا

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ
می برد ہر جا کہ میز است و پلیٹ

بزرگان ملت نے کی ہے توجہ
کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقی دیں ہو گی اب روز افزوں
علی گڑھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

دونوں صاحب ہیں محب قوم کس کو ووٹ دوں
پیش کر سکتا ہوں کیوں کر کوئی دعویٰ بے دلیل
بس دعا میری یہ ہے اللہ فرمائے عطا
کامیابی ایک کو اور ایک کو صبر جمیل

ہوا آج خارج جو میرا سوال
کہا میں نے صاحب سے باصد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ
وہ جھنجلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سنکر بہت طبع غمگیں ہوئی
مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے
تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

متفرقات

مبارک ہو فلک کو مائل جور و ستم رہنا
طریق حق پہ لازم ہے ہمیں ثابت قدم رہنا

مسلم ہے مگر بات نبی کی نہیں سُنتا
لڑکا ہے مگر اپنے ولی کی نہیں سُنتا
ہاں آپ جو فرمائیں تو سب ہیں ہمہ تن گوش
آپس میں تو اب کوئی کسی کی نہیں سُنتا

من نگویم کہ دریں باغ پئے جنگ در آ
آخرت پیشِ نظر دار و بہر رنگ در آ

اس دورِ فلک میں کوئی کیا دیکھے گا
جو کچھ دکھلائے گا خدا ۔ دیکھے گا
رنجیدہ ہے جس نے ابتدا دیکھی ہے
بے حس ہوگا جو انتہا دیکھے گا

اثبات خدا کو منطقی اُٹھا نہ سکا
خاک حیرت سے ذہن ہی اُٹھ نہ سکا
اللہ رے نزاکت وجود باری
ثابت ہونے کا بار بھی اٹھ نہ سکا

ایسے غمزوں سے دلِ خوں گشتہ کیا ہوگا بحال
اب تو جو ہونا تھا وہ اے چشم کافر ہو چکا

بوئے گل میں فسوں ہی وہ نہ رہا
موسم بدلا جنوں ہی وہ نہ رہا
سینے میں وہ دل کہاں سے آئے اکبر
جب اپنی رگوں میں خوں ہی وہ نہ رہا

بگڑا میں بہت ان پہ مگر بات بنی کیا
آنا بہ تکلف جو ہوا بھی شدنی کیا

زمزمہ اوجِ فلک پر ہے یہی ہر برڈ کا ہے یہی مفہوم روئے ارض پہ ہر ورڈ کا
زینتِ گیتی ہے ملکِ اعظمِ برطانیہ سکّہ بیٹھا ہے دلوں پر حضرت اڈورڈ کا

ہم کو ابرو کی کجی[1] نے مارا شیخ صاحب کو حجی[2] نے مارا

خانۂ دیں ہوا القصہ تباہ آئی آواز کہ اِنّا للہ

گئی حق پرستی بھی اس دور سے شرافت کو بھی چرخ نے تہ کیا
یہی شرطِ دعوت ہے اب قوم میں اگر سیم داری بیا رو بیا

پیدا ہوا دماغ میں جوشِ نشاط کیا ننھا سا پھول دیکھئے اس کی بساط کیا

اثر سب پر پڑا ہے انقلابِ رنگِ عالم کا نہ اب ہے طعن کا موقع نہ ہے اب وقت ماتم کا
بسر کر با قناعت زندگانی کنجِ عزلت میں نظر ہیں پر مناسب ہے تصوّر چھوڑ دے ہم کا

کیا زور تھا وعظ و نیچر میں دیوتاؤں کا بھی جی چھوٹ گیا
تقویٰ کی بنائیں ہو گئیں شق شیرازۂ ملّت ٹوٹ گیا

ایک اس عہد میں دو دل بھی نہیں اے اکبر یہی باعث ہے کہ میں نے کبھی ہم ہم نہ کیا

---

[1] ایک نفس پرستی میں مبتلا ہے۔ [2] ایک آتش پرستی میں مبتلا ہے

شکر ادا کرنا ہے واجب ان کی طبع نیک کا — ہر ڈنر سے بھیجتے ہیں مجھ کو فوٹو کیک کا
ضعف ہے رعشہ ہے یا غربی ہوا کا ہے اثر — ہینڈ[1] کو میرے مرض لاحق ہوا ہے شیک[2] کا

ہم تو ہر حال کو ماضی ہی سمجھ لیتے ہیں — لوگ مر جائیں گے اور وقت گذر جائے گا

شیخ لندن میں بھی مسجد کی بنا پر ٹھن گیا — کعبۂ دل میں کلیسا عشقِ مس کا بن گیا

ہے بے اثر کیا نہیں جس نے فقط کہا — اکبر نے یہ کہا تو کہو کیا غلط کہا

فتح عرب پہ گو ہے تمہیں شوق ناز کا — بہتر ہے اس سے ذوق درود و نماز کا
گردن اٹھائیے نہ بہت پالٹیکس میں — مسجد میں اب ہے کام جبین نیاز کا

ہو جاگتوں میں شامل یا تو ہو سونے والا — ہو کر رہے گا اکبر جو کچھ ہے ہونے والا

وقت ہی پہ ہر ایک کام اچھا — آسماں کا پروگرام اچھا
قرب ہے جن کو تخت شاہی سے — دور ہی سے انہیں سلام اچھا

فضول بحث میں وقت اپنا کھو نہیں سکتا — زیادہ اب شب غفلت میں سو نہیں سکتا
گذر گیا دلِ دنیا پسند دنیا سے — اس انجمن کا میں اب رکن ہو نہیں سکتا

۱؎ ہاتھ ۲؎ جنبش - شیک ہینڈ - ہاتھ ہلانا - ۱۲

مصیبت آپڑی تو سہل ہے شدت سے غم کرنا　　مگر مشکل ہے جینا باخبر غفلت کو کم کرنا

کرتا نہیں کوئی ان میں ذکر مولے　　ہے مانگ روپے کی غل ہے دش لا تشمولا
مجلس ہی یہی تو اس سے عزلت بہتر　　دنیا ہے یہی تو ترک دنیا اولے

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا　　طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

بے زر و نمود کا اثر کیا　　جب مغز نہیں تو لفظ سر کیا

صوفی کا مذہب مختصر، سب سے کھرا، سب سے جدا　　ہم تم کے جھگڑے لغو ہیں یا کچھ نہیں یا سب خدا

نہیں اہل یقیں جب وہ تو بہ کیا مذہبی ہوں گے　　اثر پڑتا ہے شاگردوں پہ استادوں کے باطن کا

ضعف مشرق نے تو رکھا پاؤں کو جھکڑا وہی　　مغربی فقروں نے لیکن منہ کو انجن کر دیا

طلب زر ہے جن کو اے اکبرؔ　　وہ رہیں منکر خزانۂ غیب
ہم تو مضموں وہیں سے پاتے ہیں　　معتقد ہم تو اس کے ہیں لاریب

نہیں مناسب کہ ہو یہ مہوا کبھی حریف موبز صاحب
بجا ہے فرما رہے ہیں جو کچھ حکیم عبدالعزیز صاحب

حکیم اور بید یکساں ہیں اگر تشخیص اچھی ہو　　ہمیں صحت سے مطلب ہے بنفشہ ہو کہ تلسی ہو

حواس مختل سمجھ پریشاں عمل میں سستی قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہنما ہے کبھی کوئی پالیسی ہے غالب
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں دورِ فلک میں اکبرؔ
مقیم دیر و مرید شیخ و اسیر قانون و محو مغرب

اگلی روش جو تھی، وہ تھی پیغمبری کی بات　　موجودہ ہر طریق ہے کاریگری کی بات

پڑا تھا چٹائی پہ گوشے میں میں　　نہ اٹھا جو آئے مرے ایک دوست
شکایت انہوں نے جو کی کہدیا　　تواضع ز گردن فرازاں نکوست

درکار چندہ سیم و زر از جیب دور رفت　　مال حضور بودہ براہ حضور رفت

تضمین بر غزل حافظؔ

واقف سر خفی حافظ اسرار بماند　　حد بیگانہ باطن صفت اظہار بماند
خلق صد رہ طرف شبہ و اقرار بماند　　ہر کہ شد محرم دل در حرم یار بماند
وانکہ ایں کار ندانست در انکار بماند

شمس و پنج اس میں کسی کو ہے نہ ہے ہفت نہ ہشت　　بے خطر کوچۂ رندی میں لگاتے رہے گشت
نہ تو گلشن ہی ہوا معترض ان پر نہ تو دشت　　خرقہ پوشاں ہمگی مست دگذشتند و گذشت

قصۂ ماست کہ بر ہر سر بازار بماند

قیس و فرہاد کے قصّوں سے بھرے ہیں دفتر — آج تک ان کے فسانوں کا دلوں پر ہے اثر
خوب فرما گئے ہیں حضرتِ حافظ اکبر — از صدائے سخن عشق نہ دیدم خوشتر
یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

میں نے کہا کہ اب تو مسجد سے ہے مجھے کد — گرجا بھڑکے بولا میں اس سے خوش ہوں بے حد
میں نے کہا مخالف تیرا بھی ہوں تو بولا — میری ہی پالیسی کی واللہ ہے یہ اجد
شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشتِ خاکِ ماہم بر باد رفتہ باشد

غم عشق تو دلے را چو لطیف و پاک سازد — غم دہر را چہ یارا کہ ورا ہلاک سازد

مس من فگند بر من نظرے کہ کس نداند — دل من گرفت از وے اثرے کہ کس نداند
چو سوال کردم از وے ز مآل کار کالج — ز پروفسر شنیدم خبرے کہ کس نداند

طفل مکتب ز سخنہا ز زباں می گوید — شکوہ کم کن کہ چنیں گفت و چناں می گوید
طبع او فونوگراف است و سر دوش سبقش — انچہ بستند بر و نقش ہماں می گوید

نہ سنّی ہے خوش اور نہ شیعہ ہے شاد — ہے دونوں کے مرکز میں برپا فساد
غم ٹرکی و ماتم پرشیا — مسدس ادھر ہے ادھر مرثیا

ہے دل روشن مثال دیوبند | اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو | اک معزز پیٹ تم اس کو کہو
پیٹ ہے سب پہ مقدم اے عزیز | گو کہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

نہ ہر کہ ووٹ بیند وخت ممبری داند | نہ ہر کہ بحث بیاموخت لیڈری داند
نہ ہر کہ ہیٹ بپوشید و کوٹ در بر کرد | ادائے مغرب و آئین مسٹری داند

تھی مرے پیش نظر وہ مِس تہذیب پسند | کبھی وسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زقند | پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قبر میں بند

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر | فضل خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

ہیں اہل جہاں منکر اللہ سے کد پر | دو پھول بھی رکھتے نہیں ملحد کی لحد پر
ہنگامے انہیں کے لئے ہیں صل علیٰ کے | جو زیست میں عاشق تھے ہو اللہ احد پر

حضرت کی نبوت میں ہو کس طرح مجھے شک | ہر ذرہ کو ہے ورد رفعنا لک ذکرک
تھی شان جلالی کہ عدو ڈر گئے آخر | وہ نور تھا عالی کہ صنم جھک گئے آخر

میں بھی ہوں بدل مؤید آزادی کا | لیکن اک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر

آزاد ہو اس لئے کہ اغیار ہو قید　　مطلب یہ نہیں کہ خود ہو غیروں کے اسیر

شتر روباہ سے کمتر ہیں بن میں محتبس ہو کر　　بنے ہیں شیر کتنے زینتِ آغوش میں ہو کر
قرار دل نہیں تو نورِ عرفاں کیا جگہ پکڑے　　وہ شکل مہر و مہ موجوں میں کب ہے منعکس ہو کر

احباب نے طویل مضامیں وہاں پڑھے　　لیکن مری زبان کا تھا۔ حصہ مختصر
میں نے تو بزم نعت میں اتنا ہی پڑھ دیا　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

پیری و افسردگی سب کچھ سہی اکبر مگر　　ظلم ہے تیری خموشی شوخیٔ گفتار پر

یاروں کی دوڑ دھوپ ہے دنیا کی چیخ پر　　اور دین ہے کباب ضرورت کی سیخ پر

نہ سن تو قرآں کا وعظ بھائی خوشی سے تقلیدِ ہکسلے کر
پھرے گا کیمپوں میں آخر اک دن دیا سلائی کا بکس لے کر

فاقہ سمجھو نہ اسے اس میں ہے اسرار نہاں　　عالمِ دین جو ہیں وہ جانتے ہیں صوم کے ہیر
نہ تجارت کا سلیقہ نہ عبادت سے لگاؤ　　یا گورنمنٹ کے دفتر میں ہیں یا قوم کے ہیر

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور　　ہر حرف سے ہے تجلّیٔ حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ　　ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور

اللہ رے انقلاب طرز و مذاق مشرق — حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر
لیلیٰ کا ناز رخصت۔ اسکول مسٹرس ہیں — سودائے قیس غائب اب وہ بنے ہیں لیڈر

تا توانی در جہاں طالب مشو مطلوب باش — با معاشر سہل باش و نیک باش و خوب باش
مذہبے در گردنم افتاد اکبر چارہ نیست — با ہمہ آزادگی ہا بایکے منسوب باش

اک شاعری وہ ہے جو بڑھاتی ہے عقل و ہوش — اک شاعری وہ ہے جو دلاتی ہے دل کو جوش
ارشاد ہو تو قسم سوم کو بھی کر دوں عرض — اک شاعری وہ ہے جو ہے صرف واہ نوش
لیکن کوئی بھی قسم ہو اچھا ہے شعر اگر — محفل کو غالباً ہمہ تن پائے گا بگوش

پیش آئے ہمیں امور عادت کے خلاف — پایا انہیں ہم نے اپنی راحت کے خلاف
اولاد کو غالباً یہ تکلیف نہ ہو — وہ خود ہی ہیں مورثوں کی خصلت کے خلاف

آنے والے نہ رہے انجمن دل کی طرف — کوئی کالج کی طرف ہے کوئی کونسل کی طرف

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق — نیچر تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات — مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

وسعت ہو زباں کی ادھر جھک — متروک کو دیکھ کر تو مت رُک

ہے لیڈر قوم کون۔ جب ہو یہ سوال — کہہ دو اکبر کہ بس برٹش اقبال

نطرت سے الگ اگر تمہارا ہے خیال تاثیر کچھ اس میں ہو یہ ہے امر محال
گو طرز بیاں پہ شور تحسیں اٹھے مقبول نہ ہو گے پیش ارباب کمال

کوئی کہتا ہے رکھو صاحب سے میل کہ آنر کی گھر میں رہے ریل پیل
کسی کی صدا ہے کہ ہندو بھلے مری انجمن بھی اسی رخ چلے
کسی سمت کونسل کی ہے دل میں چوٹ عوض لٹھ کے آپس میں چلتے ہیں ووٹ
کسی سر میں ہے لیڈری کی ہوس کوئی شہد اسپیچ کی ہے مگس
کوئی شوق تحقیق میں غرق ہے کوئی راہ تقلید میں برق ہے
کسی کو ہے مضموں نگاری کی دھن کوئی چندہ دینے کو سمجھا ہے پُن
کسی کو عمارت بنانے کا شوق کسی کو نمود و نمائش کا ذوق
کسی کو کوئی ٹوک سکتا نہیں مٹرک کو کوئی روک سکتا نہیں
جدھر بحر ہستی بہائے بہیں خدا سے دعا ہے کہ سب خوش رہیں
مگر شیخ سعدی کی ہے ایک بات مسلماں کو ہے فرض اُدھر التفات

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

ہوئے جمع بہر دعا و سلام کلیسا میں انگریز عالی مقام
کہا میں نے ہوں میں تو مسجد سے دور تو گرجا میں ان کا ہے کیوں اژدھام
خدا جانے آئی کدھر سے صدا کہ لے بے خرد مسلم ناتمام
کسے را کہ اقبال باشد غلام
بود میل خاطر بہ طاعت مدام

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم — گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زباں نہیں ہے شمع اخلاص — جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

صوم ہے ایمان سے رخصت صوم گم — قوم ہے قرآں سے رخصت قوم گم

جلوۂ قدرت باری ہے سدا پیش نگاہ — نہ حکومت کا ہے ماتم نہ غم مال سے کام
کوئی ماضی میں ہے اُلجھا کوئی مستقبل میں — صوت سرمد پہ مجھے تو ہے فقط حال سے کام

مغالطے میں پڑے ہیں ہمارے اہل وطن — کہ قوم کے لئے مذہب کا کوئی کام نہیں
قوام قوم کا مذہب ہی ہے زمانے میں — کہاں کی قوم جب اس کا کوئی قوام نہیں

بُت کی سی اگر کہیں تو اللہ کہاں — اللہ کا نام لیں تو یہ واہ کہاں!
خاموش رہیں تو دل کو بے چینی ہے — بھاگیں تو سکت کسے ہے اور راہ کہاں

قول ملحد ہے کہ نیچر ہو گیا میرا معین — اور فلک کی ہے صدا واللہ خیر الماکرین
ہم خموشی سے تماشا دیکھتے ہیں دہر کا — دیکھنا ہے کون سچ کہتا ہے دنیا یا کہ دیں

گیتیوں میں ہے رونے کا خوب شوق انہیں — مگر نماز و دعا کا نہیں ہے ذوق انہیں
بغیر طاعت حق ہے محال یک جہتی — خدا کرے کہ نظر آئے تحت و فوق انہیں

دخل ان کو نہیں عشق و محبت کے فنوں میں — بے ہمت و بے سوز یہ جانیں ہیں تنوں میں

بے شمع کے پروانے ہیں واللہ یہ اکبر   رقصاں ہی انہیں دیکھ لو بس انجمنوں میں

اسیر بحث کب باغیرت و ذی ہوش رہتے ہیں   مٹا دیتے ہیں مٹ جاتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں
معانی گرم رکھتے ہیں جنہیں اللہ اکبر سے   انہیں سینوں میں اے اکبر دل پرجوش رہتے ہیں
عجب میدان ہے جس میں ہے مشق سعی بے حاصل
عجب بستی ہے جس میں مرد ناحق کوش رہتے ہیں

کہیے جو صرف طاعت و روحانیت سے بحث   مجھ کو ہنوز امید ہے بیگانگی نہیں
مکر و فریب ظلم یہ سب اس میں ہیں مگر   شیطان میں دلیری و مردانگی نہیں

کہنا مجھ کو جو کچھ ہے وہ کہنے دیں   دینی علموں کی موج کو وہ بہنے دیں
شبلی کی دعا بتانِ مغرب سے یہ ہے   ندوہ کو حضور قبلہ رخ رہنے دیں

تسبیح وہ اب کہاں وہ تہلیل کہاں   قرآن مجید کی وہ ترتیل کہاں
کل کے آگے خیالِ فردا کس کو   جب ریل ہے سامنے تو جبریل کہاں

اس پیڑ میں خوب ہی کٹھل آئے ہیں   ہر شاخ میں پانچ سات پھل آئے ہیں
اکبر نے کہا کہ ہم غریبوں کے لئے   نیچر کی طرف سے پارسل آئے ہیں

نہ ہوں جو شعر مرے آپ کو پسند نہیں   پسند فرض نہیں اور مجھے گزند نہیں
بجز خطائے نظر اور سہو کاتب کے   کچھ اعتراض اگر ہیں تو سودمند نہیں

حدود میں نے معیّن کئے ہیں اپنے لئے
اور ان حدود کے اندر کہیں میں بند نہیں

یہ قول کفر جو مانو بھی تم بفرضِ محال — کہ روح ہیچ ہے اور بعد مرگ کچھ بھی نہیں
خدا کا نام ہے جب بھی بشر کو اک نعمت — وگرنہ دل کے لئے ساز و برگ کچھ بھی نہیں

آپ کی کل میں مرا سُوت تو کتنے کا نہیں — کفر کے ساتھ میں اخلاق برتنے کا نہیں

وہ کبھی مجھ کو جواب نامہ لکھتا ہی نہیں — جب گلا کرتا ہوں کہہ دیتا ہے پہنچا ہی نہیں

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں — مذہب کے جھگڑے[1] چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر — کہنے لگا بتائیے تیشے کو کیا کریں

میں نے کچھ اختلاف کیا آپ سے اگر — غصّہ عبث ہے آپ کا نوکر نہیں ہوں میں
اے قبلہ مجھ پہ آپ چڑھے آتے ہیں یہ کیوں — ممبر اس انجمن کا ہوں۔ منبر نہیں ہوں میں

روپے کو اپنے کریں صرف وہ جو غلّے میں — تو کام آئے غریبوں کے اس محلّے میں
یہ بات مجھ کو تو اے ہاشمی پسند نہیں — کہ صرف دولتِ عشرت ہو گیند بلّے میں

لہ آپس کی خانہ جنگی مراد ہے۔ نہ وعظ مذہب۔

ڈیپوٹیشن کی سبزی جو دیکھی اس نے شملے میں — برہمن نے کہا یہ شاخ بید اور ایسے گملے میں
کہا مہدی نے بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے — تمہارے واسطے یہ کیا محل رشک و غیرت ہے
تعجب کیا ہے ہم اس بت کے پہلو میں جو لیٹے ہیں — حرم کے محترم کیا دیر کے خادم سے ہیٹے ہیں
برہمن نے کہا بس آپ کی باتیں ہی باتیں ہیں — اجی یہ وصل کی راتیں نہیں ہیں ان کی گھاتیں ہیں
کہا مہدی نے ہم کو تو مزے سے اپنے مطلب ہے — محبت ہو نہ ہو ان کو امید اس کی یہاں کب ہے

برہمن نے کہا ایسا خرا اعضا کا مضعف ہے
کہا مہدی نے ہاں اس بات سے بندہ بھی واقف ہے

مفقود ہے گو کہ آج یارونیشن — صد شکر ہوا ظہور کارونیشن
مانگو خالق سے حضرت جارج کی خیر — تم بھی ہو جاؤ گے ٹو مارونیشن

حضرت خود واقعات تصنیف کریں — ہم بیٹھ کے انجمن میں تعریف کریں
فطرت پہ نگاہ جن بزرگوں کی ہو — بہتر ہے یہی کہ وہ نہ تکلیف کریں

صلح رہی اب نہ گوارا ہمیں — سلف گورنمنٹ نے مارا ہمیں
کام تو جو کچھ ہے وہ ہے آپ کا — نام ہی نے صرف ابھارا ہمیں
درد کسی کا نہ رہا دل میں اب — خوب دیا تم نے بھپارا ہمیں
قوم کی تفریق میں ٹکڑے اُڑے — ملک سے اب کیا ہے سہارا ہمیں
آئینہ ہے حسرت دنیا کا حال — یاد ہیں اسکندر و دارا ہمیں

جلوہ دکھانے کا انہیں شوق ہے
کاش مبارک ہو نظارا ہمیں

غضب کی آتش فشاں ہوا ہے پڑے ہیں بستر پہ جل رہے ہیں
عرق میں ڈوبے ہوئے سراپا تڑپ رہے ہیں اُبل رہے ہیں

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

انجینری نہ آئے تو ایجاد کیا کریں
قایم عروج قوم کی بنیاد کیا کریں
خامے سے کام لیتے ہیں بے کار عقل ہے
یا ترجمہ ہے یا تو کتابوں کی نقل ہے

یہ تو مشکل ہے کہ آپ اسپیچ دیں ہم چپ رہیں
ہاں مگر اس میں نہیں کچھ عذر جو کہیے کہیں
مرد جنٹلمین ہو کر پا رہے ہیں جب عروج
بیبیاں پھر گھر میں رنج کسمپرسی کیوں سہیں
مطمئن رہیے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب
چادر قومی کی آخر کھلتی جاتی ہیں تہیں
اک طرف دامِ ترقی اک طرف موجِ شراب
ہر طرح حاضر ہیں ہم کہیے پھنسیں کہیے بہیں

اگر مذہب خلل انداز ہے ملکی مقاصد میں
تو شیخ و برہمن پنہاں رہیں دیر و مساجد میں

ترقی کی تپیں ہم پر چڑھا کیں
گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے آیا ہی نصیبن
وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

مری طرزِ فغاں کی بوالہوس تقلید کرتے ہیں
خجل ہوں گے اثر کی بھی اگر اُمید کرتے ہیں

جہاں کے انقلابوں کے بھی کیا کیا رنگ ہوتے ہیں
بشر کی کیا حقیقت ہے فرشتے دنگ ہوتے ہیں

گذر اُن کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں
پلے کالج کے چکّر میں مرے صاحب کے دفتر میں

ہمیں تو چاہتے ہیں کھینچنا خود ہم سے کھنچتے ہیں
یہ ان کی پالیسی کے باغ کس پانی سے سینچتے ہیں

نہ اب وہ طشتِ زریں ہیں نہ وہ چاندی کے کلسے ہیں
کمیٹی خوانِ نعمت ہے فقط لفظوں کے جلسے ہیں

فلک پر شان و عظمت سے ستارے جگمگاتے ہیں
خدا کی سلطنت کی جوبلی ہر شب مناتے ہیں
یہی نظارہ ہم کو محو رکھتا ہے سدا اکبرؔ
فرشتے بے ٹکٹ یہ منظرِ اعظم دکھاتے ہیں

قدم انگریز کلکتے سے دہلی میں جو دھرتے ہیں
تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں

خدا ہی کی عبادت جن کو ہو مقصود اے اکبرؔ
وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو طرزِ عبادت میں

فلک کو ضد ہے کہ منت کروں پئے راحت
مجھے یہ ہٹ ہے کہ ایذا سہوں اور اُف نہ کروں
وہ کہہ رہا ہے کہ ذلت سہو تو جاؤ چمک
مری یہ آن کہ ایسی چمک پہ تُف نہ کروں

پیارا ہے فقط اللہ کا نام آرام اسی سے روح کو ہے
اور یوں تو حوادث بے حد ہیں دنیا میں بہت افسانے ہیں

عجب کیا شیخ برگد میں جو مشتاق غلامی ہیں
ہمارے اونٹ صاحب خود ہی کمسریٹ کے حامی ہیں

غیر کو نامے میں وہ مائی ڈیر لکھتے ہیں
مجھ سے بیگانہ وشی ہے مجھے سر لکھتے ہیں

ہوٹل سے بھلا پرہیز تمہیں اے پنڈت جی مہراج کہاں
سچ بات کہی جس نے یہ کہا جب لاگ لگی تب لاج کہاں
نظروں میں بسا ہے رنگ وہی آنکھیں وہی گلشن ڈھونڈتی ہیں
موسم وہ نہیں ہے اے اکبر جو بات تھی کل وہ آج کہاں

سر جھکا کر ان کی سیوا کر تو گردن کو نہ تان
برہمن یورپ کو مان اور ایشیا کو شودر جان
وزنِ لائلٹی پہ نازاں ہیں مرے ارکان شعر
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

اگر ڈوبے ہوئے ہیں آپ سچ مچ حق پرستی میں
تو کرتے رہیئے کام اپنا انہیں حالات پستی میں

آپس میں رہنا صلح سے خوئے بنی آدم نہیں
اگر اسی پر ہے عمل یا تم نہیں یا ہم نہیں

بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور
خیال تھا سوئے تشبیہ جستجوئیں تھیں
ہوا جو ٹائی ٹنک[۱] غرق کہہ دیا میں نے
کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزوئیں تھیں

---

۱ جہاز میں پندرہ سو یوروپین عمائد غرق ہو گئے ۔ مرد ۔ عورت ۔ بچے ۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو ۔۔۔ جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد ۔۔۔ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

کونسل میں اگر پرسش نہ ہوئی مغموم نہ تم اے یار رہو ۔۔۔ اللہ بلانے والا ہے مرنے کے لئے تیار رہو

الاپو مغربی سر میں کوئی راگ ۔۔۔ اٹھو مسجد سے اور دامن کو جھاڑو
جنونِ لیڈری کا دور ہے یہ
خموشی اور قناعت ناروا ہے ۔۔۔ فلک کو کد ہے بگڑو اور بگاڑو

کیوں جلا رکھا ہے اس دور نے بیری ہیں مجھے ۔۔۔ ستمِ غیر ضروری یہ فلک کا دیکھو
کہا گردوں نے نہیں غیر ضروری یہ بات ۔۔۔ اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو

ہادیِ قوم بنو ۔ قوم کے مہمان بنو ۔۔۔ خود تو پہلے مگر اے یار مسلمان بنو

ہستی ہی تیری کیا ہے کہ ہو ان کا ہم سفر ۔۔۔ موجوں کا لے حباب نہ دے تو ابھر کے ساتھ

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی ۔۔۔ سعی کا موقع ملے تو آرٹ یا سائنس سیکھ
دشمنِ دانا سے بچ پہچان لے نادان دوست ۔۔۔ صرف لفاظی سے ان روزوں نہیں ملنے کی بھیک
دلا دے ہم کو بھی صاحب سے لائلٹی کا پروانہ ۔۔۔ قیامت تک رہے سید ترے آنر کا افسانہ
اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو ۔۔۔ اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ
مبصر کہہ رہے ہیں وضعِ ملت کے تغیر پر ۔۔۔ بندھی یہ دھن تو بس اب ہو چکا مسلم کا ترانا

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ　　ادھر صورت فقیرانہ اُدھر سامان شاہانہ
مبارک شیخ کو نانِ جویں کے ساتھ یہ قرأت　　ہمیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور بھجن گانا
یہ یونیورسٹی کا مسئلہ کیا کم تھا اے گردوں
کہ چھیڑا تو نے ہم میں ٹرکی واٹلی کا افسانا!

یہ قسمت شیخ جی کی ورنہ اکبرؔ　　کجا وہ بت کجا آمنت باللہ

مرشد کی طلب میں جو میں اٹھا تو یہ بولے　　اک پیر ڈنر خوردۂ وہر سمت دویدہ
مردہ سمجھ ان کو کہ جو پہنچے ہوں خدا تک　　مرشد ہیں وہی جو ہیں گورنمنٹ رسیدہ

مجھ کو حسرت نہیں اس کی کہ کریں یاد مجھے　　یاد آئی بھی تو کیا آئی جو تحقیر کے ساتھ
مسمریزم کی ہو تدبیر نژادوں ہی پہ مشق　　چھوڑدیں مجھ کو وہ آنکھیں مری تقدیر کے ساتھ

گو یہ عزّت ہے کہ پائی تری محفل میں جگہ　　لذت اس میں ہے کہ مل جائے ترے دل میں جگہ

ہر ایک مسلم پکارتا ہے وہ خواہ انسی ہو خواہ جنّی　　خدا کی طاعت سے جو ہے باہر فلیس منّی فلیس منّی

الحاد کی بنیاد ہے جس چیز نے ڈالی　　دشمن اسے سمجھے گی نظر دیکھنے والی
اکبرؔ کی فغاں کو نہ کہو خام خیالی　　فرماتے ہیں رو رو کے یہ خود حضرت حالی
اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

شیطان ہے دل جو نورِ ایماں نہ رہے
دشمن ہے زباں جو وردِ قرآں نہ رہے
کہتی ہے یہ ہسٹری بہ آواز بلند
تم کچھ نہ رہے اگر مسلماں نہ رہے

نہایت سچ یہ قول میرزا سلطان احمد ہے
کہ مذہب خود دعا ہے پھر دعا سے کیوں تمہیں کد ہے

روز افزوں ہے بلاشبہ برٹش اقبال
جو خلاف اس کے تصور کرے وہ وہمی ہے
اپنا اقبال مگر اس نے جو سمجھا ہے اِسے
یہ نئی روشنی کی سخت غلط فہمی ہے

بہت ہے ذکرِ مذہب کمپ میں ذکرِ خدا کم ہے
فغاں کا شوق بے حد ہے مگر ذوقِ دعا کم ہے

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں
مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں
میرزایانہ اداتھی سلطنت کی بات تھی
خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

دونوں کو اگرچہ ہے طلب آنر کی
رُخ ان کے جدا ہیں اس کی علت کیلئے
بنیاد وہ اپنی چاہتا ہے مضبوط
بے چین ہے یہ نمودِ حالت کیلئے
ہندو - عزّت طلب ہے زر کی خاطر
مسلم کو طلب ہے زر کی عزّت کے لئے

احسان نہ کچھ الحاد کا ہے امداد نہ کچھ شیطان کی ہے
اکبرؔ کی دلیری حق تو یہ ہے یہ زندہ دلی ایمان کی ہے

وہ نیو قوم کی ہے نہ پشتہ نہ بھیت ہے
بگڑے جو بن رہے ہیں یہ دنیا کی ریت ہے
ہنگامۂ طرب نہیں یہ شورش رفارم
رنج و محن کا ساز ہے چکّی کا گیت ہے

ممدوح شرق و غرب و شمال و جنوب تھے
تعریف تھی ہنر کی بری از عیوب تھے
اب کچھ نہیں تو کیا کہیں تم سے کہ کیسے ہیں
ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ جب تھے تو خوب تھے

نقش ماضی منظر بے معنی و مفہوم ہے
مصلحت فطرت کی ہے یا ذہن کا مقسوم ہے
بہ رہا ہے لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحرِ فنا
ورد کے قابل فقط یا حیُّ یا قیّوم ہے

اِس بات میں ہے اک رمز نہاں اِس قافیئے میں چالاکی ہے
جب آہ و بکا کا ذکر نہ ہو تو وہ مجلس بے باکی ہے

مجھ گدا کو کر دیا رخصت جو دے کر عطرِ پان
فاقہ تو ٹوٹا نہیں۔ ہاں عزّت افزائی ہوئی
مرکزِ دل بزمِ مشرق میں کوئی ملتا نہیں
ہر طبیعت مغربی چکّر میں ہے آئی ہوئی
مذہب و وضع و زبانِ قوم کا کس کو خیال
جب اکابر کی نظر آنر کی شیدائی ہوئی
نظمِ اکبرؔ کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

نئے مسلم کا اب کوئی نہ ماخذ ہے نہ مرکز ہے
یہ ہی کے دن کی سردس اور وہ کب تک معزز ہے

جو مستی اس سے پیدا ہوگی دختر ہوگی وہ کس کی   یہ میں سمجھا کہ معشوقہ تمہاری دخترِ رز ہے
نہ پھیلا پاؤں تو اتنا حیاتِ چند روزہ میں
سمجھ لے قبر میں تیرے لئے جا صرف دو گز ہے

نہیں ہے کچھ شدنی بے اصول ارادوں سے   خدا بچائے مجھے اِن زمانہ زادوں سے

وہ وقعت اٹھ گئی جب دل سے آئینِ حجازی کی   امامِ قوم بننے کو ضرورت کیا نمازی کی
بتوں سے اب تو ہیں سرگوشیاں واعظ کی محفل میں   نہ کوئی مجلسی کی بات سنتا ہے نہ رازی کی

ٹھیک پڑھ سکتا نہیں کہتا ہے ناموزوں مجھے   خود زبانِ معترض ہی خارج از تقطیع ہے

مشرق کے جو ہو رہے وہ پستی میں پڑے   مغرب سے سبق لیا تو مستی میں پڑے
پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال یہاں   آخر یہ کیوں بلائے ہستی میں پڑے

مادہ نہیں اتنی مضطرب نر کے لئے   آمادہ ہیں جس قدر وہ آنر کے لئے
نو حصّے تم اپنی نوکری کو دے دو   دسواں حصّہ تو ہو پیمبر کے لئے

ہوش آیا ہے تو ہنگامہ ہستی بھی سہی   حسِ لذت ہے طبیعت میں تو مستی بھی سہی
اصل مقصود ہے خالق کی پرستش لیکن   صورت اچھی ہو تو انسان پرستی بھی سہی

تو حشر کا منکر ہے جو اے فتنۂ دوراں   کہتا ہے کہ نیچر میں پتا اس کا کہاں ہے

نیچر ہی سے ابھارا ہے ترا قامتِ رعنا — نیچر ہی میں واللہ قیامت بھی نہاں ہے

بے دینوں کو جوشِ مستی کیا ہے — بندوں میں یہ خود پرستی کیا ہے
کہتی ہے فلک کی گردش اُن سے — تم کیا ہو تمہاری ہستی کیا ہے

کہتے ہیں وہ کہ اکبرؔ کچھ باؤلا ہوا ہے — مذہب میں بات کیا ہے مسجد میں کیا دھرا ہے
اک روز لاٹ صاحب سے بھی تو پوچھ دیکھیں — گرجا میں کیا دھرا ہے جمتا جو واں پرا ہے

مجھ کو بے دل کرے ایسا کون ہے — یاد مجھ کو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ہے

عامل ہے ہوا باغ کی معمول ہے مٹی — مٹی ہے کبھی پھول کبھی پھول ہے مٹی

ہے جلوۂ مہر پر تو ماہ تو ہے — سینے میں تمہارے قلبِ آگاہ تو ہے
ظاہر جو نہیں ہے حامیِ دیں کوئی — بیدل کیوں ہو رہے ہو اللہ تو ہے

رخصت وہ ہوا جو آیا تھا وہ جائے گا جو آیا ہے
حیرت ہو تو کیا صدمہ ہو تو کیا دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے

سینے پہ بحرِ حسن کے سونے کی چین ہے — سیمیں ہیں دو حباب طلائی یہ پھین ہے

زمانے میں مجھے خواہش نہ اس کی ہے نہ اس کی ہے — سرورِ طبع کو کافی فقط اک جامِ وہسکی ہے

حسبِ فرمائش اڈیٹر نظام المشائخ

کیوں کر کہوں طریقِ عمل اُن کا نیک ہے — جب عید میں بجائے سوئیوں کے کیک ہے
مجبور ہوں مگر نہ ملوں اُن سے کس طرح — اب تک وہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے

اکبرؔ کی صاف گوئی کو میں نے کیا پسند — کل کہہ رہے تھے بار میں اپنے کلیگ[1] سے
اللہ سے لگائے رہیں لو جنابِ شیخ — ہم نے تو دل کی لاگ لگائی ہے لیگ سے

موٹر سے نہ گردن کبھی اے یار نکالی — تو نے نہ مری حسرتِ دیدار نکالی

بُت کدے میں جو ملکشا تھے وہ بالم ہو گئے — تھے جو کافر وہ حرم میں جانِ عالم ہو گئے
قصد یہ تھا کر دوں اس مطلع کو شرحِ مختصر — لکھنے کو بیٹھا جو میں کالم کے کالم ہو گئے

شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے — شمشیر کو چھپایئے زن کو نکالئے

نقد و جنس انجمن قوم میں موجود نہیں — یاں تو نقشوں کی فقط خانہ پُری ہوتی ہے

دار الاسلام اب تو شیدائے بتانِ غرب ہے — اب انہیں کے زیرِ سایہ ان کا دار الحرب ہے

کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے — دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

---

[1] COLEAGUE (ساتھی)

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت — وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسبِ دستور — تلاوت کرتے ہیں وہ پانیر کی

جب نئے عشووں کے نقشے زیب ٹیبل ہو گئے — بیسیوں بندے خدا کے آنرایبل ہو گئے

ہمارے شیخ شرعی زندگی بے سود کاٹیں گے — مرے ولفیر[۱] میں بھی انٹرسٹ[۲] اب وہ نہیں لیتے

اب کہاں نشو و نما پائے نہالِ معنی — کس زمیں پر دلِ پر جوش کی بدلی برسے
بزمِ حافظ ہے نہ میدان ہے فردوسی کا — قوم کو کام ہے باضابطہ لٹریچر سے

اس بُت کی محبت نے چھڑایا ہمیں سب سے — باقی رہی الفت نہ عجم سے نہ عرب سے

لطفِ امروز اور ہے اور فکرِ فردا اور ہے — راہِ دنیا اور ہے اور راہِ عقبیٰ اور ہے
نوجوانوں سے بزرگوں کو نہ کیوں ہو اختلاف — چشمِ بینا اور ہے چشمِ تماشا اور ہے

بادہ و رندی کا ذکر اب شعر میں بے سود ہے — کیا ضرورت نقل کی جب اصل ہی موجود ہے

ابھرا ہے رنگ سودا دیوانگی ہری ہے — ہے جوشِ موسمِ گل جو پھول ہے پری ہے
شمع اور پتنگ سے ہے ہر صبح وعظ عبرت — یہ بھی مرے پڑے ہیں وہ بھی بجھی دھری ہے

۱؎ Welfare بہبودی ۲؎ INTEREST دلچسپی

کعبے میں جلوہ گر وہی دیر میں ستر وہی — لیتے ہیں ہم خدا کا نام کہتے ہیں رام رام بھی
بولی وہ مس کہ شیخ جی پہلے مرے حریف تھے — اب سمجھ اُن کو آگئی دوست بھی ہیں غلام بھی

مہمان فلک کہاں سکوں پاتا ہے — آسودہ جو ہیں انہیں بھی ٹہلاتا ہے
ہے ہضم کی فکر میں یہ نقل و حرکت — ظاہر یہ ہے کہ پیٹ دوڑاتا ہے

منظور اے دل ہماری عرضی ہوگی — اس وقت کہ جب خدا کی مرضی ہوگی
اس دورِ فنا میں ہوگی لیکن جو بات — وہ صرف برائے نام و فرضی ہوگی

بہتر یہی ہے پھیر لیں آنکھوں کو گائے سے — کیا فائدہ ہے روز کی اس ہائے ہائے سے

کمزوریوں کو روک دیں زوروں کو کیا کریں — مسلم ہٹے تو فوج کے گوروں کو کیا کریں
منہ بند ہو سکے گا مسلماں شریف کا — چسکا مگر نہ جائے گا صاحب سے بیف[١] کا

دنیا ہی اب درست ہے قایم نہ دین ہے — زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

عاشقوں کے بھی معین ہو گئے ہیں اب حقوق — عہد انگریزی ہے یہ اے جان جاں شاہی گئی

بجا ہے جائے جو مٹ یونیورسٹی کے لئے — جنون قوم کو جائز ہے اس پری کے لئے

قایم یہی بوٹ اور موزا رکھئے — دل کو مشتاقِ مس ڈسوزا رکھئے

[١] BEEF

ان باتوں پہ معترض نہ ہوگا کوئی　　پڑھیئے جو نماز اور روزہ رکھئے

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر سٹی　　تال ہے ذکر ترقی سم ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دلوں سے ان کے یونہی گر مٹی　　مسلم اٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی

ہے ضروری لیڈروں میں غیرت و تقویٰ و دین
خود جو ان میں نقص ہو تو ہے یہ اے اکبر پٹی[1]

فرق آیا رنگ و بو میں ہوا کو ترس گئے　　ایسے بچھے کہ ہند میں مسلم اُبس گئے

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کار رند　　تا تو پاسے بکف آری و کنی عہدہ پُری
طاعتِ حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے　　شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے　　چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
بار آور پارک میں یہ ہوں گے کیا　　گملوں ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

ترقی ہو گئی شاہدِ مغرب کے جوبن کی　　عجب خوش فعلیاں ہیں آج کل شیخ و برہمن کی
نہ چندا ہے نہ بندہ ہے فقط مغرب کا خندا ہے　　اگر چندے یہی حالت رہی شیخ و برہمن کی

کالج ہے دنیوی فوائد کے لئے　　قایم ہے یہ ایسے ہی مقاصد کیلئے
مسجد میں یہاں جو مولوی صاحب ہیں　　کپتان ہیں مذہبی قواعد کے لئے

---

[1] افسوس (PITY)

کہتا ہوں تو تہمتِ حسد ہوتی ہے　　خاموشی میں دل کو سخت کد ہوتی ہے
دنیا طلبی ضرور ہے انساں کو　　لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے

ایامِ شباب اور موسمِ گل تقویٰ کی یہاں کیا ہستی ہے　　ہر عضوِ بدن ہے لذت جو۔ ہر قطرۂ خوں میں مستی ہے

خیال آتا ہے اکثر اے خدا کیا ہونے والا ہے　　قریب المرگ ہیں ہم پر بھی کوئی رونے والا ہے

جس کو خدا سعید کرے وہ سعید ہے　　روزے ہوئے ہوں جس کے قبول اس کی عید ہے

قوم کیسی کس کو اب اردو زباں کی فکر ہے　　غم غلط کرنا ہے بس اور آب و ناں کی فکر ہے
ایک پر اجماع اکثر کا بہت مشکل ہے اب　　سب ہیں مضطر اپنے منہ مٹھو میاں کی فکر ہے
ہو نہیں سکتی مرتب کوئی بزم سامعیں
ہر زباں کو ایک تازہ داستاں کی فکر ہے

عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے　　لطف کیا ہے گر لئے موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا　　روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے
نسخۂ آمنتُ باالمغربِ سے چمکے نیچری　　بابوؤں کا کام نکلا شور و شر کے زور سے
نعرۂ شب پر حریفوں کو نہایت ناز ہے
وہ نہیں واقف مری آہِ سحر کے زور سے

کالج بنا عمارتِ فخر النسا بنی　　شکرِ خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی

بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا　　جن کو یہ ڈر ہے ان کی تو جانوں بلا بنی
لیکن نگاہِ نبض شناسانِ وقت میں
امراضِ قوم کے لئے عمدہ دوا بنی

طلب اپنی نہ بڑھنے دو ضروری رزق کی حد سے　　بچا لے گی قناعت تیری تجھ کو کفر کی زد سے

دم تم میں ہے خدا ہی کی حمد و سپاس سے　　دینِ خدا جدا نہ کرو اپنے پاس سے
عہدے جو سو پچاس کو اچھے ملے تو کیا　　قایم نہ ہو گی قوم کبھی سو پچاس سے

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی اتنی دھوم ہے　　ہست میں شبہ نہیں ہے چیست نامعلوم ہے
اس تغیر پر بھی ہے ذہنوں میں قایم کوئی چیز　　اور وہ کیا ہے۔ فقط یا حیّ یا قیوم ہے

گئے وہ دن کہ ہم سب سے بڑے تھے ہم سے سب کم تھے
ہمیں اب کچھ نہیں ہیں اک زمانے میں ہمیں ہم تھے

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں کی دھوم ہے　　مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے

رُوح کا پہچاننا سب سے بڑا سائنس ہے　　اس لئے ہادیٔ دیں مطلوب جن و انس ہے

موسمِ گل میں خبر شورِ عنادل کی کہی　　خوش رہے باد صبا اس نے مرے دل کی کہی

اشعار غیر سے تو مجھے کم سند ملی
من گفتم و محاورہ شد سے مدد ملی

عشاق وقت مرگ قریں کیوں ہوں یاس سے
خوش ہیں نجات مل گئی بار حواس سے

یہ کیا تم نے کہا اب کوئی ملجا ہے نہ ماوٰی ہے
خدا کے فضل سے بھائی علی گڑھ ہے اٹاوہ ہے

ذوق لقائے حق سے دل کو تمہارے بھر دے
باطن کی ہے یہ خوبی مشتاق مرگ کر دے

ہو خیر یا رب اکبر آشفتہ حال کی
سر پر رقیب اور دوا اسپتال کی

دل میں قوت ہے کچھ نہ جان میں ہے
زندگی اب فقط زبان میں ہے

جانتا ہوں ہو رہا ہے جو نہ ہونا چاہیئے
بحث یہ ہے کب تلک اس غم میں رونا چاہیئے

اظہار مصیبت میں اکبر تجھے کیوں کد ہے
اب بہر خدا چپ ہو رونے کی بھی اک حد ہے

جنہیں نہیں فکر آخرت کی یہ بن سنور کر اُدھر گئی ہے
اسی سبب سے عروس دنیا مری نظر سے اُتر گئی ہے

اظہار اس معنی نازک کا الفاظ کی حد سے باہر ہے
ہر پھر کے سمجھ ہے گرد اُس کے جو حدّ خرد سے باہر ہے

اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے — اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحق داد — منزل سے اس کو کام ہے اس کو کلیل ہے

گل تصویر کس خوبی سے گلشن میں لگایا ہے — مگر صیاد نے بلبل کو بھی الّو بنایا ہے

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دام بلا ہے — اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے
یہ آپ کی برکت ہے کہ پیچیدگیاں ہیں — بہتر تھا کمیٹی میں اگر آپ نہ ہوتے

یہ جو ہنگامہ تزئین عیش و کامرانی ہے — تماشا غافلوں کا آج ہے کل اک کہانی ہے

مدّاحوں کو خوش ہو کے تو کیا دیکھ رہا ہے — جو حالت اصلی ہے خدا دیکھ رہا ہے

بانیِ طرز نو کے طریقوں کے مُتّبع — خلقِ نکو نہ چھوڑیں گے اولاد کیلئے
البتہ اُن بناؤں سے جن کیلئے ہے سعی — کچھ جال چھوڑ جائیں گے صیّاد کیلئے

ہم اظہار خودی سے کوئی دم ساکت نہیں ہوتے — مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے

خدا کے باب میں منطق کو پھر کیوں یہ تگاپو ہے — جہاں عشوے ہیں فطرت کے فقط ادراک عالم ہو ہے

گردوں کا نہ کر شکوہ اچھی نہیں خود غرضی — ہر حال میں پڑھ الحمد للہ کی جو مرضی
اکبر نے کہا واپس لیتا ہوں میں ہر خواہش — الحمد رہے قائم منظور ہو یہ عرضی

زندگی ہی میں بتدریج ہیں مرتے جاتے وقت کے ساتھ ہی ہم بھی ہیں گذرتے جاتے

ہم میں وہ خوبی و نکوئی نہ رہی پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل ہاں کفر کے ساتھ جنگجوئی نہ رہی

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بے کس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

شکلیں جو بن گئی ہیں یہ ذرّوں کا میل ہے جھگڑے جو ہو رہے ہیں یہ فطرت کا کھیل ہے
اس ارو شنی میں خاک ہو نشو و نمائے شیخ زیتون کا نہیں ہے یہ مٹی کا تیل ہے

موعودہ ترقی سے خوشی کیوں نہ ہو پیدا اُمید کے انجن کا بھپارا ابھی بہت ہے
خوش ہیں تلمی وعدوں پہ جو ڈوب رہے ہیں ان کے لئے تنکے کا سہارا ابھی بہت ہے

میں بہت اچھا ہوں جی ہاں قدردانی آپ کی غیر پر پھر کیوں ہے اتنی مہربانی آپ کی

اودھیاں میں نے سنائی تھیں حریفوں کو فقط شیخ کیوں کود پڑے ان کو خجالت کیا تھی
شیخ بولے کہ میاں یہ تو بتاؤ ہم سے تم کو اس دیس میں پشتو کی ضرورت کیا تھی

مری سمجھ سے ہے باہر محیط بے مرکز ترقیاں ہوئیں کس کی جو قوم ہی نہ رہی
تمام قوم اڈیٹر بنی ہے یا لیڈر سبب یہ ہے کہ کوئی اور دل لگی نہ رہی

چھائی جاتی ہے مرے دل پہ اداسی کیسی ہم نشیں ہے یہ بڑی بات ذرا سی کیسی
کیا ملے داد سخن بنگلہ نشینوں سے مجھے وہ سمجھتے ہی نہیں قدر شناسی کیسی

قرآن کو زبان سے دل میں اتاریئے علمی نمود چھوڑ عمل کو سنواریئے
چشم و زباں میں کیجئے پیدا اثر جناب بعد اس کے بندگان خدا کو پکاریئے

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا پھین ہے

حامیِ صبر و طاعت حیران و مضمحل ہیں طمّاع غافلوں کی مضبوط پارٹی ہے
رحمان کے فرشتے گو ہیں بہت مقدس شیطان ہی کی جانب لیکن مجارٹی ہے

ضرورت کچھ نہ تھی اس کی کہ آپس ہی میں ہو جائے سلام و رحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ اور گڈ ڈے
حیات مذہبی سے بھاگنا تھا کھیل گڑیوں کا کہاں کی قوم۔ ہاں کچھ بن گئے ہیں نازنیں گڈّے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے
فیضِ کالج چاہیئے دیں دار اور صاحب اثر ورنہ کیسا ہی ہو عمدہ کورس وہ بے سود ہے

مجھ سے ہے عذر غیر کو کونسل کا ووٹ ہے واللہ اس ستم کی مرے دل پہ چوٹ ہے
ترکیب صُلح کل نہ بنی دل پہ چوٹ ہے سب سے بچے تو لیجئے کونسل کا ووٹ ہے

Good day اور Good night کا

لفظ قومی پر بلا مرکز اکڑنا چاہیئے
اس کے یہ معنی ہوئے آپس میں لڑنا چاہیئے

ٹے ٹنک ٹکڑے ہوا ٹکرا کے آئس برگ سے
دب گیا سائنس بھی آخر پیام مرگ سے

وہ دلی احباب وہ مسجد کے ساتھی اب کہاں
دشمنوں کے دشمنوں سے گپ اڑایا کیجیئے

ٹھیکہ داروں نے کیا نیلام قومی روح کو
چھاؤنی میں اب فقط روٹی کمایا کیجیئے

مر رہا ہوں مجھ کو بدخواہی کی قوت ہی نہیں
خیر خواہی آپ ہی ہر دم جتایا کیجیئے

عیش کا بھی ذوق دیں داری کی شہرت کا بھی شوق
آپ میوزک ہال میں قرآن گایا کیجیئے

گناہوں سے نہ باز آئے گی اور بستی سے بھاگے گی
جہنّم سے سوا طاعون سے یہ قوم ڈرتی ہے

لندن سے دہلی آئے ہیں دس یوم کے لئے
یہ زحمتیں اٹھائیں فقط قوم کے لئے

دیکھو حضور جارج ہیں کیسے خدا پرست
گرجا میں سر جھکا ہے دسمبر ہو یا اگست

رکھتا نہیں نماز سے تو اپنے دل کو گرم
اے مدّعیِ دینِ خدا شرم شرم شرم

بابو گرہ بجو یٹ ہیں کالی کے ساتھ ہیں
اک آپ ہیں کہ ہوٹلوں والی کے ساتھ ہیں

بڑھتا رہا جو طاعت و مسجد سے یوں ہی بیر
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزو غیر

کہتے ہو تم جو وی[We] تو نہیں آتی ہے ہنسی
یعنی زبانِ شوق غلط لفظ میں پھنسی

وی[We] کا پتا کہاں ہے وہ کتنے ہیں کون ہیں
مرکز سے ہیں جدا نہ سوا ہیں نہ بون ہیں

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا
لیکن ادھر سے خطِّ غلامی بھی لکھ گیا

موقع کا ہے خیال نہ اب کانشنس ہے
ارشاد ہو غلط بھی تو اس کا ڈفنس ہے

ـہ CONSCIENCE

ارشاد لاجواب تو قرآن ہی کا ہے
قانون بے مثال تو رحمان ہی کا ہے

وقعت تمہاری شاہ کی منزل میں کچھ نہیں
کاغذ پہ اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

نقلی کمیٹیوں میں نہ دل ہے نہ دین ہے
یہ پانیئر پری کی فقط اک مشین ہے

اِک دل لگی ہے کانگرس ہو کہ لیگ ہو
ذاتی ہے اک نمود جو کوئی علیگ ہو

طاعت سے نیکیاں ہیں تو نیکی سے عزتیں
شبہے کی کوئی بات نہیں اس اصول میں

وقعت مگر محال ہے مسجد کو چھوڑ کر
ممکن نہیں کہ پائیے پھل جڑ کو توڑ کر

اک برگ گل کہے گا کہ ہم گل کے جزو ہیں
تم خود کو کیا کہو گے کہ ہم کل کے جزو ہیں

لاٹھی بھلی، ملی ہو اگر اس کی رگ سے رگ
بے کار توپ جس کے ہوں پُرزے الگ الگ

پھل پھول پتیوں پہ ہے تیری نظر نثار
جڑ پر نظر نہیں ہے کہ جس کی ہے سب بہار

گھر چھوڑ چھاڑ کر جو بغل چاپ بن گئے
کانٹوں میں اب پھنسو کہ مٹن چاپ بن گئے

مانوں گا میں یہ بات کہ مجبوریاں بھی ہیں
پر بالارادہ دین سے کچھ دوریاں بھی ہیں

کُلفت اسی کی مجھ کو ہے ہر آن ہر نفس
لاکھوں کی سدِّ راہ ہے دس بیس کی ہوس

گو اپنے ساتھ آپ کا عزّانہ لے گیا
اکبرؔ مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

عاصی ہوں میں فقط یہ تقاضائے میوزؔ ہے
یاروں سے التجا ہے پلیزؔ اکسکیوز ہے

Please Excuse ۵۲ MUSE ۵۱

ضمیمہ متفرقات

اُسے اکبرؔ ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا
کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

رنگ ہی کچھ اور اب تو روز و شب کا ہو گیا
جس طرف دیکھو دگرگوں حال سب کا ہو گیا
اس تغیر سے مگر اس کو نہیں پہونچا ضرر
انقلاب آیا بھی اکبرؔ پر تو رب کا ہو گیا

بہت دشوار ہے مسلم کو قومی پیشوا بننا
مصیبت جھیلنا اور ہادیٔ راہِ خدا بننا
مشینوں سے لپٹ کر اس قدر البتہ ممکن ہے
بہ باطن خود گھسٹنا اور بہ ظاہر رہنما بننا

جب ایسی قوم ہے تو پیشوا بھی اس کے ایسے ہیں
مثل سچ ہے کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں

جو حکم واعتصموا ہم کو ہے بحبل اللہ
بتائیے کہ کہاں ہے وہ حبل عالم میں
ادب میں دین کے اور مسجدوں کی صف میں ہیچ
کہ لیگ میں ہے وہ اور پانیر کے کالم میں

اسباب طرب یہاں وہاں سے لائیں
ہر طرح کا فخر پھر دکاں سے لائیں
قایم نہ رہے ادب تو کیا اس کا علاج
انگریز کا رعب ہم کہاں سے لائیں

بگڑ جائے گی میری اس بت کی اک دن
اِلٰی اَصْلِہٖ یَرْجِعُ کُلُّ شَیْئٍ

بدن میں روح آجاتی ہے جب لچے گوری رنگت کے
تو بے انگلش پڑھے روزی بھی مل سکتی ہے نیٹو کو

بلینک ورس یعنی بلاقافیہ

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ
میں نے تو کر دیا ترا رتبہ بلند تر
از صحنِ خانہ تا بلبِ بام اذانِ من
واز بام خانہ تا بہ ثریا اذانِ تو
خود فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لئے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل
اظہار ناخوشی پہ وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ
تیرا ہی مشغلہ ہے بہت صاف و بےضرر
آں اشتر ضعیف و لکدزن اذان من
واں گربہ مصاحبِ بابا اذانِ تو

ضمیمہ غزل

عبث بالکل ہے. حال دل کسی سے آج کل کہنا
بہت جوشِ طبیعت ہو تو جائز ہے غزل کہنا
فقط تعمیر کالج پر ہیں پھولوں یہ نہیں ممکن
مبارک آپ ہی لوگوں کو ہو پتّی کو پھل کہنا

طامع کو گدا پایا قانع کو غنی دیکھا
اوروں کی نہیں کہتے ہم نے تو یہی دیکھا
عقدے بھی کھلے تجھ سے منظر بھی نظر آئے
آنکھیں بھی کبھی کھولیں دل کو بھی کبھی دیکھا

ساز قومی پر جو ظاہر اُن کا ایما ہو گیا
جو مخالف تھا وہ اپنی سُر میں دھیما ہو گیا
پیش تو میں نے بھی دل کو کر دیا بہر کباب
تھا عدو چالاک تر بالکل ہی قیما ہو گیا
ہے تلوّن میں مرا آئینہ رو ہم رنگ چرخ
مہر طلعت دن کو شب کو ماہ سیما ہو گیا

عشق قومی میں بھی خطرہ ہے ہلاکت کا مجھے
لیڈروں کے مشورے سے جان ہمیا ہو گیا

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغانِ خوش الحال ہو گئے چپ آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا

کیوں کبر و غرور اس دور پہ ہے کیوں دست فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا، یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا

بدلی وہ ہوا گذرا وہ سماں وہ راہ نہیں وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

کیا دین کو قوت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں
کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں
اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قایم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا
اس حور لقا کو گھر لائے ہو تم کو مبارک اے اکبرؔ
لیکن یہ قیامت کی تم نے گھر سے جو نکلنا چھوڑ دیا

جواب شیخ میں یہ تو کبھی نہیں کہا جاتا — کہ وعظ ٹھیک ہے لیکن نہیں رہا جاتا
طمع نے دین کو کھویا جو ہوتے ہم قانع — کبھی نہ ہاتھ سے یہ دُرِّ بے بہا جاتا
امید وصل جو ہوتی نہ جاں فزا اکبرؔ — بھلا یہ صدمۂ فرقت کبھی سہا جاتا
میں پوچھوں کیوں مرے مرنے پہ لوگ کہتے ہیں کیا
یہ کیا یقین کہ ہے کچھ نہ کچھ کہا جاتا

ترا دل تو ہمیشہ امر خاطر خواہ چاہے گا — مگر ہوگا وہی اکبرؔ کہ جو اللہ چاہے گا
غزل سننی ہو اکبرؔ کی تو اس کو عذر ہی کیا ہے — مگر ہر شعر پر وہ انجمن میں واہ چاہے گا

کیسے وعدے تھے یہ اس دن کے سر راہ جناب — آپ سے پھر نہ ملاقات ہوئی واہ جناب
میرے اشعار پہ کہتے ہیں بہت واہ جناب — نہیں کرتے مگر افزائش تنخواہ جناب
ابھی سو تک نہیں پہنچی مری تنخواہ جناب — آپ مجھ کو نہ کہا کیجئے للہ جناب
ووٹ بازی کے سوا رکھا ہی کیا ہے اس میں — ممبری کے لئے کرتے ہیں عبث آہ جناب
بنتے جاتے ہیں غبارہ وہ نئی روشنی کے
ہو ہی جائیں گے ثریا حشم و ماہ جناب

سامنا اک نگہ ناز کا ہے جان کی خیر
مہرباں اک بت عیار ہے ایمان کی خیر

یہ تو زینت ہے کہ پہنے ہیں جڑاؤ بالے
یہ قیامت ہے کہ اللہ مرے کان کی خیر

گوشۂ دامن لیلیٰ بھی ہے تر اشکوں سے
ہم یہی کہتے تھے مجنوں کے گریبان کی خیر

ٹھن گئی آج یہی دل میں کہ پہونچوں اُن تک
یا مری خیر نہیں یا نہیں دربان کی خیر

ناز سے دامن اٹھاتی تھی جو اپنا لیلیٰ
زیر لب کہتی تھی مجنوں کے گریبان کی خیر

آپ کے ناوک غمزہ کی توجہ ہو جدھر
مو[illegible] دل کی منائے جو کوئی جان کی خیر

اب سبحہ و زنار اٹھا جاتا ہے
خیر ہندو کی نہ اب ہے نہ مسلمان کی خیر

تُرک شیراز سے خوشتر ہیں بتانِ مغرب
ظاہرا اب نظر آتی نہیں ایران کی خیر

دل لگی دین کی باتوں میں عیاذاً باللہ
شیخ لاحول پڑھیں تم کہو شیطان کی خیر

اس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کئے جان کی خیر

پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہو ذوقِ طاعت
قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

اس مس برق کلیسا کا ہے لکچر اکبرؔ
آج تو علم بھی مانگے گا مسلمان کی خیر

مزا آتا ہے گردوں کو مجھے بے چین رکھنے میں
مصائب جان دیتے ہیں مرے حس کی ذکاوت پر

جمالِ لم یزل کی معرفت کیونکر میسر ہو
کہ حس غالب ہے فانی انقلابوں کا طبیعت پر

بہ غیرت دیکھئے ضبط فغاں ہے اس لئے مجھ کو
کہیں نازاں نہ ہو تکلیف میری اپنی شدت پر

کس طرح پردے میں رہے اے شیخ عورت اک طرف
سارے خیالات اک طرف ملکی ضرورت اک طرف

مشرق کے واعظ اک طرف مغرب کی زینت اک طرف
عقلی دلیلیں اک طرف اور دل کی رغبت اک طرف

اسپنسر و مل کے ورق ہیں کس قیامت کے سبق
کل توپ خانہ اک طرف بابو کی جرأت اک طرف

اکبرؔ در بت خانہ پر ایسا جما ٹلتا نہیں
ساری خدائی اک طرف اس بت کی صورت اک طرف

ذکرِ خدا یا دا جل کافی ہیں اس کے واسطے
میدانِ آخر اک طرف اکبرؔ کی ہمت اک طرف

ہمیں گھیرے ہوئے ہیں ہر طرف اصلاح کی موجیں
مگر یہ حس نہیں ہے ڈوبتے ہیں یا ابھرتے ہیں

مرا یہ شعر اکبرؔ ایک دفتر ہے معانی کا
کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو سب کچھ کہہ گزرتے ہیں

معنی کا حس نہیں تو ترے دل میں کچھ نہیں
لیلیٰ اگر نہیں ہے تو محمل میں کچھ نہیں

کارِ جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں

اے آفتاب خضرِ رہِ معرفت ہے تو
اتنے ستارے اور تری محفل میں کچھ نہیں

لیتے ہیں لوگ اپنی دلی بات کے مزے
میرا مزا یہ ہے کہ مرے دل میں کچھ نہیں

اُن کی سُنو خدا نے کہا جن سے صاف صاف
اوہام کے فسانۂ باطل میں کچھ نہیں

افسانہ حسنِ گُل کا بڑی چیز ہے حضور
کہتے ہیں آپ شورِ عنادل میں کچھ نہیں

اسپیچ مذہبی میں بھی یکتا ہیں شیخ کمپ
لیکن یہ سب زبان پہ ہے دل میں کچھ نہیں

حلوا کھلایا شیخ نے اور وعظ بھی کہا
حلوا تو پیٹ میں ہے مگر دل میں کچھ نہیں

دل کش بہت ہے افعیِ گیسوئے اختلاف
کونسل سے کیوں کہوں کہ ترے بل میں کچھ نہیں

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

جس طرف اُٹھ گئی ہیں آہیں ہیں
چشمِ بد دور کیا نگاہیں ہیں

ذرہ ذرہ ہے خضرِ شوق تو ہو
چلنے والے کو لاکھ راہیں ہیں

لطف چاہو اک بت نوخیز کو راضی کرو
نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو

لیڈری چاہو تو لفظ قوم ہے مہمل نواز
گپ نویسوں کو اور اہل میز کو راضی کرو

طاعت و امن و سکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق
صبر پر طبع ہوس انگیز کو راضی کرو

زق زق و بق بق ہیں دنیا کے نہ ہو اکبر شریک
چپ ہی رہنے پر زبان تیز کو راضی کرو

اتنی رغبت دل کی جب مے کی طرف ہے پی نہ لو
مدرسہ مانع نہیں مسجد کا نوٹس ہی نہ لو

دم نکل جانے کا اندیشہ تو ہے مجھ کو مگر
نزع میں تم ہو تو میں کیونکر کہوں ہچکی نہ لو

بوسہ و سنبوسہ ارزاں بک رہے ہیں دیر میں
ہے کوئی جس سے کہوں یہ بھی نہ لو وہ بھی نہ لو

دل ترا ہو کہ نہ ہو ہوش ربا راز کے ساتھ
صوت سرمد تو ازل سے ہے اسی ساز کے ساتھ

کیا وہ خواہش کہ جسے دل بھی سمجھتا ہو حقیر
آرزو وہ ہے جو سینے میں رہے ناز کے ساتھ

گردش چرخ بدل دیتی ہے دنیا کے طریق
ہو ہی جاتے ہیں سب اس شعبدہ پرداز کے ساتھ

ہاں عطا کی ہے جنہیں چشم بصیرت حق نے
ان کے کان اب بھی ہیں قرآن کی آواز کے ساتھ

اس گلستاں میں نہیں کوئی ہوا خواہ مرا
سب کی سازش ہے اسی نرگس غماز کے ساتھ

پر شکستہ ہوں قفس میں نہ رہا ذوق چمن
ولولے دل کے گئے قوت پرواز کے ساتھ

دل رنگیں کے ابھرنے میں تصنع کیا
فصل گل آتی ہے سامان خدا ساز کے ساتھ

سعی پر اپنی بہت فخر نہ کر اے اکبر
طے منزل بھی ہے مشروط تگ و تاز کے ساتھ

نیچری سے کوئی الحاد کی پوچھے ترکیب
دین چھوڑا ہے تو کس ٹھاٹھ کس اعزاز کے ساتھ

پارٹی بندی میں ہوتا ہے یہی اے اکبر
کیا تعجب ہے نظر آئیں جو گدھ باز کے ساتھ

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

نہ رکھے گا خدا بیگانہ تجھ کو نورِ باطن سے
مگر لازم ہے پیدا کر دلِ حق آشنا پہلے

تری تعلیم جو کچھ ہو ہمارا تو سبق یہ ہے
یہ سب فانی خدا باقی خودی پیچھے خدا پہلے

غیر کی حسرت نکلنے دیجیے
خیر میرے دل کو جلنے دیجیے

پارک میں کیا جاؤں ہو وقتِ نماز
بابو صاحب کو ٹہلنے دیجیے

طفلِ دل کو الفتِ زلفِ بتاں اک کھیل ہے
خیر ہو ایماں کی یارب کافروں سے میل ہے

مغربی چکر میں تفریحیں بھی ہیں ایذا کے ساتھ
امتیاز اس کا ہے مشکل پارک ہے یا جیل ہے

برکتیں ساکت۔ سعادت دم بخود۔ مذہب خموش
دل دعا سے بے خبر تدبیر ہی سے میل ہے

کہتے ہیں راہِ ترقی میں ہمارے نوجواں
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

وضع بدلی۔ گھر کو چھوڑا۔ کاغذوں میں چھپ گئے
چند روزہ کھیل تھا آخر کو سب مر کھپ گئے

مٹ گئے نقش و نگارِ دیرِ فانی کے مرید
نام انہیں کا رہ گیا روشن جو ہر کو جپ گئے

دل کا ٹکڑا تو رہا باقی پئے راہِ خدا
ریل میں کیا غم جو اکبر کھیت میرے نپ گئے

دلوں کو لذتِ معنی کا اب حس ہی نہیں باقی
جسے دیکھو تخیلِ صورتِ دنیائے فانی ہے

حدیثِ آرزوئے قربِ باری پر نظر کس کی
خدا اک لفظ ہے اور شوقِ موسیٰ اک کہانی ہے

ہوائے وادیِ ایمن کہاں اب گلشنِ دل میں
نہ وہ ارنی کا خرمن ہے نہ شوقِ لن ترانی ہے

معاذ اللہ غفلت باریاں یہہ ابر مغرب کی — کوئی آلودۂ آز کوئی صرفِ جوانی ہے
مٹا دے اپنی ہستی اشتیاقِ حسن باقی ہیں — جو اے اکبر تجھے ذوقِ حیات جاودانی ہے

آفتِ جاں ہے تجلّی آتشِ رخسار کی — خیر ہو یارب نگاہِ شوق سہل انکار کی
مست کردیتی ہے مجھ کو فصل گل میں بوئے گل — وجد میں لاتی ہے حالت سبزۂ و اشجار کی
بھینی بھینی ہائے وہ نارنج کے پھولوں کی بو — جس پہ سو جانیں فدا ہوں طبلۂ عطار کی
قطرہ ہائے شبنم پاکیزہ پتوں پر نہیں — سبزہ پریوں پر چمک ہے موتیوں کے ہار کی
ہر شگوفے پر تڑپ جاتی ہے طبع حسن دوست — پتی پتی پر نگاہیں ڈالتا ہوں پیار کی
ناچتا ہوں صحنِ گلشن میں ہوا کے ساتھ ساتھ — ہم نوائی چاہتا ہوں بلبل گلزار کی
مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال — عارضِ گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی
سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو — حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

نکہت گل ہائے شاخِ گل میں یہ مستی کہاں
اور ہی خوشبو ہے کچھ تیرے گلے کے ہار کی

متعلق امور خاص

ڈاکٹر بنارڈ ہیں اپنے ہنر میں لاجواب[۱] — ہاتھ اُن کا برق ہے نشتر شعاعِ ماہتاب
ہفت سالہ تھا مرض دم بھر میں زائل ہو گیا — آنکھ روشن ہو گئی جاتا رہا سارا حجاب

۱؎ حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے یہ نظم حسب فرمائش جناب ڈاکٹر صاحب موصوف لکھی اسکا ترجمہ انگریزی ہوا اور ڈاکٹر صاحب کے یہاں فریم میں لگا ہوا ہے۔ نواب سید محمد خاں صاحب انسپکٹر جنرل رجسٹری بنگال کے ذریعہ سے مراسلت ہوئی ۱۲ (۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو آپریشن ہوا تھا)

پانچ ہی دن میں نہ پٹی تھی نہ بستر کی وہ قید　　محسنِ کلکتہ تھا اور میری نگاہِ انتخاب
ڈاکٹر مینارڈ کو اللہ رکھے شاد کام
اور رہے خلق خدا ان کے ہنر سے فیضیاب

مدرسہ الٰہیات خوب ہے کان پور میں　　قوم کی سچ جو پوچھئے خدمتِ واقعی یہ ہے
حمدِ خدا کے غلغلے ہوں گے بلند اب یہاں　　اس میں ذرا بھی شک نہیں دین کی بہتری یہ ہے
حضرتِ رعد کا یہاں جوش و خروش دیکھ کر　　سب نے کہا یسبح الرعد بحمدہ یہ ہے

عنبر فشاں ہوا ہے معطر مکان ہے[^]　　کیوڑے کا یہ عرق نہیں کیوڑے کی جان ہے
کیوڑہ بنے گا پندرہ قطروں سے اک گلاس　　اس کی دہی ہے جانچ یہی امتحان ہے

صنعتِ صانع کو دیکھ اس روغنِ بادام میں　　یاسمن کی روح پھونکی ہے تنِ بادام میں

تاریخ وفات والدہ سید عشرت حسین - ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء ماہ عید ۱۳۲۹ھ

مرا راحت رساں و محرم اسرار ما بودی
ہمیں تاریخ فوتت گفتہ ام ـــ غمخوار ما بودی
۱۰　۱۹　ء

[^] یہ اشعار حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے حسب فرمائش شیخ محمد حسین صاحب سکندرپوری ضلع بلیا مصالحہ دار نظامتہ العالیہ مرشد آباد صدر دوکان کھنگراپٹی کلکتہ نمبر ۳۔ موجد بادامی روغن و شاہی کیوڑہ وغیرہ کے کیوڑے کی تعریف میں موزوں فرمایا ۱۲ (محمد عبد الرحمٰن قیس)

مادّہ تاریخ ولادت سیّد ہاشم

تیغ فاتح ظہور بدر

۹۹ ۱۸ء ۱۷ ۱۳ھ

مادّہ تاریخ ولادت سیّد عقیل سلمہٗ ابن سیّد عشرت حسین سلمہٗ

محمد عقیل ابن عشرت

۲۵ ۱۳ ھ

تاریخ وفات جناب سیّد تفضل حسین صاحب پدر حضرت اکبرؔ

چو شد واصل ذاتِ رب ذات او بجو سال تاریخش از - ذات رب

۱۳۰۳ ھ

تاریخ وفات جناب سیّد ہادی علی صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ الٰہ آباد

ان کے مرنے کا نہ کیوں ہو سب کو غم
سچ تو یہ ہے لاکھوں ہی میں ایک تھے
سنئے الہامی یہ تاریخ وفات
میر ہادی صُلح جو تھے نیک تھے

۱۷ ۱۳ھ

ایضاً۔ متفرق مصرعے

پاکیزہ سرشت صاحب رائے میر ہادی از جہاں مردانہ رفت
شد اہل بہشت میر ہادی

قطعات و مثنویات

مسلّم ہے جب سب کو الّا و قلیلا تو ہر علم ہے ذہن انساں میں ڈھیلا
مگر مست کر جاتا ہے ہو کے پیدا اسی فیضِ فطرت سے کوئی رسیلا
مذاہب کی مستی حریفوں کی شوخی رہے گی رچی یوں ہی دنیا کی لیلا

الا یا ایہا الساقی بدہ ووٹے بمجفلہا کہ سیٹ آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
رفیقاں سست و طاقت سلب و دولت صرف و لالچ رس چرا اُفتی پئے نامے دریں گرداب مشکلہا
رہ پیچیدہ سرِّ حکومت بر تو نکشاید مگر چوں مارکاہل حلقہ زن باشی دریں بلہا
عبث اے بے ہنر قربِ مشینِ مغربی خواہی کہ جز ووٹے ترا حاصل نمی گردد ازیں ملہا
حکومت پارلیمنٹی نباشد اندریں کشور ولے نیٹو بجنگ آید بہم از بہر کونسلہا
ہوس در سینہ می جوشد کہ جاں دہ اندریں منزل خرد در گوش می گوید کہ بر بندید محملہا
زِحرصِ ممبری نقصاں پذیر و قوّت ملّت بجائے قوم۔ آں نر دخل یابد بر دردلہا
چو ذوقِ خدمتِ ملک است حاجت نیست با کونسل بکن تحریر در اخبار و نطقے دہ بمحفلہا
اگر جوشِ مضامیں ہست در طبعِ بلیغِ تو بگو افسانہائے دردِ دل در شکل نادلہا
نمی گویم کہ موجِ شوقِ عزت ہست بے معنی ہمی گویم نگہ دارید کشتی ہا و ساحلہا

برآر از دل یکے دستِ دعا در حضرتِ باری — کہ تا بخشد دولت را امتیاز حق و باطل ہا
اگر حاکم کند ایما طلب کن ووٹ و خوش بنشیں — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزل ہا
بوئے شہرتے کاخر گزٹ زاں طرہ بکشاید — حریفاں مضطرب گردند و شور افتد بمحفلہا

چو در کونسل رسی با صد ادب مشغول خدمت شو
مَتیٰ مَا تَلْقَ مَنْ تَھْویٰ دَعِ الدُّنْیَا وَ اَھْمِلْھَا

بے سبب زیں لائبریری ہا مرا اکراہ نیست — ہر کتابے را کہ بکشا دیم بسم اللہ نیست
کورس را ہر سال تغیر است و باہم اختلاف — اتحادِ معنوی را سوئے دل ہا راہ نیست
از مذاقِ مشرقی ہر طبع را بے گانگی — چیزے از مغرب بدل ہا ہست خاطر خواہ نیست
صف نشیناں چشم یاری می کنند از ہم دریغ — کودکے کاں را دریں محفل جنونِ جاہ نیست
گشتہ ام مایوس ازیں انداز آغاز شما — لا الٰہیت نمایاں ہست و الا اللہ نیست

صورتِ مذہب کہ می سازند تحسیں می کنیم
معنیٔ دیں را کہ می سازند خلق آگاہ نیست

برائے رسالہ زمانہ

جو اڈورڈ[1] نے چھوڑا شاہی کا چارج — ہوئے جلوہ آرا شہنشاہ جارج
خوشی ان کی ہے اور ان کا الم — دو دل ہو رہی ہے زبانِ قلم
قصیدہ کہے یا کہ نوحہ لکھے — کدھر رُخ کرے کیا کہے کیا لکھے

---

[1] حضور شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم مرحوم ۱۲

لحد بھی ہے اور مسندِ جاہ بھی　　مبارک سلامت بھی ہے آہ بھی
بڑے شور ایوانِ دولت میں ہیں　　وہ تربت میں ہیں اور یہ حیرت میں ہیں
شہنشاہ مرحوم تھے صلح جو　　نئے امپرر ہیں بہت نیک خو
وفا و ادب سے ہے یاں رابطہ　　ہماری دعا ہے یہہ باضابطہ
خدا ان سے خوش ہو انہیں دے فروغ　　بڑھیں نیک اور بد رہیں بے فروغ
رہے تخت برطانیہ برقرار　　رہے ہند یونہیں اطاعت شعار
وہ سنبھلیں جو رہتے ہیں غفلت میں مست　　یہاں تو ہے پہلے ہی سے دل شکست
بگڑتا ہے دنیا میں جو گھر بنا　　مسلسل ہے رفتار موجِ فنا
خوشی کی بھی لیکن ہے پیہم نمود　　بلا ہے تو نعمت کا بھی ہے ورود
ہمین است آئین چرخِ کہن　　چہ خوش گفت سعدی شیریں سخن

یکے را چو پایاں رسد دور عہد
جواں دولتے سر بر آرد زمہد

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید　　ہو اگر ضبطِ نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبط نظر آساں نہیں　　منھ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آسان نہیں
تم میں وہ ضبط نظر اُن میں وہ خودداری کہاں　　رعب قومی مثل فاتح ملک پر طاری کہاں
اب رہی تعلیم۔ کون اس امر کا مفتوں نہیں　　بیبیوں پر مغربی سانچا مگر موزوں نہیں

یہ تو ظاہر ہے حریف شوخ کیوں رکنے لگا
شوق سے لیکن خرابی پر میں کیوں جھکنے لگا

چل بسے وہ جنہیں مقدور تھا خودداری کا　　نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی اُمید

ولولے لے کے نکلنے لگے کالج کے جواں — شرمِ مشرق کے عدو شیوۂ مغرب کے شہید
نئے اندازِ عبادت ہیں نئی صورتِ عیش — رمضان ساعتِ کرکٹ ہو تھیٹر میں ہے عید
نئی تہذیب نئی راہ نیا رنگِ جہاں — دورِ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید
بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب — زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھے جنابِ خورشید
دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب — کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید
شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید
نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند — لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریقِ تائید
جب حکومت نہیں باقی تو یہ غمزے کیسے — کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید
تم نے شلوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ — پھر مرے واسطے محرم ہے کیوں حبل[۱] ورید
خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو — ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید
لال جب خود ہی کنیری[۲] کا ہوا ہے بندہ — تو یہ مینا رہے کیوں گوشۂ عزلت میں شہید
دولھا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید
درِ نظارہ مقفل رہے کب تک ہم پر — کیوں نہ غنچوں کے لئے بادِ صبا کی ہو کلید
اکبر افسردہ شد از گرمیٔ ایں طرزِ سخن — شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید
کھل گئے ورنہ رہا شاہدِ مشرق میں حجاب — غل مچا ہترے کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

دربار سنہ ۱۹۱۱ء

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار — حکم حاکم سے ہوا تھا اجتماعِ انتشار

---

[۱] رگ گردن۔ [۲] ایک خوش الحان خوبصورت پردیسی چڑیا ۱۲

آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین — پھول اور سبزہ چمک اور روشنی ریل اور تار
کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین — موٹر اور ایروپلین اور جمگھٹے اور اقتدار
مشرقی پتلوں میں تھی خدمت گذاری کی امنگ — مغربی شکلوں سے شانِ خود پسندی آشکار
شوکت و اقبال کے مرکز حضور امپرر — زینت و دولت کی دیوی امپرس عالی تبار
بحرِ ہستی لے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں — ٹمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہم کنار
انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے — تھے پئے اہلِ بصیرت باغ عبرت میں بہار
ذرے ویرانوں سے اُٹھے تھے تماشا دیکھنے — چشم حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار
مصلحت آمیز ہر طرز و طریق انتظام — حکمت آگیں ہر ادائے حاکمانِ نامدار
جامے سے باہر نگاہ ناز فتاحانِ ہند — حذق قانونی کے اندر آنر بلوں کی قطار
خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا — فکرِ ذاتی میں خیال قوم غائب فی المزار
دعوتیں۔ انعام۔ اسپیچیں۔ قواعد۔ فوج کیمپ — عزتیں۔ خوشیاں، اُمیدیں۔ احتیاطیں اعتبار

پیش رو شاہی تھی پھر ہز ہائی نس پھر اہلِ جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس — کارِ دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اداس[1]
جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر — آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ[2] — میری چشم طبع کو عارض ہے غربی کیٹریکٹ[3]

۱؎ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو حضرت مصنف کی آنکھ پر بمقام کلکتہ آپریشن ہوا۔ معاً ایک مضمون ان کے دل میں پیدا ہوا اور اُسی وقت یہ اشعار موزوں کر کے لکھوا دیئے۔
یہ نظم پرچہ نظام المشائخ دہلی میں بہت مدح کے ساتھ چھپی۔ ۲؎ واقعہ ۳؎ موتیا بند

میرے حق میں کوئی فکرِ سالویشن[۱] کیجئے — ہو سکے تو مذہبی اک آپریشن کیجئے
کی توجہ حضرتِ مرشد نے میرے حال پر — اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہ تیز کا — کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا

پھر دلِ پر مرے تقویٰ کی پٹی باندھ دی
آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

دربارِ دہلی اک طرف لوکل مجالس اک طرف — مرزا کا چم خم اک طرف بدھو کی گھس گھس اک طرف
راجا میں ہندی فربہی موٹر کی طینت آتشی — مرطوب دربار اک طرف اور حار و یابس اک طرف
ہرچند دل کے نرم ہیں تاہم بہت سرگرم ہیں — سردی کا احساس اک طرف اعزاز کا حس اک طرف
یہ رنگ و بو یہ زینتیں یہ پُر تکلّف صنعتیں — ہر گوشۂ کمپ اک طرف اور سارا پیرس اک طرف
آنکھوں کو تم کھولو ذرا دیکھو تو یہ پولو ذرا — تیزی فرس کی اک طرف اور نازِ فارس اک طرف
جوبن پہ باغ دہر ہے گلشن ہر اک سو شہر ہے — وا گوشِ گل ہے اک طرف حیرت میں نرگس اک طرف
بھولے ہیں سب کبر و منی ہے شان دہلی دیدنی — دل کش دوکانیں اک طرف بارعب آفس اک طرف
ہر کش کو فکر حفظ جاں اکبرؔ کا شور الاماں — سائنس کا زور اک طرف حُسنِ رخ مس اک طرف

جان جہاں بانی ہیں یہ عظمت میں لاثانی ہیں یہ
ہفت آسماں ہیں اک طرف اور جارج خامس اک طرف

شاہ کابل آں سراج ملّت و روشن خرد — کرد نہضت از رہِ حکمت سوئے ہندوستاں
کول کالج را شرف بخشید از اسپیچ خویش — مرحبائے گفت و دستِ فیض او شد زر فشاں
مرشدِ کالج بہ وجد آمد ز تحسینش ولے — مدحتِ ایں طائفہ بر قلب شیخ آمد گراں

---

۱ نجات

گفت شاہ از عیب اینان چشم پوشی می کند | یا فریبے خوردہ از زرین طباق میزباں
مسلک و اعمال ایشاں یک دو سالے دید نیست | کے کند کشفِ حقیقت یک دو ساعت امتحاں
ہمدریں معنی سخن می گفت باطبع ملول | چوں بدید ندش کہ در بندِ غم است ایں ناتواں
عاقلے فرمودہ قول شہ مفید ست و نکو | ہمنشیں خندیدہ و گفت ایں مطلع حافظ بخواں

دوش از مسجد سوئے مے خانہ آمد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

یہ پوچھا شیخ سے میں نے کہ کہئے کیا گذرتی ہے | یہ سُن انیس سو دس ہیں نئے مقصود و منظر ہیں
نہایت یاس و حسرت سے وہ بولے کیا کہوں تم سے | یہ دو مصرعے سنو جن میں نہاں دفتر کے دفتر ہیں

نئی تعلیم کے مردے تو زندہ ہیں تماشوں میں
پُرانی وضع کے زندے مگر مردوں سے بدتر ہیں

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں | اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی. خوش رنگ چست. نازک پیاری | پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پُھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا اُبھار | تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قایم | وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قایم
گو تابع جوشش برق پروازی ہیں | دونوں کے خطوط طیر متوازی ہیں
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے | اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں | فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم میں ایسا ناچ سیکھ آتی ہیں | پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں
اس سمت اگر خیال انساں بڑھ جائے | دامان نظر یہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

نہ مسجد میں نظر آتے نہ رہتے ہیں محلّوں میں ترقی پا کے بس مل جاتے ہیں برگد کے گلّوں میں
یہی یورش رہی آزادی و تقلید بیجا کی تو غائب قوم کی تمکین ہے دو چار ہلّوں میں

جوش قومی کا تو اظہار ہے ہر شام و پگاہ لب پر الفاظ بہت خوب ہیں ماشاء اللہ
دیکھتا کچھ نہیں لیکن رزولیوشن کے سوا بحث کچھ تم میں نہیں ہے اوولیوشن کے سوا
نہ وہ مسجد نہ جماعت نہ وہ طاعت نہ دعا نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن نہ وہ سبزہ نہ ہوا
نہ قناعت نہ توکل نہ وہ خودداری ہے جاہ و شہرت کی تمنّا میں گرفتاری ہے
کیا غرض مرکز تسبیح و دعا قائم ہو
بس یہ مطلب ہے کہ اک اپنی سبھا قائم ہو

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمّق سے تمہاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے
خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ ختّو کے کہ شیخ سدّو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے
عطا ہوئی ہے یہ اسپیکروں کو آزادی کہ حاکموں میں ہے قال تو یاں اقول بھی ہے
محلّ صلّ علیٰ ڈاک و تار کی ہے روش اگرچہ دل میں نہاں عظمت رسول بھی ہے
جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی کی جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے
طرح طرح کے بنالو لباس رنگا رنگ علاوہ روئی کے ریشم بھی اور اوول[1] بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لئے نظر نواز ہے بتّی حسین پھول بھی ہے

---

[1] Wool اون

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

شکوہ[1] جلوہ قیصر عیاں ہے — زمیں پر آج اترا آسماں ہے
کرم فرما ہوا ہے شاہ انگلینڈ — کہ جو شاہنشہِ ہندوستاں ہے
عظیم الشان ہے دربار دہلی — سراپا چشم ہر پیر و جواں ہے
چمک دکھلا رہا ہے ذرہ ذرہ — منور ہر سڑک اور ہر مکاں ہے
بپا کُل ملک میں ہے جشن شادی — جدھر دیکھو مسرت کا سماں ہے
تکلف کی نہیں باقی کوئی حد — ہر اک سو صرف زر بھر زباں ہے
نہایت فخر ملکِ ہند کو ہے — کہ اس کا شاہ اس کا میہماں ہے
ملنزی اور ڈیلو مر کا ہے وہ لطف — کہ ہر طفلِ دبستاں شادماں ہے
الہ آباد کا یہ ہائی اسکول — انہیں کے دم سے رشکِ بوستاں ہے
خدا اس عہد کو رکھے مسلسل — کہ حاصل نعمتِ امن و اماں ہے
کلکٹر کا بھی ہے دربار عالی — یہاں بھی خاطرِ ننکو میاں ہے

جن بزرگوں کی طلب سابق و دیرینہ ہے — ان کو الطاف گورنمنٹ کا گنجینہ ہے
جن بزرگوں کو نئی راہ میں ہے سعی کا شوق — قوم سے اُن کو بلا واسطہ لینے کا ہے شوق
دونوں راہوں میں ہی عزت بھی برکت بھی ہے — موقع مدح بھی ہے وجہ شکایت بھی ہے
مستند دونوں ہیں ہو چال جو اعزاز کے ساتھ — دونوں رہ سکتے ہیں آسودگی و ناز کے ساتھ
شدتِ حرص سے ہاں سوئے رکاکت جو جھکے — غیر ممکن ہے کہ دل خلق کا رُکنے سے رُکے

---

[1] حسب فرمائش سیّد ہاشم مرحوم

نہ اچھل کود کا حاصل نہ تملق کا اثر — بجز اس کے کہ گھٹو زور میں باھم لڑکر
خوب ہے وہ جو قناعت کی طرف سالک ہے — کس مپرسی ہے تو ہو اس کا خدا مالک ہے
امر طاعت ہی ہے اللہ کے پیاروں کے لئے — ماسوا اس کے جو ہے شغل ہے یاروں کے لئے
طلب رزق ضروری سے تو مجبوری ہے — اس کے آگے ہے جو کچھ اس سے مجھے دوری ہے

ہم نشیں جب مرے ایام بھلے آئیں گے
بن بلائے مرے وہ آپ چلے آئیں گے

جنگ ٹرکی اور اٹلی کے متعلق رائیں

:(کوئی کہتا ہے):

دکھائے گی نیا اب رنگ ٹرکی — نہ ہوگی مبتلائے جنگ ٹرکی
وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں — ہوئی اب ہم کنار گنگ ٹرکی
بہت خود رائے تھے سلطانِ سابق — رہا کرتی تھی ان سے تنگ ٹرکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن — ترقی اب کرے گی ینگ ٹرکی

:(بعض یہ کہتے ہیں):

بدلی وہ ہوا وہ سنبل و گل رخصت — ساقی رخصت وہ ساغر و مُل رخصت
اب دل ہیں ہیں دوستان ٹرکی شاداں — لو ہو گئے پانیر کے .عبدل رخصت

——:(لیکن بعض یہ فرماتے ہیں):——

یلدیز سد راہ مخالف کنوں نماند | اندیشہ حریف بحال زبوں نماند
آں تیغ عقل وآں نگہہ پُرفسوں نماند | سودا بہ جوش آمد وآں رنگ خس نماند

چوں رخت خود بہ بست وبروں از مقام شد
عبدالحمید گفت کہ ترکی تمام شد

آں فکر مصر وکابل وجاپان وچیں کجا | آں خوض والتفات پئے کار دیں کجا
آں پالسی وآں نگہہ دوربیں کجا | آں خاتم حمید کجا آں نگیں کجا

در دل گذاریم بجائے امید شد
گوئی خلا بماند وخلافت شہید شد

——:(بہت لوگ یہ کہتے ہیں):——

مجھ پہ ہے تقلید واجب ہند کے دربار کی | رائے میری ہے وہی جو رائے ہے سرکار کی

——:(کوئی انقلاب زمانہ کی یوں شکایت کرتا ہے):——

حالت ایں چیست کہ من پیش نظر می بینم | در پس کار بتاں فتح وظفر می بینم
در حرم سوز دل وخون جگر می بینم | چرخ را وضع وگر رنگ دگر می بینم

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ وشر می بینم

شاہ وسلطاں سے رعایا کی مروّت نہ رہی | پاس ملّت نہ رہا دین کی غیرت نہ رہی
وہ عقیدے نہ رہے اور وہ حکومت نہ رہی | دل کا مرکز نہ رہا ہاتھ کی طاقت نہ رہی

این چه شوریست که در دور قمر می بینم
همه آفاق پر از فتنه و شر می بینم

خار الحاد کو ہر گل سے یہ کاوش کیسی
ترک ایماں کی دلِ خلق میں خواہش کیسی

کفر سے دعوئ اسلام کی سازش کیسی
اے فلک کیا یہ ترا رنگ یہ گردش کیسی

این چه شوریست که در دور قمر می بینم
همه آفاق پر از فتنه و شر می بینم

اب تو رکھ دی گئی تہ کر کے ادب کی چادر
پہلے قبلہ تھے تو اب صرف ڈیر ہیں فادر

امر تعظیم کو اطفال نے سمجھا بادر[1]
ماؤں کو لینے کو ہرگز نہیں حیاتیں تادر

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
ہیچ الفت نہ پسر را بہ پدر می بینم

:(اور میں کہتا ہوں):

کیا بحث ہے ایران سے یا ترک و عرب سے
اس وقت تجھے قطع نظر چاہیئے سب سے

یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے
رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے

تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے
خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے

ہم کو سنبھالتی ہے ملت جو لا[2] بنائے
میں کو نباہتی ہے غیرت جو دل میں آئے

کیا حال قوم مجھ سے تو پوچھتا ہے ہمدم
ہم کا پتا نہیں ہے میں ہیں مگر بہت کم

---

[1] Bother دق کرنا
[2] Law قانون

کفر اس کو ہے قناعت محنت کی راہ بھولی
تقریر میں فضولی کوشش میں بے اصولی

جب پیشوا نے اپنا کعبہ جدا بنایا
اپنے مزے کو سب نے اپنا خدا بنایا

اپنی ہی یہ خطا ہے ہم نے تو خوب جانچا
لڑکے ڈھلے ہیں ویسے جیسا بنا تھا سانچا

شر جس سے پھیلتا ہے یا وش بخیر بھی ہے
اپنا ہی کیا کہ ہنستا اب ہم پہ غیر بھی ہے

جھوٹی لگاوٹوں سے ہرگز نہیں ہے سیری
حرص و طمع نے کھودی اس قوم کی دلیری

آثار کہہ رہے ہیں گوشے دلِ حزیں میں
جیتا رہا تو تو بھی مل جائے گا انہیں میں

بچنا اگر ہے تجھ کو اس دور میں تو سودہ
بے رونقی پہ کر صبر اللہ ہی کا ہو رہ

حصّہ سوم

IU

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا — مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کریگا
فلک جو برباد بھی کرے گا بلند ارادے مرے رہیں گے — جو خاک ہوں گا تو خاک سے بھی سدا بگولا اٹھا کریگا
خدا کی پاکی پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو — مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کریگا
جہانِ فانی کا حشر ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ — یہاں تو پیہم یہی تردد یہی تغیّر ہوا کرے گا
اگرچہ ہے درد و غم سے مضطر یہی ہے وردِ زبانِ اکبرؔ
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

زندگانی کا مزا دل کا سہارا نہ رہا — ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
بولنے کی ہے نہ قوت نہ اشارے کی سکت — اتنا بس بھی مرا فطرت کو گوارا نہ رہا
پوچھتا کوئی دمِ مرگِ سکندر اکبرؔ — کتنے دن کی یہ تعلّی تھی کہ دارا نہ رہا

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا — شدتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا
آپ تصنیف شرائط کی نہ تکلیف کریں — مجھ کو خود ولولۂ عرضِ تمنّا نہ رہا
اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے — عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

منتشر رہنے میں پاتے ہیں اب آرام حواس
شوقِ مجموعۂ ہوشِ خرد افزا نہ رہا
حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا
دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبر سے عبث پُوچھتے ہیں کیا نہ رہا

غم کیا جو آسمان ہے مجھ سے پھرا ہوا
میری نظر سے خود ہے زمانہ گرا ہوا
مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

شیخ کو بھی اُس بُتِ کافر نے اپنا کر لیا
دین سے کیا ہو سکا ایمان نے کیا کر لیا

دیکھ کر رنگِ فنا خونِ جگر پینا پڑا
زندگی سے سخت گھبرایا مگر جینا پڑا

خانۂ اُمید آتا ہے نظر اُجڑا ہوا
دل کو حیرت ہے کہ یا اللہ کیا تھا کیا ہوا
کیا کسی بزمِ طرب میں تم ہیں اے اکبر شریک
آنکھ بھی رُوئی ہوئی ہے دل بھی ہے تڑپا ہوا

بزمِ ہستی میں مرے پیشِ نظر کیا کچھ نہ تھا
دیکھتے ہی دیکھتے لیکن جو دیکھا کچھ نہ تھا
بے تعلق منزلِ ہستی سے گذرا دل مرا
اس کی نظروں میں سزاوارِ تمنّا کچھ نہ تھا

تنہائی اور شبِ غم ہم اور دل ہمارا
اللہ سے دُعائیں۔ اُمّید کا سہارا

دنائت آپ کی کھلتی ہے مجھ پر ملنے جُلنے سے
ادب کی جب ضرورت ہے تو بہتر ہے جُدا رہنا

اطبّا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا   خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

خدا کا نام گو اکثر زبانوں پر ہے آجاتا   مگر کام اس سے جب چلتا کہ یہ دل میں سما جاتا

نہیں ہے کام زباں کا کچھ اب دُعا کے سوا   نظر کسی پہ نہیں ہے مری خُدا کے سوا
کبھی کریں گے نہ وہ میرے دل سے ہمدردی   کوئی علاج نہیں ترکِ مدّعا کے سوا

کروں کیا غم کہ دنیا سے مِلا کیا   کسی کو کیا مِلا دنیا میں تھا کیا
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل!   نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
رہا مرنے کی تیاری میں مصروف   مرا کام اور اِس دنیا میں تھا کیا
وہی صدمہ رہا فرقت کا دل پر   بہت روئے مگر اس سے ہوا کیا
وہاں قالوبلیٰ یاں بُت پرستی   ذرا سوچو کہا کیا تھا کِیا کیا
تمہارے حکم کے تابع ہیں ہم سب   تمہیں سمجھو بُرا کیا اور بھلا کیا
الٰہی اکبرِ بیکس کی ہو خیر
یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا

عبث ہے نظمِ بلیغ فطرت جو رُخ نہیں حُسنِ مدّعا کا   حدیثِ عقبیٰ اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا

مرے دل سے امتیازِ دی و فردا اُٹھ گیا   حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

بتوں کی مدح سے کل شاعری اُردو کی مملو ہے   شکست اُردو جو پائے گی تو میں سمجھوں گا بُت ٹوٹا

اکبرؔ کے کفر کا نہ رہا قدرداں کوئی اس بُت کو شیخ جی نے مسلمان کر لیا

حق کی ہے کم محبّت، ہے صرف خود فروشی عزلت ہی ہے مناسب راضی جو دل ہو تیرا
ملنے سے یہ خرابی پیدا ہوئی بالآخر اب معترض ہے مجھ پر مشتاق تھا جو میرا

صاحبِ الفاظ کو دفتر سے بھی سیری نہیں صاحبِ معنی کو صرف اِک لفظ کافی ہو گیا

جہانِ فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہی اکبر جو ہو چکا ہے وُہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

مصیبت ہے مجھے اُس بُت سے اُلفت ہو گئی اکبرؔ کہ جس کو بُت کدے میں بھی کوئی اچھّا نہیں کہتا

متّحد احساس سے ہم کو معرّا کر دیا ٹکڑوں کے ریزے کئے ریزوں کو ذرّا کر دیا

ناموں کو ہادیوں کے بے انتہا جھنجھوڑا یاروں نے بت شکن کو بت ہی بنا کے چھوڑا

کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملے گی بعید شانِ کریم سے ہی کسی کو کچھ دے کے چھین لینا

ترکِ دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا
دامِ تقریرِ بتاں سے حذر اے اہلِ نظر بخدا میں نے تو ہر لفظ کو پھندا پایا
جس کے ہر پیچ میں سو دامِ بلا ہیں اکبرؔ
ایک عالم کو اسی زُلف کا شیدا پایا

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب　　پلیٹوں کی صدا سُنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں　　حجاب اُس کو نہیں آتا۔ انہیں غصّہ نہیں آتا

جو کچھ تم کہہ رہے ہو جس نے وہ کہنا نہیں سیکھا　　یہ سچ کہتے ہو اس نے مطمئن رہنا نہیں سیکھا

ہستیٔ بے ثبات نے جانِ بشر کو کیا دیا　　نفس سے حرص آ گئی ہوش نے میں بنا دیا
نفس نے کہہ دیا غلط عقل نے بھی ملائی ہاں　　منزلِ ذوقِ رُوح کا دل نے اگر پتا دیا
چشمِ خرد سے عار تھی حسنِ جنوں پسند کو
عقل نے آنکھ بند کی اس نے حجاب اُٹھا دیا

حالِ دل میں سُنا نہیں سکتا　　لفظ معنی کو پا نہیں سکتا
عشق نازک مزاج ہے بے حد　　عقل کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتا
ہوشِ عارف کی ہے یہی پہچان　　کہ خودی میں سما نہیں سکتا
پونچھ سکتا ہے ہم نشیں آنسو　　داغِ دل کو مٹا نہیں سکتا
مجھ کو حیرت ہے اس کی قدرت پر
علم اس کو گھٹا نہیں سکتا

آتشیں روئے بتاں دیکھ کے واعظ نے کہا　　کارِ اکبر ہی ہے دوزخ سے لگاوٹ کرنا

ہے دو روزہ قیام سرائے فنا نہ بہت کی خوشی ہے نہ کم کا گِلا
یہ کہاں کا فسانۂ سود و زیاں، جو گیا وہ گیا، جو مِلا وُہ مِلا

نہ بہار جمی نہ خزاں ہی رہی کسی اہلِ نظر نے یہ خوب کہی
یہ کرشمۂ شانِ ظہور ہیں سب، کبھی خاک اُڑی کبھی پھول کھِلا

نہیں رکھتا میں خواہشِ عیش وطرب، یہی ساقیِ دہر سے بس ہے طلب
مجھے طاعتِ حق کا چکھا دے مزا نہ کباب کھِلا نہ شراب پلا

ہے فضول یہ قصۂ زید و بکر ہر اک اپنے عمل کا چکھے گا ثمر
کہو ذہن سے فرصتِ عمر ہے کم جو دِلا تو خدا ہی کی یاد دِلا

رازِ ہستی کو کوئی آج تلک پا نہ سکا — پا گیا کچھ تو کسی غیر کو سمجھا نہ سکا
نا شگفتہ ہی رہا غنچۂ خاطر میرا — ساخت ایسی تھی کہ دنیا کی ہوا کھا نہ سکا
حُسنِ گل سے ہی سوا ناز کا موقع کس کو — وہ بھی دو دن سے زیادہ کبھی اِترا نہ سکا
بزمِ جاناں کے تصوّر سے رہا میں قاصر — دور کی بات تھی اندیشہ وہاں جا نہ سکا

کیا حرج ہے پڑھوں جو یہ مصرعہ میں برملا — دینِ خدا حسینؑ ہے دُنیا ہے کربلا

فلک کو میں نے مجھے دی فلک نے داد اکبرؔ — اُسے ستم تو مجھے صبر آزمانا تھا

اس ستمگر نے بگڑنے ہی کو جب بننا کہا — رفعِ شر کے واسطے ہم نے بھی آمنّا کہا

میں کیا کہوں اُسے اور کیا کروں گلا اُس کا — مجھے ہنوز پتا ہی نہیں ملا اُس کا
اگرچہ دل کو ہے سودا اُسے بُرا نہ کہو — کسی کی زلف سے ملتا ہے سلسلہ اُس کا

انہیں حسرت ہے اکبرؔ کاش میرا ہم نوا ہوتا — میں کہتا ہوں ذرا سوچو جو ہوتا بھی تو کیا ہوتا

غریب اکبرؔ نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا مُوا کیا

رہا تو مُردوں سے حال بدتر جیا بھی اکبرؔ تو وہ جیا کیا — نئے طریقوں کے حامیوں نے کہا بہت کچھ مگر کیا کیا
یہ چاہئے ہرگز نہیں ہی کافی نہیں ہے ملینٹ کا بندہ قائل — شراب بھی حلق سے نہ اُتری تو شیخ صاحب نے پھر پیا کیا

میں نام سعی کا اپنی خدا نہ رکھوں گا — جو بن پڑے گا مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا
ادائے شکر تو سمجھوں گا فرض وعدوں پر — امید آپ سے لیکن ذرا نہ رکھوں گا

نئے طریقوں سے مقصدِ شرع کارفرما نہ ہو سکے گا — اُدھر جو پردہ نہ ہو سکے گا اِدھر بھی تقویٰ نہ ہو سکے گا
تمام دنیا نئی روش میں جو چھوڑ بیٹھے گی دینِ حق کو — جو ایک مومن بھی ہو گا زندہ تو اکبرؔ ایسا نہ ہو سکے گا
دعا ترقی کی میں نے دیکھی بصد ادب ہے یہی گذارش
مرض ترقی کریگا اس سے مریض اچھا نہ ہو سکے گا

جدائی نے ہی بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا — خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

خدا ہی کی قدرت کا ہر سو عمل ہے — تفکر میں کیوں جان اپنی ہے کھوتا
ہوا جو کچھ اکبرؔ سمجھ ٹھیک اُس کو — ضروری نہ ہوتا تو ہرگز نہ ہوتا

نظر کو ہو ذوقِ معرفت کا کرے تو شوقِ اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انہیں سے ہوں گے جواب پیدا

کرو نہ کچھ فکرِ جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ آس کو ٹوٹنے کا موقع نہ شوقِ گستاخیوں کا حامی
اداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

ہر اک کے لائق ہے اس کی زینت نہ ہے تری شانِ تیمی قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی گہر سے کرتی ہے آب پیدا

یہ منزلِ حرصِ مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

اک تماشا ہے یہ قربِ ضعف یہ بعدِ اجل
مدتیں گذریں اسی میں اب مرا اور اب مرا

دفن کر دو فاتحہ پڑھ دو سدھارو دوستو
یہ نہ پوچھو تم کہ میں کیوں کر مرا اور کب مرا

اس کو پروانہ نہ کہہ دن کو ہوا جو پائمال
وہ ہے پروانہ جو پیشِ شمع وقتِ شب مرا

بہت دشوار ہے شایستۂ راہِ طلب ہونا
نظر کا حد میں رہنا شوقِ دل کا باادب ہونا

تعجب انقلابوں کا ہے کیا اس دورِ گردوں میں
یہاں تو رات دن ہے شب کا دن اور دن کا شب ہونا

تڑپنے کا سلیقہ کیوں کیا تھا ثابت اس دل نے
تعجب کیا ہے اب ہر مصیبت منتخب ہونا

حرصِ دنیا کا اثر طبع پہ غالب نہ رہا
دیکھ کر حالتِ مطلوب میں طالب نہ رہا

کہیں اس عہد میں دو دل نظر آتے نہیں ایک
اثرِ معنیٔ یک جان و دو قالب نہ رہا

کہہ چکا اُن سے بہ ہر حال ہوں راضی بہ رضا
اب کوئی موقعۂ اظہارِ مطالب نہ رہا

ہوش نے کر لئے اغراض و مطالب پیدا
نقش سے ہو گئے اطراف و جوانب پیدا

خوشی سے شیخِ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

کونسلوں میں سوال کرنے لگے
قومی طاقت نے جب جواب دیا

معانی کی نظر سے جو تری صورت کو دیکھے گا
نہ وہ دوزخ کو دیکھے گا نہ وہ جنّت کو دیکھے گا

دُوں گا ذرا سمجھ کے جواب اُن کی بات کا
رُخ دیکھتا ہوں سِلسلۂ واقعات کا

اے دوست مجھے تو ہے خدا ہی پہ بھروسا
دشمن کو مبارک ہو مری گھات میں رہنا

آنے دو مصیبت کو ذرا خانۂ دل پر
جو بند ہے غفلت میں وہ عبرت میں کُھلے گا
محفل ہی میں خاموش ہے اور بند ہے اکبرؔ
تنہا کبھی ملیئے گا تو خلوت میں کُھلے گا
کیا علم کی لذّت سے بھی بڑھ کر ہے کوئی چیز
یہ حال تو بس محفلِ حیرت میں کُھلے گا

خدا طالب نہیں تم سے مقفّٰے بات کرنے کا
وہ اُس سے خوش ہی جسکو شوق ہے خیرات کرنے کا

خلاصہ ہے یہی ساری شریعت اور حکمت کا
وہی بندہ ہے اچھّا شوق ہو جس کو عبادت کا

احساس جو ہوتا ہے روایات سے پیدا
ہوتا نہیں اصلی اثر اُس بات سے پیدا

کام اس ملک میں ہو سلف گورمنٹ" سے کیا
زہر کو ہضم کرے کوئی پپرمنٹ سے کیا

ناحق جو وہ مجھ سے کد کرے گا		اللہ مری مدد کرے گا
دعویٰ تو مرا ہے صرف توحید		کیوں کر کوئی اس کو رد کرے گا
دُنیا کی طرف بُلا نہ اے شیخ		نیکوں کو یہ وعظ بد کرے گا

———

جسے حکومت کا نشہ ہو گا فلک سدا اس سے کد کرے گا
جو صبر و طاعت سے کام لے گا خدا اُسی کی مدد کرے گا

———

اکبر نہ تھا بُت خانے میں زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا
کچھ نامِ خدا سے اُنس بھی تھا کچھ ظلمِ بُتاں سے ڈر بھی گیا

پروانے کا حال اِس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اِک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

کعبے سے جو بُت نِکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بُت بھی ہم سے چُھٹے قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اُس قصر پہ کل رویا میں بہت
کوئی متنفس بھی تھا نہ وہاں باہر بھی پھرا اندر بھی گیا

کیا گزری جو اِک پردے کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزّت بھی گئی دولت بھی گئی بی بی بھی گئی زیور بھی گیا

اکبؔر کے جو مر جانے کی خبر ساقی نے سُنی تو خوب کہا
مرنا تو ضروری تھا ہی اُسے رندوں کے لئے کچھ کر بھی گیا

———

کیا خبر کونسا قانون سزا دے گا مجھے		مجھ پہ الزام ہے مذہب کی طرفداری کا

مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنہیں اے اکبر
اُن کو کیا غم ہے گناہوں کی گرانباری کا

سعادت ہے تری دھن میں خودی سے بیخبر ہونا
ترے ہونے کے آگے کچھ نہیں ہونا ہے ہر ہونا

تعجب خیز ہے انشائے ہستی پر نظر ہونا
خبر کا شوق رکھنا مبتدا سے بے خبر ہونا

زمیں زیرِ قدم پاکر بشر نے پاؤں پھیلائے
نہ رکھا یاد اس نے چرخ کا بالائے سر ہونا

قیامت ہے مرا جوشِ طبیعت اُن کی کم عمری
مرا بے چین ہونا اور ان کا بے خبر ہونا

پریشاں ہو کے کھو جانے میں اک معنی ہیں اے اکبر
نہیں تو بات کیا ہے عاشقِ زلف و کمر ہونا

سیہ خانہ وہی ہے اور وہی سوزِ غمِ فرقت
مرے کس کام آیا آپ کا رشکِ قمر ہونا

مٹا دو رنگِ وحدت میں خودی کا نقش اے اکبر
اگر ثابت کیا چاہو تم اپنا معتبر ہونا

جلوہ عیاں ہے قدرتِ پروردگار کا
کیا دلکشا یہ سین ہے فصلِ بہار کا

نازاں ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب
جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم اُبھار کا

ہیں دیدنی بنفشہ و سُنبل کے پیچ و تاب
نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زُلفِ یار کا

سبزہ ہے یا یہ آبِ زمرد کی موج ہے
شبنم ہے بحر یا گُہرِ آبدار کا

مرغانِ باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں
اور ناچ ہو رہا ہے نسیمِ بہار کا

پرواز میں ہیں تیتریاں شاد و چُست و مست
زیبِ بدن کئے ہوئے خلعت بہار کا

موجِ ہوا و زمزمۂ عندلیبِ مست
اک سازِ دلنواز ہے مضراب و تار کا

ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے
غازہ بنا ہے رُوئے عروسِ بہار کا

افسوس اس سماں میں بھی اکبر اُداس ہے
سوہانِ رُوح ہجر ہے اِک گلعذار کا

کل کی اُمیدوار ہے دنیا	عالمِ انتظار ہے دنیا
بے خبر رکھتی ہے حقیقت سے	ہوش پر میرے بار ہے دنیا

خلقت کی یہ موجیں ہیں ازلی ممکن نہیں ضبط اس منظر کا
اے ہوشِ بشر کب تک یہ جنوں ہر ذرّے کے "کب" اور "کیونکر" کا
اغراض جو یہ ہیں نفسانی کھو دیتے ہیں نورِ ایمانی
موقع ہی نہیں ملتا دل کو جویاں ہو وہ اپنے جوہر کا

پیدا کیا ہے جس نے اُمید ہے اسی سے	کچھ شک نہیں ہے اس میں بس ہے وہی ہمارا

سمجھا تھا میں کہ وقت جو آیا گزر گیا	کہتا ہے فلسفہ کہ تجھی میں ٹھہر گیا
کہتا ہے جس کو وقت ترا ہی ظہور ہے	دامانِ عمر تیری ہی ہستی سے بھر گیا

کمالِ شوق سے لپٹا ہوا ہوں دنیا سے	سُنا جو، ہیچ اُسے آپ کی کمر سمجھا

ہے اختیار، خود کو مختار تم سمجھ لو	لیکن ہوئے یقیناً بے اختیار پیدا
دستِ اجل سے آخر بگڑی ہے بات اُس کی	مٹّی نے کر لیا تھا اِک اعتبار پیدا

ہزاروں ہی مصائب جھیل کر پائی ہے یہ نعمت	نہ تھا کچھ سہل دنیا سے مرا بیزار ہو جانا
نہ ہو مشہور تو دنیا طلب غوغائے ہستی میں	یہ کچھ اچھا نہیں رسوا سرِ بازار ہو جانا
سوا دل کے کہ اس کی زندگی رہ سکتی ہے قائم	یقینی اِک دن ان اعضا کا ہے بیکار ہو جانا

ان کو مرا علیضہ پہنچا ضرور ہوگا   لیکن جواب کیسا، مانع غرور ہوگا

کرو سکوت نہیں وقتِ اعتراض اکبرؔ   فضول بحث سے اپنوں کو تم نے غیر کیا

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑتا ہے حال   کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

زباں سے بے تعلّق دل کو بزم یار میں دیکھا   تعجّب خیز ضبط اس محرمِ اسرار میں دیکھا
اِدھر تسبیح کی گردش میں پایا شیخ صاحب کو   برہمن کو اُدھر اُلجھا ہوا زنّار میں دیکھا
مگر عشقِ حقیقی کا کوئی رشتہ نہ تھا دل میں   فقط نفسانیت کا پیچ و خم ہر تار میں دیکھا
وہ بانکا قاتل آئینے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا   کبھی دیکھا بھی اپنا عکس اگر تلوار میں دیکھا
زمانے نے مرے آگے بھی دنیا پیش کر دی تھی   مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

صفِ مسجد میں جو آئے نظر عزت کرو اس کی
یہ سمجھو تم اُسے اللہ کے دربار میں دیکھا

طرزِ عمل پہ ہم نے کبھی غور کیا کیا   جو نفس نے کہا وہ کیا اور کیا کیا
ہم سے گناہ گار کی قوت جو چھین لی   بے شک خدا نے رحم کیا جور کیا کیا

راہِ خدا میں صبر کی منزل کی دھوم ہے   میں بھی کروں گا قصد اگر دل ٹھہر سکا
آئینِ نو کے ہوں گے نتیجے بہت بُرے   بچ جاؤں گا میں ان سے اگر جلد مر سکا

قوت ہی تعلق کی نہ رہی ہر طرح مرا دل توڑ دیا   دنیا کو کروں گا ترک میں کیا دنیا ہی نے مجھکو چھوڑ دیا

دنیا کو بُت بنائے رہا تا دمِ اخیر
کیا احتساب اس نے کیا توڑ کیا گیا

کوئی مرے تو پوچھ کہ کیا لے گیا وہ ساتھ
بالکل فضول بحث ہے یہ چھوڑ کیا گیا

کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمساز جدا
دورِ فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا

وجد یاروں کو ہے اس بزم میں حیران ہوں میں
سُر سے آواز جُدا راگ سے ہے ساز جُدا

آسماں کی نہ یہ چالیں ہیں نہ جادو کے یہ رنگ
سب سے اِس نرگسِ فتّاں کے ہیں انداز جُدا

اُن کی آنکھوں کی لگاوٹ سے حذر اے اکبر
دین سے کرتی ہے دل کو یہی غمّاز جُدا

پولٹیکل سُروں سے ہر گز نہ ساز کرنا
وُہ چُغد ہے جو چاہے بلبل کو باز کرنا

موسم جو ہو مخالف ہر گز نہیں مناسب
منقار کو قرینِ آہنگِ ناز کرنا

مٹی کو آ گیا ہے رُوحوں کو پھانس لینا
سب کے گلے پڑا ہے دن رات سانس لینا

ہوش و خرد کا نزلہ تکلیف دے رہا ہے
جائز سمجھ لیا ہے یاروں نے کھانس لینا

کرتے پھرتے ہو یہی تحقیق کس نے کیا کہا
اپنے دل کی بھی خبر تو لو کہ اس نے کیا کہا

خانساماں دونوں نے سمجھا انہیں انداز سے
کیا بتاؤں کیا کہا بیگم نے مِس نے کیا کہا

معدے نے تو کر لیا سوڈے سے اقرارِ وفا
برف سے لیکن ریاحِ محتبس نے کیا کہا

لیجئے اُس بُت سے سن کر میں تو بولا ہی نہیں
وُہ بالآخر پھنس گیا وقت میں جس نے کیا کہا

کہہ گئے واعظ فسانے یہ بھی اکبر غور کر
تجھ سے فطرت کی زباں میں تیرے حس نے کیا کہا

رہتا بہت ہے شوق دلیل و قیاس کا　　مالک مگر نہیں ہوں میں اپنے حواس کا

کُل جورِ چرخ میرے ہی حِصّے میں آ پڑا　　دنیا پڑی تھی پر وُہ مجھی پر برس پڑا

منتشر ذرّوں کو یکجائی کا جوش آیا تو کیا　　چار دن کے واسطے مٹّی کو ہوش آیا تو کیا
عارضی ہیں موسمِ گُل کی یہ ساری مستیاں　　لالہ گلشن میں اگر ساغر بدوش آیا تو کیا
دورِ آخر بزمِ دُنیا کا ہے جامِ خونِ دل　　عیش اس محفل میں بن کر بادہ نوش آیا تو کیا
حدِّ حیرت ہی میں رکھّا ضعف نے ادراک کو
پیکرِ خاکی کو اس عالم میں ہوش آیا تو کیا

جان کو نفس کے آغوش میں رہنے نہ دیا　　عِشق نے دل کو مرے ہوش میں رہنے نہ دیا
بوئے فردا تو ہوئی دافعِ افسردہ دلی　　رنگِ امشب نے مگر جوش میں رہنے نہ دیا
میں تو بدلا نہیں لیکن تری بے مہری نے　　زورِ کچھ طبعِ وفا کوش میں رہنے نہ دیا

پری سے ان کا دل بے ربط نکلا　　جنوں سمجھے تھے جس کو خبط نکلا

بتانِ دہر سے مجھ کو تمتّع ہو نہیں سکتا　　خلوصِ امکان سے باہر تصنّع ہو نہیں سکتا
محیطِ دہر میں کٹنا خطوں کا ہے غلط راہی　　جو رُخ ہو جانبِ مرکز تقاطع ہو نہیں سکتا

اس قدر زیست سے بیزار کیا تھا غم نے　　ملک الموت نے پایا مجھے مشتاق اپنا
مدح سُن سُن کے کھنچا جاتا ہے دل اس کی طرف　　کر ہی لے گا مجھے وُہ شہرۂ آفاق اپنا

دل گیا، صبر گیا، ہوش گیا، جان گئی
مژدہ اے عشق حساب اب تو ہے بیباق اپنا

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

جہد یہ ہے کہ زمانے کو موافق کر لے
سب کو آتا ہے زمانے کے موافق ہونا
عزتِ عقل ہے ہو جائے جو وہ خادمِ عشق
شاذ و نادر ہے مگر عقل کا عاشق ہونا

معذور ہوں میں حضرت کو اگر ہے مجھ سے گلا بے باکی کا
نیکی کا ادب تو آساں ہے مشکل ہے ادب چالاکی کا

وہ میرے پیشِ نظر تھے فلک نہ دیکھ سکا
چھٹے تو بھر میں انہیں آج تک نہ دیکھ سکا

تنگ دنیا سے دل اس دورِ فلک میں آگیا
جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آگیا
آسماں کو تو غلط ثابت کیا سائنس نے
عرش باقی تھا سو وہ بھی مدِ شک میں آگیا

فریبِ سمع و بصر میں آکر قوائے دل کا ہلاک ہونا
کسی نے سمجھا اسے ترقی کسی نے سمجھا ہے خاک ہونا

خدا کی ہستی کو یاد رکھنا اور اپنی ہستی کو بھول جانا
نظر اسی پر ہے اور باتوں کو میں نے بالکل فضول جانا
جنوں ہم ایسوں کو کیا تعجب بہار کا ہے سماں ہی ایسا
صبا کا اٹھکھیلیوں سے چلنا خوشی سے کلیوں کا پھول جانا

جہانِ فانی کی انجمن میں یہی تسلسل ہمیشہ دیکھا　　اُمید کے ساتھ شاد آنا اُٹھا کے صدمے ملول جانا

شبِ حسرت میں کل یُوں مجھ سے سرگرمِ سخن دِل تھا
گئے وہ دن کہ میں دنیا میں خوش رہنے کے قابل تھا

ایک ساعت کی یہاں کہہ نہیں سکتا کوئی　　یہ بھلا کون بتائے تمہیں کل کیا ہوگا
بڑھتا ہی جاتا ہے سوزِ غمِ فرقت یارب　　آج یہ حال ہمارا ہے تو کل کیا ہوگا
ایک دن اور قیامت کھسک آئے گی اِدھر　　اور کیا عرض کروں آپ سے کل کیا ہوگا

یہ فکر چھوڑ کہ دنیا کا حال کیا ہوگا　　اسی کو سوچ کہ تیرا مآل کیا ہوگا

کھُلا دیواں مرا تو شورِ تحسیں بزم میں اٹھا　　مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بِل آیا

زمانہ جانبِ انصاف ڈھل ہی جائے گا　　زبان بند کرو حال کھُل ہی جائیگا

کیا کروں اظہار اپنے حال کا　　آئینہ ہے آپ کے اقبال کا

حدیثِ عافیت کیسی امیدوں کا محل کیسا　　ہجومِ یاس میں دل کے لئے طولِ امل کیسا
تعجب جوشِ رندی پر نہ کر اس دیرِ دلکش میں　　جہاں یہ حُسنِ صورت ہے وہاں حسنِ عمل کیسا
یہ موجِ فیض ہے تہذیب کی یا اس کا طوفاں ہے
کنواں موجود ہے گھر میں تو پھر پانی کا نل کیسا

دکھ مرگ کو محبوب تامّل نہیں اچھا ۔۔۔ اِس ہستیِ ناقص کا تسلسل نہیں اچھا
تحقیر جو ہو پیشِ بُتاں جی سے گذر جا ۔۔۔ رندی کے بھی حق میں یہ تحمّل نہیں اچھا
خاموش رہا میں گُلِ تصویر کے آگے ۔۔۔ ہر چند مچا غل کہ یہ بلبل نہیں اچھا
یہ ٹھیک نصیحت ہے کہ ہے ہم پہ عمل فرض ۔۔۔ یہ وعظ غلط ہے کہ توکّل نہیں اچھا
دنیا کے تعلق کو بہت غور سے دیکھا ۔۔۔ جزو اُس کا ضروری ہے مگر کُل نہیں اچھا

شیخ صاحب جمعبندی میں نہ کیوں اُلجھے رہیں ۔۔۔ ہند کا اِسلام ہی کھیوٹ میں داخل ہو گیا

نہ پائی دل نے راحت اس قدر بزمِ احبّا میں ۔۔۔ انہوں نے جب درِ تحسیں مرے اشعار پر کھولا
ہوئی جس درجہ کلفت کمپ میں ایسے سوالوں سے ۔۔۔ یہ تم کِس واسطے لِکھّا، یہ تم کِس واسطے بولا

واقفِ کبھی خوشی سے مرا دل نہ ہو سکا ۔۔۔ لیکن یہ غم ہی کیا ہے کہ غافل نہ ہو سکا
توہین سہہ کے دیر میں پاتے ہی کچھ عروج ۔۔۔ افسوس ہے کہ دل متحمّل نہ ہو سکا

مزا آسودگیٔ نفس کا کِتنا ہی اچھا ہو ۔۔۔ حریفِ لذّتِ بے تابیٔ دل ہو نہیں سکتا
وہ کیا پابندِ آئیں ہو پڑے جب پر نظر تیری ۔۔۔ مرتّب بہرِ منطق ہوشِ بسمل ہو نہیں سکتا
شمولِ خوں نہیں اَے ابرِ نیساں تیرے قطرے میں ۔۔۔ دُرِ تاباں تو بن سکتا ہے یہ دِل ہو نہیں سکتا
نظر اپنی خودی پر کر کے کہتا ہے یہی اکبرؔ ۔۔۔ یہ ٹکڑا ہوش کا ہستی میں کامل ہو نہیں سکتا

دلِ زخمی سے خوں اَے ہم نشیں کچھ کم نہیں نکلا ۔۔۔ تڑپنا تھا مگر قسمت میں لکھا دم نہیں نکلا
ہمیشہ زخمِ دل پر زہر ہی چھڑکا خیالوں نے ۔۔۔ کبھی اِن ہمدموں کی جیب سے مرہم نہیں نکلا

ہمارا بھی کوئی ہمدرد ہے اس وقت دُنیا میں ‏ ‏ پُکارا ہر طرف منہ سے کسی کے ہم نہیں نِکلا
تجسّس کی نظر سے سیرِ فطرت کی جوئے اکبرؔ ‏ ‏ کوئی ذرہ نہ تھا جس میں کہ اک عالم نہیں نکلا

فراغِ طبع ہم کو اپنے ہی غم سے نہیں مِلتا ‏ ‏ کسی سے ہم نہیں ملتے کوئی ہم سے نہیں ملتا
کیا ہے ذوقِ ترکِ ماسوا نے مجھ کو دیوانہ ‏ ‏ دل اپنا اس سے ملتا ہے جو عالم سے نہیں ملتا

مجھے آتا نہیں اچھی طرح اظہارِ غم کرنا ‏ ‏ مگر کچھ منحصر اس پر نہیں اس کا کرم کرنا
رہِ عرفاں میں حِس حظ والم کا نامناسب ہے ‏ ‏ پسندِ طبعِ اکبرؔ ہے نہ خوش رہنا نہ غم کرنا

بساطِ دل تو یہ اور اس پہ یا اللہ غم اتنا ‏ ‏ نہ تھی طاقت زباں میں لگ گئے بس کہہ کے ہم اتنا
نہ ہوں نازاں مجھے بےجاں سمجھ کر یہ بُتِ ظالم ‏ ‏ خدا کا نام لیتا ہوں ابھی باقی ہے دم اتنا
خیالاتِ عدوئے ہوش کا سودا ہے اکبرؔ کو ‏ ‏ حریصِ بےخودی ہوگا کوئی دنیا میں کم اتنا

یاس ہی یاس تھی جب موت کا پیغام آیا ‏ ‏ میں نہ سمجھا کہ یہ جینا مرے کس کام آیا

عقبیٰ کا یقین تجھ کو نہ ہوتا جو کم اتنا ‏ ‏ دنیا کے حوادث، یہ نہ ہوتا الم اتنا

غور سے دیکھو زمین و آسماں کو مت کرو ‏ ‏ چل بھی سکتا ہے خدا کے اِنتظام اتنا بڑا
سنتے ہیں اکبرؔ کو ہے عشقِ دہانِ تنگِ بُت ‏ ‏ کام اِتنا چھوٹا اور حضرت کا نام اتنا بڑا

چلنا جو میں چاہتا ہوں تو قدم اُٹھ نہیں سکتا ‏ ‏ لِکھنے کی ہو خواہش تو قلم اُٹھ نہیں سکتا

ہو عزمِ فغاں کا تو زباں ہل نہیں سکتی چپکا جو رہوں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

امتیازِ حسرت و رنج و الم جاتا رہا غم ہوا اتنا کہ اب احساسِ غم جاتا رہا
بزمِ دنیا میں کہاں سامانِ حشمت کو ثبات گم ہوئی مُہرِ سلیمانؑ جامِ جم جاتا رہا
جس سے تھا خودداریِ اربابِ حاجت کا نباہ وہ سلیقہ تم سے اے اہلِ کرم جاتا رہا
نقلِ مغرب میں جو چھوڑی ایشیا نے اپنی اصل گھٹ گئی شانِ عرب حسنِ عجم جاتا رہا
نقشِ صورت ہی کی تزئیں پر رہی جس کی نظر اُس سخن سے حُسنِ معنیٰ یک قلم جاتا رہا

کہاں ہیں ہم میں اب ایسے سالک کہ راہ ڈھونڈھی، قدم اُٹھایا
جو ہیں، تو ایسے ہی رہ گئے ہیں، کتاب دیکھی قلم اُٹھایا
اگرچہ راحت کا بھی تھا موقعہ، مجھے تھا لیکن خیالِ فردا
سُبک نہ ہونا تھا چشمِ دل میں، اسی سے بارِ الم اٹھایا
فلک کی گردش کے رنگ ہیں یہ، کہ ہم جھکے ہیں بتوں کے آگے
خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے، عرب نے نازِ عجم اُٹھایا

ہمیشہ ہوتے ہیں دنیا کی راحت سے الم پیدا وہ کیا شادی کہ جس شادی سے ہوں اسبابِ غم پیدا

فلک سے گو کہ مجھے شکوۂ مظالم تھا مگر میں خود طلبِ عافیت سے نادم تھا
کھنچے جو دار پہ منصور راہ ہی تھی غلط خدا بنے تھے تو چھپنا بھی اُن کو لازم تھا
ہمیشہ کہتا تھا ہر بات پر "نمی دانم" کچھ اس میں شک نہیں اکبرؔ بڑا ہی عالم تھا

سخت طینت ہو تو نیک انجام کیوں ہونے لگا
انشراحِ صدر اسلام کیوں ہونے لگا

فلک سے شکوۂ جور و ستم کیا
زمین چکر میں حب خود ہے تو ہم کیا
ہمیں دنیا میں بخت بیش و کم کیا
زیادہ خود نہیں ہے وہ تو ہم کیا

تھا زور کبھی خود بینی کا، کرتے ہی تھے کیا ہم ہم کے سوا!
اب اپنی زباں پر کچھ بھی نہیں ہے ربِّ غفور و رحیم کے سوا
ہو جوشِ سرشکِ شوق اگر، رنگینیٔ دل کی زینت ہو
غازۂ رُخِ گل کا کون بنے اس گلشن میں شبنم کے سوا
غفلت سے ہے کارِ دل میں خلل، گو آتی ہے سب کو یادِ اجل
مجھ کو تو کوئی مصلح نہ ملا داغوں کے سوا اور غم کے سوا

محافل میں بہت آساں ہو بر سوں پیچ و خم کھانا
مگر مشکل ہو واعظ کے لئے دو دن بھی کم کھانا

جو مرغِ صبح کی آواز کو بانگِ اذاں سمجھا
اُسے بیدار دل نے دہر کا رازِ نہاں سمجھا
جو اپنی زندگانی کو فقط اِک امتحاں سمجھا
اسی نے راحت و تکلیف کا رازِ نہاں سمجھا

تھی فقط غفلت ہی غفلت عیش کا دن کچھ نہ تھا
ہم نے سب کچھ اسکو سمجھا تھا و لیکن کچھ نہ تھا
طالبِ دنیا کو وقتِ نزع کیوں ہوتی نہ یاس
تھا جو ظاہر ہو گیا وہ ختم، باطن کچھ نہ تھا

بنی فطرت اسی کی برہمن جو بُت حسیں نکلا
نظر نے راز جوئی کی، نتیجہ کچھ نہیں نکلا

آتشِ غم سے چمکنے لگے اشعار مرے　　داغِ دل کرنے لگے معنیِ روشن پیدا

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں سے مقدور مرا　　بڑھتا جاتا ہے شمار ان کے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مرتے ہیں　　فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازارِ جہاں میں ہر سُو　　کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا
نظرت اُٹھی ہے شفاعت کو ملائک ہیں خموش
حشر ہے عشق و محبّت کے گنہگاروں کا

جہاں میں حال مرا اس قدر زبون ہوا　　کہ مجھ کو دیکھ کے بسمل کو بھی سکون ہوا
غریب دل نے بہت آرزوئیں پیدا کیں　　مگر نصیب کا لِکّھا کہ سب کا خون ہوا
وہ اپنے حُسن سے واقف، میں اپنی عقل سے سیر　　انھوں نے ہوش سنبھالا، مجھے جنون ہوا
اُمیدِ چشمِ مروّت کہاں رہی باقی　　ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا
نگاہِ گرم کرسمس میں بھی رہی ہم پر
ہمارے حق میں دسمبر بھی ماہِ جُون ہوا

جُدا رہتا تو ہوں تم سے مگر دل خوش نہیں رہتا　　جو بس ہوتا جہاں رہتے ہو تم میں بھی وہیں رہتا

خوشی تو ایسی کوئی نہ دیکھی، کہ اس کی مستی زیادہ رہتی
مگر غم ایسا ہوا مجھے اب، کہ حشر تک ہوش میں رہوں گا

گُلوں کی فرقت کے داغ اب تک ہرے ہیں سینے میں اے گلستاں
چمن میں خاک اڑا چکا ہوں تو پھول کس دل سے اب چنوں گا

پائے رفتار تو ہو جاتے ہیں ہم میں پیدا — رہنما بننے کو ہوتی نہیں آنکھیں پیدا
ان نگاہوں سے تعلق کی یہ جلدی کیا ہے — حضرتِ دل ابھی کچھ خون تو کرلیں پیدا

غوغائیوں سے اس کے سوا اور کہیں کیا — تاریخ میں سب کچھ ہے یہ بتلاؤ تمہیں کیا

عبث طولِ امل یہ ہے چناں ہوگا چنیں ہوگا — نہیں ہے دور وہ ساعت کہ تو زیرِ زمیں ہوگا

یہ بُت مجھے نہیں دیتے امان شکرِ خدا — خدا کی راہ میں جاتی ہے جان شکرِ خدا
اجل کے شوق میں پروائے زندگی نہ رہی — نظر میں ہیچ ہے سارا جہان شکرِ خدا
برائے مشقِ ستم پا لیا مرے دل کو — عجب نہیں جو کرے آسمان شکرِ خدا
وفا نہ کی بُتِ بے دیں نے ہم سے اے اکبر
غلط ہی تھا وہ ہمارا گمان شکرِ خدا

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں — وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

نہ رازِ آسماں جانا نہ کچھ حالِ زمیں جانا — رہیں بحثیں بہت اور در حقیقت کچھ نہیں جانا

دوا جو غیر نے بھیجی ہے وہ ہرگز نہ کھاؤں گا — اگر ہے زندگی باقی تو اچھا ہو ہی جاؤنگا

موسمِ گل ہی سہی ۔ چاک گریباں اتنا — کل کچھ اس سے بھی سوا آج تو جی ہاں اتنا
برہمی زلف مصیبت کی ہے حُسنِ رُخِ عشق — قدرداں دل ہے تو پھر کیوں ہے پریشاں اتنا

مری آہوں کو وہ فرعون طینت کچھ نہیں سمجھا
مگر جس کو سمجھ تھی اس نے موسیٰ آفریں سمجھا

جو بعد مرنے کے رہ گیا کچھ نہ سمجھ سکا یہ کہ مر گیا ہوں
تو زندگی سے نجات پانے کی میں تو بیحد خوشی کروں گا

خلقت کے لئے واضع قانون ہی اچھا
جو چل نہ سکے اس پہ وہ مجنون ہی اچھا

کیا سختیٔ موسم جو ہو مطلب کے موافق
ان برف فروشوں کے لئے جون ہی اچھا

دعوت بھی بہت خوب ہے احباب کی خاطر
لیکن جو اڈیٹر ہو تو مضمون ہی اچھا

منطق کو فائدہ کیا ان سینہ کاویوں کا
مطلب میں اپنا حس ہے مذہب میں راویوں کا

بساطِ حس ہی کم انساں ہوا ہے ناتواں پیدا
اسی کم مائگی نے کر دیئے کب اور کہاں پیدا

اگر موجِ نفس میں آئیں موجیں جوشِ معنی کی
حبابِ زندگی ہی سے ہو بحرِ بیکراں پیدا

کہاں سے اس میں خوئے جور آئی میں نہیں واقف
میں جب پیدا ہوا تو ہو چکا تھا آسماں پیدا

ادھر خیال نہیں مصلحانِ نیشن کا
کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا

مجھی پر جب گذرتی ہے تو اب انکار کیا معنی
جو کوئی دوسرا کہتا تو مشکل سے یقیں آتا

حیات اب مجھ سے کہتی ہے کہ میں مجبور ہوں ورنہ
کسی پر بار ہو کر مجھ کو رہنا خوش نہیں آتا

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے رازِ دیں سمجھا
فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

مگر اظہارِ عجزِ عقل میں بھی ایسی لذّت ہے
کہ خوانِ فکر پر میں اس کو رشکِ انگبیں سمجھا

روش ذہنِ بشر کی مدعی مطلق نہیں سمجھا
ترقی سے رہا محروم عادت کو یقیں سمجھا

فنا کے دَور میں اِس آسماں سے کیا ہوگا
چنیں سے ہوگا چناں پھر چناں سے کیا ہوگا

ایمان جیت کر بھی ایمان ہی رہے گا
شیطان ہار کر بھی شیطان ہی رہے گا

تہمد میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اُگا
ہر پیڑ پہ اک پہرا بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اُگا

اے فلک دل کی ترقی کا جو ساماں ہوتا
طاعتِ حق کا ستارا بھی درخشاں ہوتا

جان لیتا جو شبستانِ فنا کا انجام
صورتِ شمع ہر اک بزم میں گریاں ہوتا

غنچہ مُرجھا کے گرا شاخ سے افسوس نہ کر
کِھل بھی جاتا تو یہی تھا کہ پریشاں ہوتا

ناصحا نالہ و زاری پہ ملامت ہے عبث
چپ بھی ہوتا تو مرا راز نہ پنہاں ہوتا

کس مپرسی کا گلا کچھ نہیں مجھ کو اکبرؔ
حال ہی کیا تھا کہ جس کا کوئی پُرساں ہوتا

چمنِ دہر میں مایوس رہا میں اکبرؔ
کاش اِک پھول بھی تو زینتِ داماں ہوتا

دنیا کا حُسن مجھ سے لاعلم ہے تو باشد
افسوس کیا کہ مجھ کو شیطان نے نہ جانا

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا — خدا خالق خدا مالک خدا کا حکم ٹو کیسا
خزاں پھرتی ہے آنکھوں میں چمن کا کیا مزا آئے — فنا جب ہے نگاہوں میں تو لطفِ رنگ و بو کیسا
مئے گل رنگ سے جس مسلمِ ناداں کو رغبت ہے — خدا جانے رگوں میں اس کی بہتا ہے لہو کیسا
گھٹا کر دین کو عزت تری بڑھ سکتی ہے کیونکر — طریقِ کفر میں اے دوست حفظِ آبرو کیسا

اُس کو نہ پا سکا مگر اس غم میں رو سکا — یہ بھی ہے اُس کا فضل کہ اتنا تو ہو سکا
کوشش یہ تھی خودی کو میں گم کردوں عشق میں — دقت یہ ہو گئی کہ فقط عقل کھو سکا

ہنس کے دنیا میں مرا کوئی کوئی رو کے مرا — زندگی پائی مگر اس نے جو کچھ ہو کے مرا
جی اٹھا مرنے سے وہ جس کی خدا پر تھی نظر — جس نے دنیا ہی کو پایا تھا وہ سب کھو کے مرا
تھا لگا روح پہ غفلت سے دوئی کا دھبا — تھا وہی صوفیٔ صافی جو اسے دھو کے مرا

اب غم کا بھی حق مجھ سے ادا ہو نہیں سکتا — ہوں مضمحل اتنا کہ بہت رو نہیں سکتا
افسوس کہ راحت تو مجھے مل نہیں سکتی — اور جان بلا حکمِ خدا کھو نہیں سکتا

خرد سے انکشافِ رازِ ہستی ہو نہیں سکتا — یہ امر اس راز کی عظمت کو لیکن کھو نہیں سکتا
جو ہے آرام دہ بستر تو دروازہ شکستہ ہے — مصیبت دیکھئے نیند آ رہی ہے سو نہیں سکتا

مرنے والا مر گیا اور رونے والا رو چکا — وائے برما ہستی اگر مقصودِ ہستی ہو چکا
اب جنوں سے کام لوں گا میں رہِ تحقیق میں — عقل کے پیچھے تو اتنا وقت اپنا کھو چکا

جان بچنے کی نہیں وقت جب آجائے گا
دوستی بھی ملک الموت سے ہو جائے تو کیا

تازگی طبع کی ممکن ہی نہیں ہجر کی شب
قصّہ سنکر بہ تکلف کوئی سو جائے تو کیا

مرتبہ دنیا میں اس سے بھی سوا ہو آپ کا
یاد رکھیے گا کہ میں بھی ہوں دعا گو آپ کا

تسبیح صاحب میں ضرورت سے فقط مجبور ہوں
ورنہ میرا بھی عقیدہ ہے وہی جو آپ کا

ہم کو اپنے البم پر ناز کا ہے کیا محل
بے حد ارزاں ہو گیا ہے اب تو فوٹو آپ کا

آپ کے درشن مصور کے بھی حصے میں نہیں
بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا

اپنی ہستی پر عبث ہے آپ کو اکبرؔ وثوق
اس کا مالک اور ہی ہے نام ہے گو آپ کا

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہرِ خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

لگاوٹوں سے یہ دل لبھانا فریب دے کر تباہ کرنا
غضب ہے ہم کو سمجھ نہ آئی انہیں کو آیا نگاہ کرنا

ستم سے وہ دل مراد کھائیں اور اپنے عشووں کی داد چاہیں
عجب تماشا ہے دل کا رونا زبان کا واہ واہ کرنا

یہ داغ یہ داغ دل کے اندر یہ ناتوانی یہ جانِ مضطر
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو اداس رہنا اور آہ کرنا

شکل تسکیں مرے دل کو مرے اللہ دکھا
راہیں سب بند ہوئیں اپنی طرف راہ دکھا

چمکے وہ مہر کہ گم ہوں یہ چراغِ اوہام — نورِ عرفاں سے ہو مملو وہ شبِ ماہ دکھا
آنکھ کو صورتِ فانی نے کیا ہے پُر خوں
چشمِ باطن کو مرے معنیٔ دلخواہ دِکھا

خدا کا چاہنا ہے چاہنا، میں کچھ نہ چاہونگا — جہاں تک ہو سکے گا بندگی کا حق نِبا ہونگا

ہند میں بُت کو چاہنا ہی پڑا — برہمن سے نباہنا ہی پڑا
اس قدر درد ہو تو ضبط کہاں — دل کو آخر کراہنا ہی پڑا

آپ کے ہاتھ میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا — داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

کل مدح مری وہ کرتے تھے، اور بزم میں میں شرمندہ تھا
میں کچھ بھی نہ تھا اور تھا بھی اگر، اس وقت میں تھا جب زندہ تھا

تھا کیا ہی سماں تھی کیا ہی وہ شب سینے ہی میں تھے اسبابِ طرب
ہر حرکتِ دل اک نغمہ تھی ہر تارِ نفس سازندہ تھا

گو دیر میں طالب میرے تھے بُت کعبے ہی میں پایا میں نے مفر
اس وقت تو صورت اچھی تھی خطرے کا محل آئندہ تھا

افسوس ہے اس نے قدر نہ کی اور دل کو مرے برباد کیا
با معنی تھا پائندہ تھا اک گوہر تھا تابندہ تھا

مانا کہ معذرت سے وہ رو براہ ہو گا — اس سوءِ ظن میں لیکن کب تک نباہ ہوگا

بے دادِ بُت کو اکبرؔ سہتا ہے بے تردّد — کوئی تو ہے کہ جس سے وہ داد خواہ ہوگا

جیسی دل میں ترنگ آجائے — عشق و مستی کا قاعدہ کیا
رکھ اپنی نظر سُوئے ھو اللہ — تُو تُو مَیں مَیں سے فائدہ کیا

گرم و سردِ دہر سے سالک کبھی رُکتے نہیں — چلتی رہتی ہیں ہوائیں ماگھ کیا بیساکھ کیا

تو ہی ہے نازِ مرے دل کا اٹھانے والا — لے جنوں اب میں نہیں آپ میں آنے والا
ہوش اڑا دیتا ہے اِن خاک کے پتلوں کا جمال — خود وہ کیا ہوگا نہیں ہوش میں لانے والا
داغِ دل ہی کا سہارا ہے فقط اے اکبرؔ — قبر پہ کوئی نہیں شمع جلانے والا
اپنے خمخانے کا دروازہ کرو بند اکبرؔ — اب نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

زمانہ میرے زخمِ دل کو ہرگز سی نہیں سکتا — جیوں شاید مگر آرام سے اب جی نہیں سکتا
بشر کو زندگی میں غفلتِ امیدِ فردا ہے — مگر دم بھر کبھی اپنے قصد سے وہ جی نہیں سکتا
خدا ہی سے بالآخر کام پڑ جاتا ہے اے اکبرؔ — نہیں ہوتا کسی کا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا

عشق میں حسنِ بیاں وجہِ تسلّی نہ ہوا — لفظ چمکا مگر آئینۂ معنی نہ ہوا
دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن — کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں کچھ بھی نہ ہوا

غم و تکلیف سے خالی فقط اک حسِ ہوستی کا — نہ چشمِ غیر بیں ہو اور نہ سودا خود پرستی کا
یہی حالت ہے جس کی آرزو ہے اہلِ باطن کو — یہی لذّت ہے جس کا حس فلک پیما اوجِ مستی کا

مذہبی جنگ ہے اب دُنیا کے لئے
دین بھی کچھ ہو اگر نقلی تو کیا

نفس ہی کی خواہشوں کا ہے نفاذ
رُوح نے مذہب کو ڈگری دی تو کیا

آبرو و دولت میں خود واعظ ہیں غرق
دوسرں پہ نکتہ چینی کی تو کیا

بزمِ ساقی کی کہاں وہ مستیاں
چھپ کے اکبرؔ نے اگر پی بھی تو کیا

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمرِ فانی کا
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

میں آہ کر نہ سکا ضبط کی ہوئی تعریف
رہوں گا شکر گذار اپنی ناتوانی کا

بعید رُوح کے خالق سے ہے بلا کی شوق
اگرچہ حق ہے لیے نازِ لن ترانی کا

سوا خدا کے کسی کا خیال آ نہ سکا
غموں نے کام دیا دل کی پاسبانی کا

یہ بات ہے صاف مجھ سے سُن لے کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا
حدود دنیا کے ہیں معیّن جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

خدا کی یاد میں گو جان کو ہے شوقِ مستی کا
بدن کو کیا کریں جوہر ہے جسمیں بُت پرستی کا

جو اہلِ دُنیا کا رُخ کرو گے سکونِ خاطر کبھی نہ ہوگا
شریکِ غفلت بہت ملیں گے شریکِ عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا جزوِ اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقدّم
نئے طریقے میں لیکن اے دوست ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

حالِ دل خوب کہا ہے یہ زباں کا دعوےٰ
دل سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ کچھ بھی نہ کہا

ہے بدگماں جو وہ بت پرواہ نہیں کچھ اس کی ہر برہمن ہے شیدا اکبرؔ کی کافری کا

حسن دیکھو بتانِ کاشی کا چہرہ ہے چاند پورنماشی کا
چشمِ تر دیکھ کر وہ مس بولی محکمہ ہے یہ آب پاشی کا
آپ کی متن واہ صلِّ علیٰ سارا فتنہ ہے اِن حواشی کا
ہو گیا فیل امتحانوں میں اب ارادہ ہے بدمعاشی کا

پوچھو گے جب فلک سے تم سے یہی کہے گا جو تھا نہ رہ گیا وہ، جو ہے وہ کیوں رہیگا
ہوں گے حباب اُبھر کر یوں نہیں فنا ہمیشہ موجیں گھٹیں بڑھیں گی دریا یونہیں بہے گا
ذکرِ خدا کا ہوگا جس دل کو ذوق اکبرؔ وہ مطمئن رہے گا غم بھی اگر سہے گا

علامت رُوحِ شخصی کی ہوئی کس شے سے تھی پیدا
حوادث یہ کہاں تھے اب ہوئی جن سے خودی پیدا
نگاہیں ہوں تو ویرانے میں بھی آبادیاں دیکھیں
اگر دل ہو تو ہر پہلو سے کر لے دل لگی پیدا

کچھ نہیں کارِ فلک حادثہ پاشی کے سوا فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا
کھو دیئے کس مری ایامِ جوانی کے سوا سب بتا دوں گا تمہیں "افتد ودانی" کے سوا

خیراں کو کچھ نہ آئے پھانس لینے کے سوا مجھ کو اب کرنا ہی کیا ہے سانس لینے کے سوا
تھی شبِ تاریک چور آئے جو کچھ تھا لے گئے کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

جو ہے بلند باطن پستی سے وہ بچے گا — گو پستیوں میں پائے افزونی مراتب
ہر چند شیر عاجز اور طالبِ غذا ہو — لیکن نہ کھا سکے گا کتّوں کے ساتھ راتب

یہ اُسے کرتی ہے روشن وہ مٹاتا ہے اسے — رات سے پوچھو کہ بہتر شمع ہے یا آفتاب

محاورات کو بدلیں "براہِ ریل" جناب — "ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

پہلے تھا نورِ عرفاں خالق سے لو لگی تھی ! — قومی مباحثوں سے روشن ہوا دماغ اب
وقعت پہ اب ہیں نازاں سوز و گداز رخصت — قبل اس کے شمع تھے وہ ہیں لعلِ شب چراغ اب

نزع میں انسان سکھ پائے تو خوب — زندگی مرنے کے کام آئے تو خوب

پنجۂ شیخ سے نکلے تو پریشان ہیں اب — ٹوٹی تسبیح کے دانے یہ مسلماں ہیں اب

ضبط کی تکلیف جو کچھ ہو اسے سہہ لوں گا اب — جو مجھے کہنا ہے دل میں ہی اسے کہہ لوں گا اب

ہر دم خیال رکھے حق کا اگر ہے طالب — ہر سانس کھینچتی ہے جاں آفریں کی جانب

عاشقانہ آپ کی وحشت نہیں ہے اے جناب — چغد سے جب پوچھتے ہیں راہ ویرانے کی آپ

بالائے عرش ہیں کہ تہِ آسماں ہیں آپ — دعوے سے قبل دیکھ تو لیجے کہاں ہیں آپ

کیا جرم ہے یہ حال تو جانے خدائے موت — ہر نفس کے لئے ہے مگر یاں سزائے موت
کہتی ہے عقل موت یہ ہے بہرِ زندگی — وہ زندگی کہ جو نہیں ہوگی برائے موت
دنیا کی زندگی تو ہے اک جزوِ موت ہی — اس کا نتیجہ ہو نہیں سکتا سوائے موت
سانچا یہ زندگی ہے فقط روح کے لئے — جب ڈھل چکے تو سانچے کو جائز ہے آئے موت
کیسی ڈھلی اسی کا ہے لازم ہمیں خیال — نعمت بنائیں موت کو کیوں ہو جفائے موت

ہوتا ہے غم ضرور مگر کچھ ہے مصلحت
اللہ کر دے طبع کو راز آشنائے موت

ماضیست کہنہ نقشے مستقبلست وہمے — در حالش ار نہ بینی اے وائے بزنگاہت

بگذار بہ حالِ خودم اے بزمِ تعلّی — عبرت زدہ را کار بہ آن زدگاں نیست

اگرچہ ذکرِ شہادت پہ جان دیتے ہیں — جو دیکھئے تو ہیں آرام جو حیات پرست
وہ تیتری ہے یہ بلبل وہ گونج بھونرے کی — بہار باغ نے پیدا کئے نبات پرست

ایں فتنہ کہ برپا شد وایں شور کہ برخاست — الزام بہ گردوں منہ از ماست کہ بر ماست

وعظ کہنے کو تو موجود ہیں اکبر لیکن — کیا اثر رکھتی ہے اس وقت مسلمان کی بات
کہے دیتا ہوں بتوں کو میں عدوئے دل و دیں — آ ہی جاتی ہے زباں پر کبھی ایمان کی بات

شرطِ انساں کو سلیقہ ہے سخن گوئی میں — باغباں سے ہو مخاطب تو کرے پھول کی بات

عقل مندی نہیں دیوانۂ دنیا ہونا
نہ کرو رد یہ ہے اک بندۂ مقبول کی بات
پروفیسروں سے ہمیں کچھ نہیں حاصل اکبرؔ
دل عاشق میں سماتی نہیں اسکول کی بات

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے
مگر اس بزم میں یہ سچ ہے کہ "جی ہاں" ہے بہت
واعظِ تقوےٰ نے نہ کہو رحم کرو اکبرؔ پر
چشمِ بد دور ابھی طاقتِ عصیاں ہے بہت

حالِ ما ماضی نشد مستقبلِ ما حالِ ماست
ہستیٔ دارم کہ ہر دم گم بہ ہستی خداست

مشربِ مرا قناعت، مذہب مرا طریقت
ملئے اگر تو خادم، رکئے اگر تو رخصت

عقلِ زاہد، عشقِ صوفی میں بس اتنا فرق ہے
اس کو خوفِ آخرت ہے اس کو ذوقِ آخرت

از کمیٹی طبعِ جلسہ ندارم اکبرؔ
شعرم اندر پسِ من مدح سرایم باقیست

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو
بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

جی کے مرنے میں کیا ہے ناز کی بات
مر کے جینا ہے امتیاز کی بات
چاہتی تھی زباں کرے توضیح
دل پکارا کہ ہے یہ راز کی بات

اس سے بڑھ کر کون ہے راہِ فنا میں بیقرار — حصر کی حد سے ہے باہر تیزیٔ رفتارِ وقت

اٹھتی ہیں تجھ سے یہ آہیں دلِ ناشاد عبث — سننے والا نہیں کوئی تو ہے فریاد عبث!
چرخ کہتا ہے ضروری ہے تڑپنے کے لئے — ورنہ گذری ہوئی باتوں کی ہے اب یاد عبث

شیخ آنر کے لئے آتے ہیں میدان کے بیچ — ووٹ ہاتھوں میں ہے اسپیچ قلمدان کے بیچ
وہی قسمت وہی قانون اور اس پہ یہ بھیڑ — اے خدا عقل ہے حیران تری شان کے بیچ

عابدوں کے دم سے ہے یہ رونقِ دربارِ صبح — نعرۂ تکبیر سے ہے گرمیٔ بازارِ صبح
جھانکتا ہے اس کی جانب دور سے مہرِ مبیں — خوش نصیب آنکھیں وہ ہیں جن پر کھلیں اسرارِ صبح

یوں تو ہر شے پہ اداسی سی نظر آتی ہے — کس مپرسی میں کوئی شے نہیں مذہب کی طرح
مولوی گو کہ ہیں شمس العلماء پھر بھی ہیں سست — رینگتے پھرتے ہیں پروانۂ بے شب کی طرح

جسم میں یا تو کبھی تھا شوق سے ہیجانِ روح — یا تعلق جسم سے اب ہو گیا سوہانِ روح
عقلِ انساں کیوں نہ عاجز ہو ترے ادراک میں — روح ہی کو یہ نہ سمجھی اور تو ہے جانِ روح

گراں نظر پہ ہے مسجد کا با ادب سجدہ — وہ بے خطر ہے جو ہے بزم میں زباں گستاخ
دلوں کا زور نہ باقی رہے خدا کی طرف — اسی سے لیگ میں جائز رہی زباں گستاخ

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند — مرے دل پر نہیں معنی کے در بند

ہماری بے کسی کب تک چھپے گی | خدا پر تو نہیں راہِ خبر بند
بریادِ رنج یارانِ نظر بند | کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں دردہی کی کچھ کمی ہے | نہیں ہے آہ پر راہِ اثر بند
بتِ مشرق نہیں محتاجِ ساماں | کمر ہی جب نہیں کیسا کمر بند
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا | کھُلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیالِ چشمِ فتّاں میں ہوا محو | مرا دل اب ہے سینے میں نظر بند

بہ کارِ دیں ہم آمادہ دلِ پُرجوشِ من باشد | مسلماں مے شوم سلماں چو در آغوشِ من باشد

زباں بند ہے اس عہدِ پُرنگاہ کے بعد | سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد
رُکا ہوا ہے جو سانس لَا اِلٰہ کے بعد | خدا کو مان ہی لے گا زوالِ جاہ کے بعد
شگفتہ پایا طبیعت کو بعدِ کارِ ثواب | دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد
تمہارے عارضِ روشن نے کھولدیں آنکھیں | میں کہہ رہا تھا کہ اب کیا ہی مہر و ماہ کے بعد

ہے منتظمِ جہاں کا پروردگار خود | حیرت میں ہیں حوادثِ بے اختیار خود

عزتِ اکبر نہ مثلِ برہمن در دَیر بُود | قشقہ بُودش بر جبیں لیکن ز دستِ غیر بُود

مارا ازیں چہ کار بہ حرمن چہ می رود | دریاب از نگاہ کہ برمن چہ می رود

ہوائے گلشنِ طبع تو دلکش است اکبر | کہ از گلِ سخنت بُوئے یار می آید

به ظاہر تھا بُراقِ راہِ عرفاں — چو دُم برداشتم لیڈی برآمد

گو رہتے ہیں ممبرِئ فانی پرشاد — لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر۔ شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی — عاقل ہیں مکرّمی بھوانی پرشاد

علم ہم از عشق یک اظہار بُود — چشم بر زلف و دہانِ یار بُود

مرنے والے ہی کو عزرائیل آتے ہیں نظر — دوسرے دیکھیں تو برپا ہو بڑا دنگا فساد

پادری سے وہ ملے پہلے تو کیا شیخ کو عذر — دیکھئے پیر کا نمبر تو ہے اتوار کے بعد

میری سمجھ میں تو یہی آیا نظر کے بعد — تفتیش علّتوں کی یہاں ہے اثر کے بعد
کچھ درک مبتدا کی کسی سے نہ ہو سکی — ترکیب سوچتے ہیں مگر کب خبر کے بعد

غافل یہاں کے لذّت و آرام پر نہ ہو — دنیا میں ہائے ہائے بہت ہے مزے کے بعد
اِک اضطراب دل کو مرے کر گیا خراب — کیا پوچھتے ہو حالِ زمیں زلزلے کے بعد

مجھ کو تو اکبر کا یہ مصرعہ رہا کرتا ہے ورد — جمع ہیں اولادِ آدم ہند کے گیہوں کے گرد

نہ تنہا وجد میں بلبل ہے میری خوش بیانی پر — گریباں چاک گل بھی ہے مرے رنگِ معانی پر
تری چوٹی جو پہونچی ایڑیوں تک اس پہ حیرت کیا — یہ پابوسی تو واجب تھی بلائے آسمانی پر

جمتا نہیں یقین کوئی میرے ہوش پر — کاموں کی یاں بِنا ہے فقط دل کے جوش پر
کیونکر دلیل دیکھ سکے اُس جمال کو — جس کا خیال برق گراتا ہے ہوش پر

تُو ضبط پر اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ درِ تاثیر نہ کر

باطن میں اُبھر کر ضبطِ فغاں، لے اپنی نظر سے کارِ زباں
دل جوش میں لا فریاد نہ کر، تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تو خاک میں مِل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عُنصر پر بُنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

جینا وہ ہے کہ ہستی ہو اوجِ معرفت پر — جینا وہ ہے کہ جو ہو اُمیدِ آخرت پر
کیا ہو بنائے الفت آخر مناسبت کیا — میں خاکِ بیکسی پر وہ تختِ سلطنت پر

قیامت ہے، یہ ضد ضبطِ فغاں ہے اس لئے مجھ کو — کہیں نازاں نہ ہو میری مصیبت اپنی شدت پر
زبان و چشم و دل اور دست و پا سے کام لو ایسے — کہ روزِ حشر نازاں ہوں یہ اپنی اپنی حالت پر

اثر اس کا ہے کم ہم بادۂ وحدت کے مستوں پر — عدو نے فتح پائی ہے تو تم سے بُت پرستوں پر

بہت مشکل ہے نو عمروں کا بچنا اس کے عشووں سے — نئی آنکھوں کے آگے آتی ہے دُنیا نئی ہو کر

ناز اس ظاہرِ طہارت پر نہ اے مغرور کر
حرصِ دُنیا خود نجس ہے یہ نجاست دور کر

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرتِ آدمؑ بنے کیوں کر

گِلا جورِ فلک کا تو بہت کچھ رو چکا اکبرؔ
سرِ تسلیم خم کر زورِ بازو ہو چکا اکبرؔ

نہ پوچھو کیا اثر اس مصرعۂ اکبرؔ کا ہے ہم پر
ہر اک کے علم کا ہے خاتمہ "واللہ اعلم" پر

فلسفی بھی نوحہ گر ہیں ذہن کے مقسوم پر
پاتے ہیں معلوم کی بنیاد نامعلوم پر

مجھ کو جائز نہیں یہ عرض کہ بیداد نہ کر
اُن کو زیبا ہے یہ ارشاد کہ فریاد نہ کر
شیخ کہتے ہیں کہ پیروں کی پرستش بھی ہے فرض
ماسٹر کہتے ہیں اللہ کو بھی یاد نہ کر
وحشت انگیز ترقی ہے تہِ چرخ اس وقت
تو بگولا نہ بن اور عمر کو برباد نہ کر
حسنِ سُنبل سے جو ہو زلفِ بُتاں کا سودا
چھوڑ دے سیرِ چمن خضر کی امداد نہ کر

جواہر ریزیاں میری زباں کی
زمیں بھی سُن رہی ہے کان بن کر
جو قالب بن گئی ہے یہ تو مٹّی
یہ کیا شے ہے جو چمکی جان بن کر
پئے شوقِ بقا تھا خانۂ دل
فنا کیوں بس گئی ارمان بن کر

وہ دولت کیا رہی دو دن جو تجھ سے متصل ہو کر
ترقی تو وہ ہے رہ جائے دل میں جزوِ دل ہو کر
ہوائے نفس کے تابع ہیں جن کے جسم اے اکبرؔ
انہیں کی روح رہتی ہے بدن میں مضمحل ہو کر

فکرِ منزل ہو گئی اُن کا گذرنا دیکھ کر زندہ دل میں ہو گیا اوروں کا مرنا دیکھ کر
آسماں کی چھت بہت نیچی سرِ نخوت کو ہے کبر سے کہہ دو کہ دنیا میں اُبھرنا دیکھ کر
زیست بے وقعت ہوئی ہے میرے شوقِ زیست سے موت حیراں ہے مرا مرنے سے ڈرنا دیکھ کر

قصد تو جائز ہے لیکن اپنا قابو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا چاہیئے انساں کو بازو دیکھ کر

بھروسا باغِ ہستی میں نہیں کچھ نخلِ قامت کا نفس کیا ہے ہوا کی بیل ہے دھوکے کی ٹٹّی پر

مبتلائے بحث کو رازِ خدا کی کیا خبر معنیِ بے لفظ و نغمۂ بے صدا کی کیا خبر
پا لیا اک ہنگامہ ہم بھی ہو گئے اس میں شریک ابتدا کا علم کیسا انتہا کی کیا خبر

ظاہر ہوئی کمیٹی و کالج کی اِک لکیر آخر اِسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر
مرکز جو فطرتی تھے انہیں اب نہیں قرار چکر میں خود پھنسے ہیں ہمارے امیر و پیر

سُوجھتا کچھ ترقّی کا تو ہے ہر بات پر ختم لیکن ہو کے رہ جاتا ہے میری ذات پر

وہ ٹال دیتے ہیں مجھ کو وری بزی کہہ کر میں اُٹھ ہی آتا ہوں الفاظِ عاجزی کہہ کر

فطرت کی یہ سازش دیکھ ذرا الزام نہ دے پھنس جانے پر
یہ سوچ پڑی طائر کی نظر کیوں دام سے پہلے دانے پر

VERY BUSY وری بزی

مشکل ہی کیا ہے گرنا پائے بتاں پہ رو کر — لیکن میں پاؤں گا کیا اپنا وقار کھو کر

میں کیا پاؤں گا اگر بتکدے میں حاضری دیکر — یہ بت رہ جائیں گے تھوڑی سی دادِ کافری دیکر
کہاں تک اہلِ دنیا سے کرو گے معذرت اکبرؔ — یہی بہتر ہے چل دو اک جوابِ آخری دیکر

جب مسرت منحصر ہو سعیِ کفر آمیز پر — صبر کرنا چاہیئے حالاتِ درد انگیز پر

ہستی میں رہے ہستیِ وحدت میں فنا ہو کر — عالم کو میں کیوں دیکھوں عالم سے جدا ہو کر
فتوائے خرد جو ہو دل کی تو صدا یہ ہے — فانی ہے جدا ہو کر باقی ہے خدا ہو کر

مزا ہے عالمِ حیرت میں پاک طینت کو — عجیب نور برستا ہے چشمِ نرگس پر
فروغِ دل جو ہو منظور بزمِ ہستی میں — اشارہ شعلے کا دیکھ اور ہوا کی سُن وھسپر

چشم بد دور آپ تو ہیں آپ ہی اپنی نظیر — ناتوانی سے غلام اور علم سے روشن ضمیر

اکبرؔ خدا کو مان زمان و مکاں کو چھوڑ — عرفاں کا ذوق اگر ہے تو کب اور کہاں کو چھوڑ
پابند کر نہ ساعت و ساحت کا ذہن کو — دارِ فنا میں حسرتِ نام و نشاں کو چھوڑ
رنگِ زمانہ رائے کی کثرت سے ڈر نہ جا — سارا جہاں ہو مشرک تو سارے جہاں کو چھوڑ

مسجد نے کہا میرا فسانا بھی ہے اک چیز — کالج نے پکارا کہ زمانہ بھی ہے اک چیز
واعظ کی بلاغت بھی بڑی چیز ہے لیکن — سچ بات یہ ہے دل میں سمانا بھی ہے اک چیز

WHISPER ۵۱

جیسی حالت پیش آتی ہے زمانے میں جسے
ذہنِ انسانی میں ویسا ہی اتر آتا ہے عکس
یہ مواقع ہیں کہ ہو جاتے ہیں وجہِ اختلاف
آئینے کا رُخ جہاں بدلا بدل جاتا ہے عکس

چیستی اکبرؔ بگو مجموعۂ اعمالِ خویش
بعد ازاں بنگر بیادِ آخرت در حالِ خویش

ہے یہ رفتارِ جہاں کون سی حالت کی طرف
بس جواب اس کا یہی ہے کہ قیامت کی طرف

وضع و روشِ اطفال کی ہے قوم پہ بارِ گراں
رسموں کا شکوہ اِک طرف مذہب کا رونا اک طرف
کہتے ہیں لڑکے بھی مگر کالج سے فرصت ہے کہاں
یہ ساری باتیں اِک طرف اور پاس ہونا اک طرف

نشاطِ طبع پہ تھی خوبیٔ بیاں موقوف
دلِ فگار نے کی شوخیٔ زباں موقوف

الاماں اے زخمِ دل اے شدتِ سوزِ فراق
المدد اے مرگ مجھ پر زندگانی اب ہے شاق
روشنیٔ طبع وہ مجھ میں کہاں ہے دوستو
شمعِ مُردہ ہوں مجھے رہنے دو اب بالائے طاق

یہ سوزِ داغِ دل یہ شدتِ رنج و الم کب تک
ہمارے ہی لئے یہ جورِ گردوں ہے تو ہم کب تک
یہ دفتر ختم ہو ہی گا بھلا ہی دیگا دہر اس کو
یہ حسن کب تک نظر کب تک زباں کب تک قلم کب تک
جو ہیں اہلِ بصیرت کہتے ہیں اکثر یہ اکبرؔ سے
غنیمت ہے ترا دم ہند میں لیکن یہ دم کب تک

نگاہِ اوّلیں کے دام میں اُلجھی ہے اک دنیا
نصیبِ ہر نظر کب ہے پہنچنا حدِّ حیرت تک

من از تیغ جفائے چرخ گرداں گشتہ ام بسمل　　مخواں مارا بہ بزمِ عیش خود اے منعمِ غافل

ترا شیر است و شمشاد است و مارا آہ و فریاد است　　ترا باغیست اندر دہ مرا داغیست اندر دل

کوئی سنتا نہیں تیری تو اس بکنے کا کیا حاصل　　کوئی منزل نہیں درپیش پھر تھکنے کا کیا حاصل

اشارہ چشمِ شوقِ مشرقی سے ہے یہ مغرب کا　　جو قوّت ہو تو بسم اللہ منہ تکنے کا کیا حاصل

کھلتا بہت سکوت سے رنگِ بہارِ دِل　　لیکن نہ اُٹھ سکے گا خموشی سے بارِ دل

کچھ نہ سمجھا شبِ فراق کا حال　　کھل گیا یار کے مذاق کا حال

اعتبار آپ کو نہ آئے گا　　کیا کہوں اپنے اشتیاق کا حال

فکر ہے دنیائے فانی کی خلافِ شانِ دِل　　کیجئے ذکرِ خدا سے حاصلِ اطمینانِ دل

یار نے پوچھا میں کیا ہوں دل سے نکلی یہ صدا　　حاصلِ دل مقصدِ دل مطلبِ دل جانِ دل

سر تراشا اُن کا، کاٹا اِن کا پاؤں !　　وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو تیخ کردیا مومن کو موم　　دونوں کی حالت گئی آخر بدل

واعظا ایں نہ جنوں است نہ کافر شدہ ام　　اوّلت نا شدہ ختم است و من آخر شدہ ام

کردیں جو بے کسوں سے ذرا یہ غرور کم　　جب بھی نہیں رہیں گے کسی سے حضور کم

دکھا رہی ہے یہ ترکیب حسنِ طبع سلیم — علی کی تم میں جگہ ہو تو بس وہ ہے تعلیم

عقل مذہب سے دوستی رکھے — نہ تو دشمن ہو اس کی اور نہ غلام

زبانِ علم کی گو متّبع ہے وقتِ کلام — مگر یہ تابعِ حکمت نہیں ہے وقتِ طعام

کبھی اسلام لائے تھے کہ ہو دینِ خدا قائم — اور اب مشرب بدلتے ہیں کہ ہو اپنا جتھا قائم

بُت پوچھتے ہیں مجھ سے کیوں اللہ اللہ ہوم — میرا جواب یہ ہے دانم چرا نگویم

مولوی ہو ہی چکے تھے نذرِ کالج اس سے قبل — خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچرر مضمون لکھتے ہیں تصوّف کے خلاف — الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیضِ عام

بند ٹاپے میں تھے وہ بنگلے پر — صبح کے وقت ہنس پڑی اک میم
جب وہ بولے بجائے کو کروں کوں — مرغِ شاخِ درخت لاہوتیم

اب جسم میں باقی ہے مسرت کا لہو کم — احباب میں مرحوم بہت سلّمہ کم

اس دارِ فنا کی بحثوں میں کیا صرفِ زباں کیا صرفِ قلم
دنیا کو بقا کیا اے اکبرؔ کَے دن کی خوشی کَے دن کا الم
دم بھر میں نشاطِ طبع فنا اک آن میں نازِ جاہ ہوا

کیا بزمِ طرب کیا شانِ شہی کیا بربط و دف کیا طبل و علم

کوئی موقع نہیں ہے ہنسنے کا
سب کو معلوم ہے کہ میں کیا ہوں
ہو گئی ہے اُمیدِ مرگ قوی
کل کی نسبت تو آج اچھا ہوں

دستِ بستہ پا شکستہ دلِ فسردہ لب پہ مُہر
کچھ نہ کچھ کرتا ہے ہر اک اے خدا میں کیا کروں
یہ دلِ بیتاب مجھ کو کر رہا ہے کیوں تباہ
ہو گئی اک باتؔ ۔ تھا حکم قضا میں کیا کروں
نزع میں پیکِ اجل سے کہہ رہا تھا اک حسیں
تو قضا لایا ہے سر پر اب ادا میں کیا کروں
شکوۂ بیداد کرتا ہوں تو کہتا ہے فلک
خود بخود مجھ سے ٹپکتی ہے جفا میں کیا کروں

حُسنِ فانی کے لئے میرا دلِ دوا نہیں
نازِ عکسِ بے بقا آنکھوں سے اب اٹھتا نہیں

یہ شاعر رنگِ شب کو گیسوئے لیلیٰ بھی کہتے ہیں
یہی حُسنِ تصور ہے جسے سودا بھی کہتے ہیں
بتوں کے ناز پر اس عہد میں لازم ہے خاموشی
بُرا کہتے ہیں دشمن انکو تو دشمن اچھا بھی کہتے ہیں

جہاں سوئی گھڑی کی ہوتی تھی وقت اس کو کہتے تھے
گئی چوری تو ہم سمجھے زمانہ اس کو کہتے ہیں

میں اپنے آپ میں ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

لہ اشارہ مرگِ ہاشم

نہیں ہے گو مرے پائے ثبات کو لغزش — ہوائے دہر سے میں دم بدم پگھلتا ہوں
بسانِ شمعِ فروغ اپنا ہے ہر اک پہ عیاں — مگر مجھی کو فقط ہے یہ حس کہ جلتا ہوں

کوئی مونس نہیں ہے بیکسی میں جان کھوتا ہوں — جو روتے میرے مرنے پر انہیں کو اب میں روتا ہوں

یہ شانِ بے نیازی اور یہ ہنگامۂ فطرت — گلا کیا مرگِ ہاشم کا وہی کیا تھا ہمیں کیا ہیں

جان دینا منع ہے اور دل سے غم مٹتا نہیں — سانس لیتا ہوں مگر کام اس سے کچھ چلتا نہیں
تپ نہ ہونے سے نہ سمجھو یہ کہ میں راحت میں ہوں — دل میں انگارے بھرے ہیں گو بدن جلتا نہیں
یہ بتِ خود بیں خلافِ اکبرؔ کے جو چاہیں کہیں — کفر کے سانچے میں تو بالفعل وہ ڈھلتا نہیں

تمہارا اور ان پھلوں کا مجھ پر نہیں کچھ احسان اے درختو
خدا اگاتا ہے اگ رہے ہیں خدا کھلاتا ہے کھا رہا ہوں

مجھ سے رکتی ہے تو میں تیرا اے دنیا کیوں رہوں — یاس کا جب ذوق ہے محوِ تمنا کیوں رہوں
ہم نشینی خلق کی ہے اب تو وحشت آفریں — اک زمانے میں یہ سودا تھا کہ تنہا کیوں رہوں
خوب مصرع ہے مگر کس کی زباں سے ہو ادا — یار ہوں اعزاز سے دنیا میں یا کیوں رہوں
اب ہے بیماری ہی اکبرؔ میرا شغلِ زندگی
جب فقط مرنا ہی باقی ہے تو اچھا کیوں ہوں

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں — لیکن نہ آئے موت تو بوڑھے بھی کیا کریں

میں جس کے خامۂ قدرت کا نقشِ حیرت افزا ہوں
وہی جانے کہ وہ کیا ہے وہی جانے کہ میں کیا ہوں

کوئی سُنتا نہیں میری تو پھر اس کی شکایت کیا
میں ہی کیا کر سکا ہوں آج تک اور سب کی سُنتا ہوں

جناب حضرتِ اکبر کی کوئی نبض تو دیکھے
یہ کہنے کو تو ہر حالت میں کہہ دیتے ہیں اچھّا ہوں

قدرت کا رنگ دیکھ نہ ڈھونڈھ اُس کی ماہیت
تصویر کو ٹٹولنے میں کچھ مزا نہیں

آخرت کے لئے کافی ہے فقط ذکرِ خُدا
سوشل اغراض کو کچھ پیر بنا رکھے ہیں

اس موت کے آگے اَے اکبر مشغولیِ دنیا کچھ بھی نہیں
سب کچھ جسے ہم سمجھے تھے ابھی دم بھر میں جو دیکھا کچھ بھی نہیں

تدبیر کی کوئی حد نہ رہی اور بالآخر کہنا ہی پڑا
اللہ کی مرضی سب کچھ ہے بندے کی تمنّا کچھ بھی نہیں

اس گلستاں میں بہت کلیاں مجھے تڑپا گئیں
کیوں لگی تھیں شاخ میں کیوں بے کھِلے مرجھا گئیں

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
بحثوں کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے

جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

کیوں مجھ سے پوچھتے ہیں وہ کیا چاہتا ہوں میں
کیا دیکھتے نہیں کہ مرا چاہتا ہُوں میں

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبرؔ منتخب سمجھیں
بیاں ایسا کہ دل مانے زباں ایسی کہ سب سمجھیں
نتیجے ترکِ خودداری کے سب پر ہوگئے ظاہر
ترقی خواہِ ملّت جب سمجھے تھے تو اب سمجھیں

شیخ جی بھی وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
اب تو ہم مصلحتاً ان کا ادب کرتے ہیں
طلبِ جاہ پہ وہ کرتے ہیں کِس کو مجبور
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں لوگ غضب کرتے ہیں

یہ انقلاب بھی ہے اور آنجناب بھی ہیں
میں دیکھتا ہُوں کہ موجیں بھی ہیں حباب بھی ہیں
ہے میرے دل کو خدا کی رحمتوں کی طلب
کہ وہ وسیع بھی ہیں اور بے حساب بھی ہیں
عجب اصول ہیں رندانِ عشق کے اکبرؔ
گناہ کرتے ہیں اور طالبِ ثواب بھی ہیں

ہوٹل میں جو وہ مطلوب رہے اسٹیج پہ یہ مرغوب رہیں
ان کے بھی قوافی خوب ملے اِن کی بھی ردیفیں خوب رہیں

تم کو مبارک یہ ہوس جو ہم کہیں وہ سب کہیں
ہم کو تو ہے اس میں مفر سب کی نہیں یارب کہیں
سورج تو ہے لیکن نہاں ظلمت کے اندر ہے جہاں
تقویم میں تم دن پڑھو ہم حس کے اندر شب کہیں

آج کل اس انجمن کے کچھ عجب اسلوب ہیں
میں جو کہتا خوب ہوں وہ چپ بھی کرتے خُوب ہیں

جو شیخ کی ہے یہ خود فروشی کروں کہاں تک میں عیب پوشی
یہ اتنی دنیا سے گرم جوشی حرم میں وہ ہیں کہ شاپ میں ہیں
زمیں کی کوئی کرے نہ پروا بڑھی ہے انجینری کی ڈوری
اسی کے پیوند ہوں گے آخر ابھی تو مصروف ناپ میں ہیں

گو بہت اونچی ہے پرواز حریف
شیخ بر گڈ کم نہیں ہیں جمپ میں
ان کا طوطی بولتا ہے عرش پر
اِن کی مرغی بولتی ہے کمپ میں

کسی سے وہ محبت ہو محبت جس کو کہتے ہیں
پھر اس سے ایسی فرقت ہو کہ فرقت جس کو کہتے ہیں
دلی حالات کا اندازہ ہو اس وقت غافل کو
مصیبت ہی نہیں دیکھی مصیبت جسکو کہتے ہیں

بولے شگفتگی سے مگر بات کی نہیں
خواہش مجھے اب اُن سے ملاقات کی نہیں
میرے سکوت سے مجھے بے حِس نہ جانئے
الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں
اس کے سوا کہ شکر کا موقع نہیں ملا
مجھ کو شکایت ان سے کسی بات کی نہیں

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

دل کو اک غم نے گھیر رکھا ہے
کیا کسی سمت التفات کروں
ہم نشیں مجھ سے کچھ نہ پوچھ اس وقت
جی نہیں چاہتا کہ بات کروں

کیوں گفتگو کسی کو ہو اس ٹھیک بات میں
شیخی زبان میں ہے حکومت ہے ہات میں

حسنِ فانی جو لبھائے اُسے بُت کہتے ہیں　　گذراں فصلِ دل آویز کو رُت کہتے ہیں

کیا عذر قوم کو ہے ترقی کی بات میں　　رغبت کے ساتھ خود ہے وہ لیڈر کے ہات میں
تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور　　ناچے دُلھن خوشی سے خود اپنی بمات میں

سیر ہوں سیر سے اس دارِ کہن کی اکبر　　اب یہاں میرے لئے کوئی نئی بات نہیں

بسے برگڈ میں مغرب کی رفاقت اس کو کہتے ہیں　　ہوئے مدفون تکیئے میں ضلالت اسکو کہتے ہیں
سمجھ میں صاف آجائے فصاحت اس کو کہتے ہیں　　اثر ہو سُننے والے پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

مایوس ہوں مریضِ غمِ لا علاج ہوں[^1]　　کل بھی جیا تو کیا وہی ہوں گا جو آج ہُوں!
افسردہ ہو کے کہتی ہے گل کی زبانِ حال　　صرصر سے کیا کہوں کہ میں نازک مزاج ہوں
اِس زندگی میں ترکِ تعلّق کا ذکر کیا　　جب تن میں جان ہے ہمہ تن احتیاج ہوں

مذہبی تلقین اور ایسے شدائد الاماں　　ایک نامِ حق کے ساتھ اتنے زوائد الاماں

ہر شیخ یہ کہتا ہے عقائد ہیں تو یہ ہیں　　توحید یہ کہتی ہے زوائد ہیں تو یہ ہیں

بے بصر وہ ہیں جو بحثوں میں یہاں خُرسند ہیں　　جن کی آنکھیں[^1] کھل گئیں اُن کی زبانیں بند ہیں

---

[^1]: ۱۹۰۹ء میں آنکھ پر آپریشن ہوا تھا اور مجھ کو ہدایت تھی کہ بات نہ کروں

وہ اپنی حد سے باہر قائم یہ اپنی حد میں
یہ عمدہ فرق میں نے پایا ہے نیک و بد میں
تیری ہی حد میں تیری ساری مسرتیں ہیں
مشکل ہے بحث کرنا میرے سخن کے رد میں

بوزنے کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

الگ خیال سے یہ دنیوی مظاہر ہوں
نماز کا ہے مزا جب حواس طاہر ہوں
مخالفین کو ہم کہہ تو دیتے ہیں کافر
مگر یہ ڈرتے ہیں دل میں ہمیں نہ کافر ہوں

حواسِ ظاہری کے دام میں اوہام حاضر ہیں
مگر یہ صید خود صیادِ اطمینانِ خاطر ہیں
مرا اسلام ہی کیا ہے کہ حکمِ کفر دوں اکبرؔ
وہی کافر ہیں جو اللہ کے نزدیک کافر ہیں

بادۂ عرفاں کہاں یہ بحث کا دفتر کہاں
کفر ہے اس انجمن میں کون کیا کیونکر کہاں
خانۂ تن کے بھی اجزا میں ہے پیہم انقلاب
کیا بتائیں ہم کسی سے ہے ہمارا گھر کہاں

جن کو جینا ہے بنیں بجلی ہوس کے ابر میں
پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں یاں تو قبر میں
چند مومن بھی اسیرِ زلفِ دنیا ہو گئے
چاندنی تو ہے مگر لپٹی ہوئی ہے ابر میں
ہاتھا پائی شاہدِ مغرب سے ہم کرتے نہیں
بابوؤں ہی کو مزا ہے بوسۂ بالجبر میں

گو مجھ میں ہے بلاغت گو شعر با اثر ہیں
لیکن مرے مصائب مجھ سے بلیغ تر ہیں

کس طرح جانچے گا اپنے آپ کو اے فلسفی
فرق کیا لازم نہیں ہے ناظر و منظور میں

آپ کی ہر گز نہیں کے آگے کیا بس ہے مرا
لیکن اتنا تو ذرا سُن لو کہ آخر کیوں نہیں

اُن کے گھر کی آگ بجلی۔ میرے گھر مٹّی خراب
یا الٰہی مجھ پہ الطافِ عناصر کیوں نہیں

اس قدر دلکش ہے رنگ طبع اکبرؔ دیر میں
بُت کو حسرت ہے کہ یہ کم بخت کافر کیوں نہیں

ہم کیوں یہ مبتلائے بے تابیٔ نظر ہیں
تسکین دل کی یا رب وہ صُورتیں کدھر ہیں

ذرّے جو گل بنے تھے وہ بن گئے بگولے
جو زینتِ چمن تھے وہ خاکِ رہگذر ہیں

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلّق
وہ کیا ہے اِک جھلک ہے ہم کیا ہیں اِک نظر ہیں

ہم نے سُنا بہت کچھ حالِ جہانِ فانی!
افسانہ گو غضب ہیں قصّے تو مختصر ہیں

پیدا کیے فلک نے نادیدنی مناظر!
نیچی ہیں اُن کی نظریں جو صاحبِ نظر ہیں

غم خانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری
اِک ناشنیدہ اُف ہیں اِک آہِ بے اثر ہیں

کیا مشرقی کفن بھی وہ ترک کر سکیں گے
اوضاعِ مغربی میں جو غرق سر بسر ہیں

اکبرؔ کے شعر سُن کر کہتے ہیں اہلِ باطن
اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحبِ اثر ہیں

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیونکر کروں
بے حد آتا ہے مجھے غصّہ مگر کس پر کروں

چل بسے چھوٹے بڑے تھا جن سے لُطفِ زندگی
مجھ پہ کس کو ناز ہے میں ناز اب کس پر کروں

وصل کی شب حسبِ موسم ہو ہی جائیگی سحر
لُطف اُٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

دَورِ بے مہری ہے اُمیّدِ محبّت کس سے ہو
اُڑ رہی ہے خاک ہر سُو کس کے دل میں گھر کروں

داغِ دل پر نظرِ یاس نہ کر اے اکبرؔ — کوئی ذرّہ چمنِ دہر میں بے کار نہیں
تجھ پہ گلزار کھلائے گا یہی داغ کبھی — آج گو طبع تری محرمِ اسرار نہیں

یہ جتنے ذرّے جہانِ فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں
تغیّر اتنا کہ گم تعیّن۔ تعیّن ایسا کہ اپنی ہی دُھن
کمال ایسا کہ سب ہیں حیرت جمال ایسا کہ سب نظر ہیں
حواس کچھ نیک کام کر لیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھر لیں
مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذّت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گذر جاؤں گا بے لوث — سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے دوا کی نہیں حاجت — غم کا مجھے یہ ضعف ہے بیمار نہیں ہوں
وہ گُل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے — الجھوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بُت کے ستم سے — میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعویٔ تقویٰ نہیں درگاہِ خدا میں — بُت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبرؔ
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

جرح کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں — عزّت مسلم ہے اُس کی کس مپرسی دَیر میں

تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ رُوس — شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد — لیکن اُڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

چرخ نے پیشِ کمیشن کہہ دیا اظہار میں — قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

حواس سب ہو گئے معطّل اور آنکھ بھی بند کر چکے ہیں
لحد میں گڑنا ہے صرف باقی زمانہ گذرا کہ مر چکے ہیں

کارگر اُس بُت کی تدبیریں بالآخر ہو گئیں — گو ہوں مسلم خواہشیں میری بھی کافر ہو گئیں

بت سے حاصل کی موافق اپنے رائے — نشۂ نخوت میں اب سرشار ہیں
پوچھے کوئی حضرتِ والا سے یہ — آپ فاتح ہیں کہ ڈگری دار ہیں

اب میں سرگرمی سے کوئی سعی کرتا ہی نہیں — بعد ان مایوسیوں کے دل اُبھرتا ہی نہیں
سِلسِلا ہے بے قراری کا ہماری زندگی — سانس رکتی ہی نہیں اور دل ٹھہرتا ہی نہیں
منزلِ صبر و رضا کو سمجھے تھے آباد ہم — لیکن اس جانب سے اب کوئی گذرتا ہی نہیں
افعیٔ حرص و ہوا پر عبرتیں ہیں بے اثر — ٹوٹتی ہیں لاٹھیاں کم بخت مرتا ہی نہیں
یاس اب خوبانِ مشرق کو ہوئی عشّاق سے — اس قدر افسردہ ہیں کوئی سنورتا ہی نہیں

اس سروِ قد پہ اکبر مدّت سے مر رہا ہوں — اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

نمبر اوّل کا دعوے ہو جنہیں باہم لڑیں — خوش نصیبی سے یہاں تو دوسرے نمبر پہ ہیں

جان مُردہ ہے بدن افسردہ ہے مانندِ خاک — ہیں رہا ہوں گا کبھی لیکن اب اپنی قبر میں

مجبور بدل جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دَور بھی ہیں
یکتائی کا دعوےٰ خوب نہیں اللہ کے بندے اور بھی ہیں

قوتِ سیر جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن — پنجۂ غیر میں رہنا ہو تو تلوار نہ بن
دل کی خاطر تو ہے لازم تجھے بِک جانا بھی — صرف آنکھوں کا مزا ہو تو خریدار نہ بن
آتشِ شوقِ بتاں میں نہ جلا دل اپنا — کافری کا سبب گرمئِ بازار نہ بن
بُت پرستی میں بھی رکھ حُسن کے پہلو پہ نظر — ہار بن۔ دیر سے رشتہ ہو تو زُنّار نہ بن
دل سے کہہ سکتے ہیں ہاں شمعِ بصیرت نہ بجھے — وقت سے کہہ نہیں سکتے کہ شبِ تار نہ بن
دستِ قدرت میں ہے یہ خاکِ چمن اے اکبرؔ
اس سے کیوں کر یہ کہوں پھُول ہی بن خار نہ بن

ہے ہم سے چرخ برسرِ کیں غور کیا کریں — بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے اور کیا کریں
ہے صبر میں تو دیر وُہ فرصت کی بات ہے — لِلّٰہ یہ بتائیے فی الفور کیا کریں
اپنے جو تھے مشیر وہ سب ان سے مل گئے — کرنا پڑا سکوت بہر طور کیا کریں
پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ — اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

وہ تھے آئینِ ملّت لاکھوں ہی کو ایک کرتے تھے — یہ کیا جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتے ہیں

یہ پروانوں کا شمعوں سے لپٹنا اور جل مرنا — محبت کی روش یہ بھی ہے یوں بھی پیار کرتے ہیں
بڑھانا شوق کا منظور ہے یا مضمحل کرنا — نزاکت کا جو مجھ سے اِس قدر اظہار کرتے ہیں
ترقی کی تماشا گاہ میں اس وقت اے اکبرؔ — وُہ منظر ہیں کہ مجھ کو ہوش سے بیزار کرتے ہیں

حشر تک کھل نہ سکے راز اِسے کہتے ہیں — جستجو پھر بھی کرو ناز اسے کہتے ہیں

وجدِ عارف کی حقیقت کچھ سنادوں آپکو — گو کہ میری اصل کیا اِک بندۂ ناچیز ہوں
ناچتی ہے رُوحِ انسانی بدن میں شوق سے — جب کبھی پا جاتی ہے پرتو کہ میں کیا چیز ہوں

کچھ اعتبار نہیں مجھ کو اپنے ہونے کا — یقین میں مَیں نہیں ہوں فقط قیاس میں ہوں
ثواب کہتا ہے مِل جاؤں گا، کر اِن کی مدد — چھپا ہوا میں غریبوں کی بھوک پیاس میں ہوں

خدا شناس تو ہونا نہیں ہے سہل اکبرؔ — یہی بہت ہے جو دنیا شناس ہو جاؤں

جہاں درشن تمہارے ہوں وہیں دھونی رماؤں گا — الٰہ آباد کا قیدی نہ پابندِ بنارس ہوں

کِسی سے پوچھتا میں کیوں تصوف کسکو کہتے ہیں — خود اپنے دل کو دیکھا اور سمجھا اس کو کہتے ہیں

مرے دل کا نہ سمجھا حال کچھ بھی ڈاکٹر مِس نے — تو پھر دعوٰی یہ کیا ہے میں تری رگ رگ سے واقف ہوں

وہ دل کا رنگ نہیں گو حرم کے طوف میں ہوں — مقامِ شوق میں تھا اب محلِ خوف میں ہوں

موت سے ڈرتا ہوں گو موت کا شائق بھی ہوں
یعنی شبہ ہے کہ ایسے شوق کے لائق بھی ہوں
ہو نہیں سکتا بیانِ حالِ دل الفاظ میں
جوش بھی ہے طبع میں اور شعر میں فائق بھی ہوں

زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے رُکتے ہیں
جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کہہ بھی چُکتے ہیں

خشک ہے بالکل شجر اُمید کا
گُل میں سُرخی ہے نہ سبزی برگ میں
شغل اپنا کیا بتاؤں آپ سے
جی رہا ہوں انتظارِ مرگ میں

مسرت مجھ کو اب دشوار ہے دنیا کی محفل میں
خوشی کی قابلیت ہی نہیں باقی رہی دل میں

جھکا کر سر کو سجدے میں جو اپنے دل میں پہنچے ہیں
نہ پوچھو وہ کہاں اُبھرے ہیں کس منزل میں پہنچے ہیں

ذوقِ ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں
مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں
اظہارِ اضطراب کا شائق نہیں حس میں
پہلو میں لیکن اس دلِ بسمل کو کیا کروں
قطعِ نظر گلوں سے نہیں مانعِ جنوں
بوئے بہار و شورِ عنادل کو کیا کروں

مقبول جو ہوں شاذ ہیں قابل تو بہت ہیں
آئینے کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں
وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

علم دیں حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی
صرف سکھلانے میں لذت ہے عمل میں کچھ نہیں

زیست کا مصرعہ بنے خود آہِ سوزاں تب ہے لُطف ورنہ اے اکبرؔ تری نظمِ غزل میں کچھ نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں آپ نہایت قابل میں اِسی سوچ میں رہتا ہوں کہ کس قابل ہُوں

لذّت ہے رُوح کو تنِ خاکی سے میل میں فطرت نے مست رکھا ہے قیدی کو جیل میں
فتح و شکست پر نظریں آپ ہی کی ہوں اپنی تو دل لگی ہے فقط پاس فیل میں

ذِلّت اُٹھا رہا ہوں میں قُلیوں کے غول میں اچھے وہی جو لکھ گئے آنر کے رُول میں

وہی زندہ ہیں طاقت ہے جو صرفِ عمل کرتے ہیں ہماری زندگی کیا زندگی کی نقل کرتے ہیں

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں سینے میں سب کے دل ہے سب اہلِ دل نہیں ہیں

خدا جانے مرا کیا وزن ہے اُن کی نگاہوں میں سُنا ہے آدمی کو وہ نظر میں تول لیتے ہیں

تفرقوں کے یہ جو طوفاں ہیں بپا کچھ کم تو ہوں ہم کو کرنا چاہیئے سب کچھ مگر ہم ہم تو ہوں
دیکھ لے گا خود کہ کس عالم میں لے جاتا ہے دل مجھ کو جتنے ہیں مگر اتنے کسی کو غم تو ہوں
جام کی صورت جو ساقی خود ہوں گردش میں تو کیا شانِ محفل تمکنت ہی میں ہے پہلے جم تو ہوں

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں نہ صرف آپ اور ہم ہیں تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکزِ زباں ہو جائے کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں

خدا پرست کو کافی ہے مشل ابراہیم
زوال شمس و قمر صبح و شام عالم میں
یہی مشن تھا جنابِ رسولِ اکرمؐ کا
اور آج اُنہیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

حُسنِ آغاز تو رکھتا ہے یہ عیشِ دُنیا
مگر افسوس یہ ہے خوبیٔ انجام نہیں

تعلّی کی نہیں لیتے ہم ایسے ہیں ہم ایسے ہیں
مگر ہم جتنے ہیں بیزار دُنیا سے۔ کم ایسے ہیں
مری ہر وقت کی افسردگی ہے باریارون پر
مگر میں کیا کروں اس کو۔ خدا شاہد۔ غم ایسے ہیں

سینے میں تپش ہے دل میں غم ہیں
اللہ اللہ ہے اور ہم ہیں
جن میں لِلّٰہ دوستی ہو
اب ایسے بزرگوار کم ہیں

حقیقت کیا مری ہستی کی اک ذرّے سے بھی کم ہوں
تعجّب اس پہ آتا ہے کہ میں بھی جزوِ عالم ہوں
بحمد اللہ مری ہستی نہیں ہے بار فطرت پر
زمیں پر ہوں تو سبزہ ہوں گلوں میں ہوں تو شبنم ہوں

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں
کافی ہے یہ شرف کہ دغاتی سے کم نہیں

مِس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور ہم کہاں
بوٹ کی چرچر میں کیا رکھا ہے یہ چم چم کہاں
مِس یہ بولی بڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے
اور ہی چالیں نظر آئیں گی یہ عالم کہاں

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں
ینگ بُدّھو وارثِ اسلام ہیں
گردشِ گردوں کے آگے کس کا زور
کون دم مارے خدا کے کام ہیں

ناچیز ہے سکوں تو ملا طم بھی کچھ نہیں
ہم کچھ نہیں یہ سچ ہے مگر تم بھی کچھ نہیں
کیا نور تھا نگاہِ جنابِ خلیلؑ میں
شمس و قمر بھی کچھ نہیں انجم بھی کچھ نہیں

شکم ہوتا تو میں اس عہد میں پھولا ہوا رہتا
سراپا دل بنا ہوں اس سبب سے کُشتۂ غم ہوں

نہ واعظ کی کوئی سُنتا نہ پڑھتا ہے مصنّف کی
زباں بکتی ہی رہتی ہے قلم چلتے ہی رہتے ہیں
جو تھک کر بیٹھ جاتا ہوں زمیں کہتی ہے یہ مجھ سے
تمہارے رُکنے سے کیا ہوتا ہے ہم چلتے ہی رہتے ہیں

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں
ناز بے حد ہیں مگر غیرتِ اسلام کہاں

نئے زمانے کی ہسٹری کے عجیب مفہوم بن رہے ہیں
کہ خدمتِ دیر کی بدولت حرم کے مخدوم بن رہے ہیں

مُفتیِ شرع نہ ہوں لیڈرِ اسلام تو ہیں
بوئے مسجد نہ سہی کمپ کے گلفام تو ہیں

منہ لگایا جنہیں اُس بُت نے بنے وہ ناقوس
سازِ ملّت میں تو اب سُر یہی اسلام کے ہیں
نہ نظر آئے جبیں پر جو نشانِ سجدہ
تو سمجھ لو یہ مسلمان فقط نام کے ہیں

یہ اختلافِ صورت فطرت کی مستیاں ہیں
یہ انکشافِ معنیٰ ذہنوں کی ہستیاں ہیں
دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہیں ان گلوں میں یہ غنچوں میں بستیاں ہیں
ساقی سے بے خبر ہیں مستانِ بزمِ ہستی
یا بے ہشی ہے طاری یا خود پرستیاں ہیں
اس منزلِ فنا کو اکبرؔ نے خوب دیکھا
جتنی بلندیاں ہیں قطروں کی پستیاں ہیں

ہے جو لب پر شکوہ سمجھیں اس کو یا آہیں کہیں
میں ہوں مستِ بادۂ غم لوگ جو چاہیں کہیں

جو طریقے کامیابی کے بتاتے ہیں یہ بُت
ہیں یہ سب نامِ ہلاکت آپ انہیں راہیں کہیں

وہ چیزیں نفس کو جن سے مسرت ہے نمایاں ہیں
جو اخلاقی نتیجے دل پہ گزریں گے وہ پنہاں ہیں

جس طرف اُٹھ گئی ہیں آہیں ہیں
چشمِ بد دُور کیا نگاہیں ہیں

ذرّہ ذرّہ ہے خضرِ شوق تو ہو
چلنے والے کو لاکھ راہیں ہیں

ماسٹر کی مشیختیں دیکھو
اب تو کالج ہی خانقاہیں ہیں

رُوح ہے تن میں مگر دل میں مرے جان نہیں
داغ ہی داغ ہیں اب اور کوئی ارمان نہیں

سخت مشکل ہے مسلماں کو اس وقت فروغ
اور قناعت کی جو کہیے تو وہ آسان نہیں

ہیں سخت مُصیبت میں آرام کہاں پائیں
دُنیا سے ملیں کیونکر چھوڑیں تو کہاں جائیں

جب خدمتِ دل میں رہنے کو خالق نے زبانیں دیں مُنہ میں
اچھے ہیں وہی دل اے اکبرؔ اللہ کی باتیں جن سے اُٹھیں

اس بزم میں مجھ سے کہتے ہیں سب موقع کے مطابق بات کہو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

صُورتِ گُل ہمہ تن گوش ہوں اُس محفل میں
کہ جہاں بُلبل و قمری ہیں غزل خوانوں میں

ہے موت میں ضرور کوئی رازِ دل نشیں
سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں یہ تو کچھ نہیں

طالب علموں کو لے جاؤ کمیٹی میں نہ تم
کہیں ایسا نہ ہو یہ قوم پہ عاشق ہو جائیں

فرقت میں شوقِ دیدِ گُل لے باغباں نہیں
راحت کہاں نظر کو جب آرامِ جاں نہیں
کتنا ہی غم ہو رہتی ہے اُمیدِ بہتری
شکرِ خُدا کہ قلب مرا بدگماں نہیں
اصرارِ شوق ہے کہ کئے جاؤ عرضِ حال
ایمائے ناز ہے کہ چلی جائے ہاں نہیں

بنگلوں ہی کی چھتوں پہ کریں شاعر اب نگاہ
دورِ جدید میں کوئی شے آسماں نہیں

جو خوش کرے گا چاہے گا مجھکو بھی خوش کرو
اس کو سمجھ کے تو کوئی مِنّت قبول کر

ہو گیا ہوں اس قدر افسردہ و زار و حزیں
چل دیئے ہیں چھوڑ کر مجھ کو کراماً کاتبیں

اب کیا دُنیا سے دل لگے گا
آنکھیں چھت سے لگی ہوئی ہیں

پڑ جائیں ابھی آبلے اکبر کے بدن میں
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل، مئی، جُون

اس شرط پر ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی
قبریں مہیّا وہ کرے تزئین اُن کی ہم کریں

بُتوں میں حُسن نہیں برہمن میں جان نہیں
وہی جگہ ہے مگر دیر کی وہ شان نہیں

ہو رہا ہے نفاذِ حکمِ فنا
نہ مکیں اس سے بچتے ہیں نہ مکاں
توپیں خود آکے اب تو میدان میں
کہتی ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

دُنیا کو خوب دیکھا جتنی محبتیں ہیں
موقع کی سازشیں ہیں مطلب کی ساعتیں ہیں
البتہ جو تعلق دینی خیال سے ہے
اس میں وفا ہے شامل اور دل کو راحتیں ہیں

وہ رنگِ بزم نہیں ہے تو رند کیا اُبھریں
بہار ہی نہیں باقی تو پھر جنون کہاں

مدت سے ہوش میں ہوں نذرِ دل و زباں ہوں
لیکن کھلا نہ اب تک میں کون ہوں کہاں ہوں
پیری سے اب ہوں راضی لب پر ہے ذکرِ ماضی
پہلے فسانہ جو تھا اب اپنی داستاں ہوں
ہر بُت کہ جس کو سمجھا آنکھوں نے صدرِ ہستی
آخر میں بول اُٹھا میں سنگِ آستاں ہوں

وہ چاہتے ہیں اس کو دم دے کے میں بلاؤں
یاں دل میں یہ ٹھنی ہے مر جاؤں اور نہ جاؤں
اظہارِ عقل میں ہیں احباب گرم کوشش
اور مجھ کو فکر یہ ہے اپنا جنوں چھپاؤں
سازِ طرب ملا کر بیٹھے ہیں سننے والے
پھر میں فسانۂ غم کیونکر انہیں سناؤں
میری طرف سے کیوں وہ مایوس ہو رہے ہیں
بیمار تو پڑا ہوں ممکن ہے مر بھی جاؤں

باقی نہیں وہ رنگ گلستانِ ہند میں
محنت کا اب ہے کام گلستانِ ہند میں

لکھا تھا کہ مشتاقِ ملاقات ہوں بے حد
پاؤں جو اجازت تو دمِ چند کو آؤں
آیا یہ جواب آیئے جب چاہیے لیکن
افسوس کہ میں آپ کا مشتاق نہیں ہوں

دُنیا کی یہ قدیمی کوتہ خیالیاں ہیں
جیتے تو تالیاں ہیں ہارے تو گالیاں ہیں

کسی کو بحث نہیں آج پاپ اور پُن میں
سیاسیات کے نغمے ہیں دیس کی دُھن میں
وہ بدگماں مرے جوشِ نگاہِ شوق سے ہیں
نہ احتیاط ہے مجھ میں نہ حُسنِ ظن اُن میں

عزلت ہی ہے مناسب کیوں دل میں یہ نہ ٹھانوں
دنیا مجھے نہ جانے دُنیا کو میں نہ جانوں
میری نصیحتوں کو سُنکر وہ شوخ بولا
نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

کہوں کچھ اُن سے اثر ہو تو اعتبار آئے
سُنا تو میں نے بھی یہ ہے کہ خوب کہتا ہُوں

دست و پا بستہ ہوں میں ظاہر کوئی گُن کیا کروں
دوسروں کے بس میں ہوں فکرِ تمدّن کیا کروں
آگ برسانے لگی جب اس گلستاں کی ہوا
خواہشِ نشو و نمائے نخل و گلبن کیا کروں
مہربانی سے مجھے گو دام کی کُنجی تو دی
لیکن اب گیہوں نہیں باقی فقط گھن کیا کروں
ڈیرہ میں کل گا رہی تھی اک زنِ زہرہ جبیں
جب پیا پاپی ملے مجھ کو تو اب پُن کیا کروں
عقل روتی ہے کہ یہ گُتھی سلجھتی ہی نہیں
ہر گرہ لوہا بنی ہے شکرِ ناخن کیا کروں

سُنی سُنائی کہانیاں ہیں زبان کی خوش بیانیاں ہیں
وہ جانفشانی کہاں ہے باقی جو ہیں وہ بس گل فشانیاں ہیں
نہ تجربے کی فغاں کا سامع نہ ذوقِ عقبیٰ کا کوئی طامع
نئی نگاہیں نئے مناظر زمانہ ہے اور جوانیاں ہیں
یہ بُت ہیں بالکل ذلیل و احقر جنھیں بصیرت نہیں ہے اکبرؔ

انھیں سے ان کا غرور ہے یہ اُنھیں سے یہ لن ترانیاں ہیں

ہر گز نہ لچیں بے دینی سے اور شرک کی ضد پر تن جائیں
اللہ کے جتنے بندے ہیں ہے فرض کہ بھائی بن جائیں

اللہ و نبی کی مرضی ہے یعنی یہ مسلماں آپس میں
دشمن بھی جو ہیں وہ دوست بنیں روٹھے بھی جو ہیں وہ من جائیں

ہر چند کہ اُن پر تنگی ہو کتنا ہی ہوا کا رُخ بدلے
طاعت کو مقدم گردانیں اور نیک عمل پر ٹھن جائیں

انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں
متصل ہو سطحِ ظاہر سے یہ وہ باطن نہیں

قابلِ رُوپیش دانش مند یہ مضموں نہیں
ہر زباں ہر گفتنی کے واسطے موزوں نہیں

بے گانگی نہیں ہے بس اتنی دوستی ہے
میں اُن کو جانتا ہوں وہ مجھ کو جانتے ہیں

دیکھ کر مجھ کو وہ کہتے ہیں کہ 'اچھے تو ہے'
'زندہ ہیں سانس لئے جاتے ہیں اچھّے کیا ہیں'

خوب اکبر نے یہ اڑائی تان
دین ہے آنکھ اور مذہب کان

غم خانۂ جہاں سے آگاہ ہو چکا ہوں
داغوں سے دل بھرا ہے کتنوں کو رو چکا ہوں

کیا خوشی سے ہم آہ کرتے ہیں کیوں وہ ایسی نگاہ کرتے ہیں
پھیرتے ہیں نگاہ دنیا سے آنکھ کو رُو براہ کرتے ہیں

خوشی سے واہ کرتا ہوں نہ غم سے آہ کرتا ہوں محل حیرت کا ہے بس اللہ ہی اللہ کرتا ہوں
قناعت ہے مری دولت دیانت ہے مری عزّت نہ حرصِ مال رکھتا ہوں نہ فکرِ جاہ کرتا ہوں

دنیوی کاموں کے گو ہیں قاعدے قاعدوں کا قاعدہ کوئی نہیں
جو مشیّت اس کی ہے وہ قاعدہ بحث کیجے فائدہ کوئی نہیں

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں مارچ میں بلبل ہوں جولائی میں پروانہ ہوں
حال میرا پوچھتے ہیں کیا یہ مستقبل طلب کشتۂ ماضی ہوا ہوں صرف اک افسانہ ہوں

اب اپنے دِل کو بجز غم کے کوئی راہ نہیں خدا کا شکر یہی ہے کہ غم گناہ نہیں
اب اپنے دل کی عقیدت پہ رحم آتا ہے یہ دیکھتا ہوں کہ وہ آپ کی نگاہ نہیں
مرے سکوت پہ غصہ نہ کیجئے لِلّٰہ فغاں ہے جرم۔ خموشی تو کچھ گناہ نہیں

دن گزرتے ہی چلے جاتے ہیں لوگ مرتے ہی چلے جاتے ہیں
جانتے ہیں کہ یہ غفلت کے ہیں کام پھر بھی کرتے ہی چلے جاتے ہیں

چرخ سے کچھ اُمید تھی ہی نہیں آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأتِ عرضِ حال کیا ہوتی — نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں
اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا — کوئی ایسی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ" — جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
پوچھا اکبرؔ ہے آدمی کیسا — ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

جلوۂ ساقی و مے جان لئے لیتے ہیں — شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں
دل میں یاد اُن کی جو آتے ہوئے شرماتی ہے — درد اُٹھتا ہے کہ ہم آڑ کئے لیتے ہیں
دَورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا کفورِ نقاب — ہم بھی اب چاک گریباں کو سئے لیتے ہیں
خودکشی منع ۔ خوشی گم ۔ یہ قیامت ہے مگر — جینا ہی کتنا ہے اب ۔ خیر جئے لیتے ہیں

لذّتِ وصل کو پروانے سے پوچھیں عشاق
وہ مزا کیا ہے جو بے جان دیئے لیتے ہیں

دَیر میں عاشقوں پہ ظلم یہ ہے — بعد مرنے کے بھی جلاتے ہیں
جب تمہارا خیال آتا ہے — ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں
مجھ کو کچھ پوچھنا ہے اکبرؔ سے — یہ کبھی ہوش میں بھی آتے ہیں

بزرگیوں کے مقابلے میں فلک کے برچھے تنے ہوئے ہیں
یہی سبب ہے جناب اکبرؔ جو طفلِ ناداں بنے ہوئے ہیں

مرے اشعار رنگیں آپ کے سننے کے قابل ہیں
اسی گلزار کے ہیں پھول جو چننے کے قابل ہیں

فلک کی گردش سے آج ہم کیا خراب و خستہ بڑے بڑے ہیں
اُجڑ گئے ہیں مگر کریں کیا جہاں بسے تھے وہیں پڑے ہیں
نہ پائمالی سے ہے حفاظت یہ حِس و حرکت کی ہم میں طاقت
ہوئے ہیں سایہ اگر گرے ہیں بنے ہیں دیوار اگر کھڑے ہیں
حرم کی صف میں شریک ہو کر نماز پڑھنے کا شوق رخصت
بنانِ ترسا کی جلوہ گاہوں میں دست بستہ مگر کھڑے ہیں

چال دنیا کی تمہیں محسوس ہو دشوار ہے
یہ زمیں چلتی ہے تیزی سے مگر ہلتی نہیں
دل کے جو دشمن ہیں ان کے شوق میں رہتی ہے آنکھ
جان کا مالک جو ہے اس سے نظر ملتی نہیں

زندگی کہتی ہے دنیا سے تو اپنا دل لگا
موت کہتی ہے کہ ایسی دل لگی اچھّی نہیں
چاہتے ہو تم کسی کو چاہتا ہو وہ تمہیں
زندگی یہ ہے۔ نہیں تو زندگی اچھی نہیں

اس کی باتوں سے سمجھ رکھا ہے تم نے اُسے خضر
اس کے پاؤں کو تو دیکھو کہ کدھر جاتے ہیں

اُٹھے تو بہت ہیں بہرِ مدد اس پر بھی تو لیکن غور کرو
شیطان کے حامی کتنے ہیں اللہ کے پیارے کتنے ہیں

اُن کے دل میں جو کچھ آتا ہے وہ کہہ جاتے ہیں
ہم بھی سُن لیتے ہیں منہ دیکھ رہ جاتے ہیں

کھانے پینے سے جو ہوتی زندگی مرتا ہی کون ۔۔۔ سچ یہ ہے زندہ فقط اللہ کی مرضی سے ہُوں

خدا کی یاد میں دنیائے دوں سے منہ جو موڑے ہیں ۔۔۔ وہی انسان اچھّے ہیں مگر افسوس تھوڑے ہیں

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں ۔۔۔ لہ عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

گم ہیں نظر سے نورِ حقیقت کی ہستیاں ۔۔۔ اندھیر ہیں جو اس کی ظاہر پرستیاں

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں ۔۔۔ آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے ۔۔۔ وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

دہر نے نشترِ غم دل پہ مرے مارے ہیں ۔۔۔ شعر رنگیں یہ نہیں خون کے فوّارے ہیں

فلسفی تجربہ کرتا تھا ہُوا میں رخصت ۔۔۔ مجھ سے وہ کہنے لگا آپ کدھر جاتے ہیں
کہہ دیا میں نے ہوا تجربہ مجھ کو تو یہی ۔۔۔ تجربہ ہو نہیں چکتا ہے کہ مر جاتے ہیں

دلِ بیتاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم ۔۔۔ یہ پُرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانے میں

لہ اس شعر پر ڈاکٹر اقبال نے انگریزی میں ایک آرٹیکل لکھا ہے اور فلاسفر ہیگل پر اس طرزِ بیان میں مصنّف کو ترجیح دی ہے۔

اوروں پہ جب ہے وعظ تو یہ پہلی صدی میں ہیں
اپنی غرض ہے جب تو نئی جنتری میں ہیں

ستم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں
یہ اُن کی بدگمانی ہے کہ فریادی سمجھتے ہیں

آج جو کفر سے مصروف ہیں سرگوشی میں
ہوش آئے گا انھیں موت کی بے ہوشی میں

عشق پاتا ہی نہیں موقعِ فریاد بجا
حُسن کو دخل بہت کچھ ہے ستم پوشی میں

ہمارے باغ میں پیڑ اب کہاں مالی لگاتے ہیں
انھوں نے بھی تو دیکھا یہ فقط ڈالی لگاتے ہیں

ہمارے دم سے تابندہ مُجّوں کے بالے مُندے ہیں
ہمیں نے اُن کو چمکایا ہمیں دوزخ کے کُندے ہیں

بس اللہ اللہ ہی بہتر ہے اللہ کے وعدے سچے ہیں
نبیوں ہی کی باتیں پکی ہیں سو وقت کے لیڈر کچے ہیں

مستیٔ موسم میں کہتا ہے پپیہا پی کہاں
سب یہی کہتے مگر ہر اک نے ایسی پی کہاں

فلک مشّاق ہے پیہم نئی دُنیا بسانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

دوستوں کے ساتھ اگلی گرم جوشی اب کہاں
خونِ دل پینا پڑا ہے بادہ نوشی اب کہاں

باغباں کانٹوں میں الجھانے کا رکھتا ہے خیال
صحنِ گلشن میں بہارِ گُل فروشی اب کہاں

فوجِ خدا نہیں تو دُعا ہی کے ساتھ ہیں
ملتے نہیں نبی تو خدا ہی کے ساتھ ہیں

تم بہتری کی فکر کرو بزمِ غیر میں
عزلت میں ہم تو اپنی تباہی کے ساتھ ہیں

دل وہ ہے جو فریبِ نظر کو سمجھ سکے
آنکھیں وہ ہیں جو ژرف نگاہی کے ساتھ ہیں

ترکِ وفا کے ہو گئے عازم نیاز مند
حضرت ہنوز ناز و ادا ہی کے ساتھ ہیں

علمی ترقیوں سے زباں تو چمک گئی
لیکن عمل فریب و دغا ہی کے ساتھ ہیں

* * *

میکدے میں رہ کے ہم تقویٰ کو راضی کیا کریں
محتسب کی جب قضا آجائے قاضی کیا کریں

حال ہی سے لے مدد یا حیُّ یا قیّومُ پڑھ
ہسٹری تو ہو چکی ایّامِ ماضی کیا کریں

* * *

زبانیں شاخِ طوبےٰ اور دل غفلت کے تھالے ہیں
بہت ہے اللہ اللہ کم مگر اللہ والے ہیں

* * *

اُمید دل میں نہیں سانس ہی ہے سینے میں
مجھے تو اب کوئی لذت نہیں ہے جینے میں

* * *

جوششِ خاطر کو سبیلِ حق نما ملتی نہیں
جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں

* * *

کون پا سکتا ہے مکروہاتِ دنیا سے نجات
زندگی جب تک ہے جھگڑے زندگی کے ساتھ ہیں

* * *

درد تو موجود ہے دل میں دوا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

جھومتی ہے شاخِ گل کھِلتے ہیں غنچے دمبدم
با اثر گلشن میں تحریکِ صبا ہو یا نہ ہو

وجد میں لاتے ہیں مجھ کو بلبلوں کے زمزمے
آپ کے نزدیک با معنےٰ صدا ہو یا نہ ہو

کر دیا ہے زندگی نے بزمِ ہستی میں شریک
اس کا کچھ مقصود کوئی مدّعا ہو یا نہ ہو

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہمنشیں
اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو
ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی
قوم کی حالت میں کچھ اس سے جِلا ہو یا نہ ہو
معترض کیوں ہو اگر سمجھے تمہیں صیّاد دل
ایسے گیسو ہوں تو شبہ دام کا ہو یا نہ ہو

غم میں ہوتا ہی ہے کچھ امیّد فردا سے سکون
وائے بر حالش جسے امیّد فردا بھی نہ ہو
محترز فریاد سے ہوں زیرِ لب کرتا ہوں آہ
آپ کی مرضی یہ ہے شاید کہ اتنا بھی نہ ہو
رہ گئے وہ پوچھ ہی کر جس کو اُس کو ہے گِلا
اس کے دل سے پوچھئے جس کو کہ پوچھا بھی نہ ہو

حالِ دل کس سے کہوں پوچھنے والا بھی تو ہو
کن امیدوں پہ جیوں کوئی سہارا بھی تو ہو
سب کے کھنچنے کے نہیں عالمِ دل کے نقشے
کبھی گزرے ہوں اُدھر سے کبھی دیکھا بھی تو ہو
دل ہی باقی نہیں لے دوست مضامیں کیسے
آپ موتی کے طلب گار ہیں دریا بھی تو ہو
بندگی میں تو ہے وہ لطف جو شاہی میں نہیں
دل سے کوئی مگر اللہ کا بندہ بھی تو ہو
کون کہتا ہے جنوں میں مجھے کامل اکبرؔ
مگر انصاف کہے گا کوئی اتنا بھی تو ہو

اڑا جاتا ہے رنگِ عاشقی گلزارِ دنیا سے
عجب کیا بلبلِ تصویر بھی اک روز عنقا ہو

اگر مِلا نہیں ملنے کا آسرا ہے تو
ہمیں اسی میں ہے تسکینِ دل خدا ہے تو
اجل کو دیکھ کے زیرِ فلک قرار آیا
مصیبتوں کی بالآخر اک انتہا ہے تو

چھٹویں صدی کی بدیاں کب تک گِنا کرو گے
تم بیسویں صدی کی نیکی کا جائزہ لو

نیّت کو اپنی دیکھو اعمال اپنے جانچو　　دوزخ بنو نہ سب پر جنّت کا راستا لو

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ　　مایوس نہ ہو دُعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں　　مَرتے مَرتے ادا کئے جاؤ
سمجھو یہ وقتِ امتحاں ہے　　ہوں بھی جو ستم وفا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقتِ بے حجابی　　تم پَیروی حیا کئے جاؤ
اُمیّدِ شفا خدا سے رکھّو　　کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ

یہ نہیں کہتا کہ ایسا ہی ہو اور ایسا نہ ہو　　یہ دُعا ہے ان حوادث کی مجھے پروا نہ ہو
دل امیّد و بیم فردا سے نہ ہو زیر و زبر　　ہے یہی کافی۔ حصولِ مدعا ہو یا نہ ہو

ہرگز نہ سمجھ مستقل اس انقلاب کو　　رکھ راہ راست بھونکنے دے اِن کلاب کو

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو　　جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
دل بھی حاضر سرِ تسلیم بھی خم کو موجود　　کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو
دل تو بے چین ہے اظہارِ ارادت کے لئے　　کسی جانب سے کچھ اظہارِ کرامات تو ہو
دلکشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں　　باطن افروز کوئی پیرِ خرابات تو ہو
گفتنی ہے دلِ پر درد کا قصّہ لیکن　　کس سے کہیئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو
داستانِ غمِ دل کون کہے کون سُنے　　بزم میں موقع اظہارِ خیالات تو ہو
وعدے بھی یاد دلاتے ہیں گلے بھی ہیں بہت　　وہ دکھائی بھی تو دیں اُن سے ملاقات تو ہو
عدمِ نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد　　وقت بالیدگیٔ نخل و نباتات تو ہو

کوئی واعظ نہیں فطرت سے بلاغت میں سوا
مگر ان میں کچھ فہمِ اشارات تو ہو

بابو صاحب کا ہے یہ شکوہ افلاس بجا
سچ تو کہتے ہیں کہ مچھلی نہ سہی بھات تو ہو

نظر اللہ پہ رکھ ہو نہ پریشاں اکبرؔ
لے مصلّٰے کو ذرا صرف مناجات تو ہو

قوّتِ نشو و نما اس میں بھی ہے اُس میں بھی ہے
خواہ شاخِ پُرثمر ہو خواہ شاخِ بید ہو

وہ ملے اکبرؔ سے دنیا جس کے دل پر سرد ہو
عیش و آز کا طلبگار اس کا کیوں ہمدرد ہو

پھول جب کھلا گیا پھر کیا تکلّف کی اُمنگ
ہم بغل اس سے ہوا ہو یا چمن کی گرد ہو

جب بہار آئی تو ہر رنگ اپنی شوخی میں ہے مست
ہر گُلِ رنگیں ہے دلکش سُرخ ہو یا زرد ہو

پاؤں پھیلاؤ نہ اتنا بے خطر اے خودسرو
خوفِ حق کم ہے تو قانونِ فنا ہی سے ڈرو

قابلِ دریافت رازِ ہستیٔ پروانہ ہے
کیوں اسے یہ حکمِ فطرت ہے جلو تڑپو مرو

خودکشی کی ہم تمھیں دیتے نہیں اکبرؔ صلاح
لیکن اپنی زندگی دُنیا پہ ظاہر کیوں کرو

میں تو اُٹھتا ہوں توکّلتُ علی اللہ کہہ کر
نہیں ہوتا جو کوئی میرا مددگار نہ ہو

ذِلّت و رنج کا خوگر مجھے کر دے لے حرص
یا ضرورت سے زیادہ کی طلب گار نہ ہو

ایسی بزموں سے جو پھل پانے کی رکھتا ہے اُمّید
کیا شجر سمجھا ہے اُس نے برگ کے انبار کو

ترکیبِ دعا کے لئے پیروں کے ہو پیرو
جب وقتِ دُعا ہو تو خدا ہی کو پکارو

لے یہ شعر برنی صاحب احمد آبادی کے نام خط مورخہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء میں نے پایا۔

(چوہدری) نذیر احمد خاں

محفوظ ہو شرک سے ہادی کو بھی مانو　　میرا تو یہی قول ہے سُن لو اِسے یارو

یہ چاہتا ہوں طبیعت کو انتشار نہ ہو　　کسی پہ بار نہ ہوں کوئی مجھ پہ بار نہ ہو

یہ کیا غرور ہے کہ ہمیشہ بڑے رہو　　کہتا ہے اب یہ چرخ کہ کھاد پڑے رہو
اے شیخ ہم ہیں خوش جو رہو تم ہمارے پاس　　مشکل ہے یہ مگر کہ کہیں بے لڑے رہو
ممتاز راستی سے ہوئے ہیں چمن میں سرو　　یہ بھی مگر ہے حکم کہ یونہی کھڑے رہو

بے مثل بلیغ اس کو سمجھو　　فطرت کی زبان حِس کو سمجھو

با اثر قوّت عمل کی تنو میں ہو یا دس میں ہو　　سب سے پہلی شرط یہ ہے اتفاق آپس میں ہو

اٹھ جاؤں سامنے سے جو کچھ شک ہو آپ کو　　آئینہ اور حُسن مبارک ہو آپ کو

بارِ دل پاتا ہوں اپنی ہستیٔ غمناک کو　　حِسِّ لذّت سے ہی پاس اب قوّتِ ادراک کو
بے تمیزی حِس کی ہے اور نقش محسوسات ہے　　دیکھتا ہے کون حُسنِ صفحۂ ادراک کو
طالبِ دُنیا نسیمِ عشق سے بیگانہ ہے　　نفس سے کیا واسطہ ایسی ہوائے پاک کو

ہر لحظہ ہی جس کی یاد تمہیں ہے جس کا خیال اتنا دل کو
دیکھو ہی گے اے اکبر اک دن اس ماضی کے مستقبل کو

ذرّوں کو ملا کر ذرّوں سے صنّاعی کی عزّت پاتے ہو تم

کس درجہ کا حق حاصل ہے انھیں جو دل میں ملاتے ہیں دل کو

قاصد ملا جب اُن سے وہ کھیلتے تھے پولو — خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو
روٹی ملے جو سُکھ سے کافی ہے اللہ اللہ — ظلمت کدہ ہے دُنیا ہر شے کو کیوں ٹٹولو

شوقِ تجلی سے ہوا تیز ہے کامل بھی تو ہو — دل کی تاثیر میں کیا شک ہے مگر دل بھی تو ہو
نازِ دنیا کا اٹھانے کی ضرورت تسلیم — طبعِ نازک کو کروں کیا متحمّل بھی تو ہو

ہسٹری کی کیا ضرورت دین کی تعلیم کو — انجم و شمس و قمر کافی تھے ابراہیمؑ کو
انتظام و قبضۂ دنیا نہیں ہے جب سپرد — گوشِ دل پھر کیوں سُنے غوغائے ہفت اقلیم کو
جس نے چھوڑا شوقِ جاہ و مال میں ذکرِ خدا — وہ حقیقت میں اٹھا شیطان کی تعظیم کو
رشک وہ ہے اتحادِ ذرہ ہائے گردِ باد — ایک ساتھ اُٹھے ہوائے دہر کی تعظیم کو
مجلسِ نسواں میں دیکھو عزّتِ تعلیم کو — پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

چھاپے کی تقویت پر لیڈر نہ ہونہ اکبرؔ — اپنی بساط دیکھو اپنا مقام دیکھو
اُن کا مرا تعلّق ہے اس سے صاف ظاہر — اُن کا اشارہ دیکھو میرا سلام دیکھو

قاعدوں میں حُسنِ معنی گم کرو — شعر میں کہتا ہوں ہجّے تم کرو

حدیث و فقہ پڑھ کر شیخ بننا خوب ہے لیکن
زمین و آسماں کو دیکھ کر پہلے مسلماں ہو

ساتھی ملے جب ایسے نازک خیالیاں کیا　　سینا ہے جب گزی کا سوئی مہین کیوں ہو

یوں جلد نہ رخصت ہو جو گل باغ سے چن لو　　انصاف یہ کہتا ہے کہ بلبل کی بھی سن لو

دنیا میں مصیبت جانا ہی ہر اک نے اجل کے آنے کو　　ہم نے تو تماشا سمجھا ہے اس بھیڑ میں گم ہو جانے کو

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو　　ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد　　آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

جہاں کی بات ہو اکبر اسے جا کر وہیں دیکھو　　عوض اخبار کے تم صفحۂ روئے زمیں دیکھو

کسی کو بھی کسی سے کچھ نہیں اس باب میں جھگڑا　　کرو تم دھیان پرمیشر کا دل کو اسکا درشن ہو
مگر مشکل تو یہ ہے نام سب لیتے ہیں مذہب کا　　غرض لیکن یہ ہوتی ہے جتھا ہو اور بھوجن ہو

نور عبرت سے منور ہیں دل و چشم و دماغ　　آپ تاریک نہ سمجھیں مرے ویرانے کو

دل پہ مشکل کر دیا دنیا نے اب تمکین کو　　سہل کر مجھ پر الٰہی اپنے سچے دین کو

دل وہ اچھا ہو جو محو چشم یار　　شعر وہ اچھا کہ جس پر صاد ہو

جو اصل کار دیں ہے وہ فقط وحدت فقط اک ہو　　مذاہب کے بہت جانچا بس اپنے منہ میاں مٹھو

جو سمجھی بات تھی کہہ دی وہ میں نے دو ہی مصرعوں میں   پڑھیں اب اپنی تصنیفوں کو لاکر بیر و حشو

خوب یہ بات کہی اُس نے پکارو اُس کو   بد دعا سانپ کو کیا دیتے ہو مارو اُس کو

جس صحبت کے تم اہل نہ ہو   اُس صحبت میں شرکت نہ کرو

خوب لڑوایا بہم دِل کھول کر   مار ڈالا راویوں نے قوم کو

نہیں مزا صرف اسی میں اکبر کہ قافیوں کی روا روی ہو
غزل اگر ہو تو عاشقانہ جو مثنوی ہو تو معنوی ہو
کہو یہ اکبر سے بیٹھ چپکا حرم کے اندر خدا خدا کر
ہر ایک کا یہ مشن نہیں ہے کہ دیرِ دنیا میں غزنوی ہو

شرک چاہے بہائے میرا لہو   میں نہ چھوڑوں گا لاشریک لہٗ

خو تحمل کی بہت خوب ہے لیکن انساں   ظلم کو ڈھونڈ کے اُس کا متحمّل کیوں ہو

تابع ہوں ہادیانِ طریقِ صواب کا   لیکن طلب کروں گا خدا کی پناہ کو
اِس کے خلاف آپ کی بحثیں ہیں نادرست   فرمائیے چراغ کو دیکھوں کہ راہ کو

نامِ خُدا زبان پہ گو ہے دُعا کے ساتھ   ممکن نہیں خیالِ خُدا ماسوا کے ساتھ

اِس دیرِ بے ثبات میں اللہ کو نہ بھول
بدلا نہ کر بتوں کی نگاہ و ادا کے ساتھ
اظہارِ وجد کے لیے محفل کی کیا تلاش
بن خاک راہ ناچ لیا کر ہوا کے ساتھ
وہ بت کرم کے ساتھ ہو یا ہو جفا کے ساتھ
ہم ہیں خدا کے ساتھ رہیں گے خدا کے ساتھ

سن لیجے بس یہ چند الفاظ۔ کہنا مجھکو نہیں ہے اب کچھ
ہر اک کو ہے صبر کی ضرورت۔ کوئی نہیں جو پائے سب کچھ

عیش دنیا کا رہے شوق سے اغیار کیساتھ
دِل مرا شاد ہے سینے میں غمِ یار کے ساتھ
کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے
رہیئے کچھ روز کسی محرمِ اسرار کے ساتھ

مادّہ ہی نہیں الفت کا بُتِ بے دین میں
مجھ کو کچھ رشک نہیں ہے وہ رہے غیر کے ساتھ

بڑھا تا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
لئے جاتی ہے پیری سُوئے گور آہستہ آہستہ
تمہاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھ کو
سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ

سینہ پُر غم ہے دِل کے چُور کے ساتھ
ہنس رہا ہوں مگر حضور کے ساتھ
مرا احسان کیوں نہ ہو مغموم
شکر ادا کرتے ہیں غرور کے ساتھ
خضر تو رہبری کو تھے موجود
راہ چل دی مگر حضور کے ساتھ
سونے جاتے ہیں قبر میں اکبر
اب اٹھیں گے صدائے صور کے ساتھ

کیا جلوے ہیں اس کے پیشِ نظر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ ارض و سماں یہ شمس و قمر سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر آن کا ہے اک رنگ نیا ہر رنگ کی ہے اک شان جُدا
وحدت کا شجر کثرت کے ثمر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ زمزمہ ہائے مُرغِ چمن یہ نشو و نما سے سرو و سمن
یہ سبزۂ و گل یہ سنبلِ تر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ ابرِ رواں یہ برقِ تپاں یہ پرتوِ انجم نور فشاں
یہ پردۂ شب یہ حُسنِ سحر سبحان اللہ سبحان اللہ
اس درجہ ترقی خاک کو دی وہ ہوش میں آکر شوق بنی
اس شوق کا خود منظورِ نظر سبحان اللہ سبحان اللہ
بس جائیگی اس میں سانس تری ہو جائیگا تو پاکیزہ نفس
دن رات کہا کر اے اکبرؔ سبحان اللہ سبحان اللہ

اکبرؔ اس فطرت خاموش کو بے حس نہ سمجھ
ہاں بصیرت سے تہی دیدۂ نرگس نہ سمجھ
راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ
امتحاں گاہ کو تو عیش کی منزل نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ
خاتمہ جس کا ہو افسوس اُسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حُسنِ عمل
بہر انجام یہ امرت ہے اسے بس نہ سمجھ
دل کا دُنیا کی اُمیدوں سے بہلنا ہی بُرا
زندگی تلخ کریں گی انہیں مونس نہ سمجھ

خدا سے غافل اور اس پر یہ نعمتِ دُنیا
اُسی کی شان ہے احسان ناسپاس کے ساتھ
کہاں جہنّم و جنّت کہاں عذاب و ثواب
دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

قدم بہت نہ بڑھا غیر کے قیاس کے ساتھ   وہ خوب ہی جو رہے اپنے ہی حواس کے ساتھ

انسان نے انسان سے کی جنگ، ہمیشہ   دنیا کے نظر آئے یہی رنگ ہمیشہ

دنیا میں لطف زیست ہے طولِ امل کے ساتھ   پیری میں اب کہاں وہ خیالِ اجل کے ساتھ

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ   کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

جویائے رازِ حُسنِ ازل سے کہے کوئی   سُن صوتِ سرمدی کو کلام مبیں کو دیکھ
ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ   معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

گو سانس چل رہی ہے خوں اب نہیں جہندہ   مشرق بہ دستِ مغرب مردہ بدست زندہ

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ   ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ
کون جانے یہ قبر ہے کس کی   نام رہتا نہیں نشان کے ساتھ
آپ گنوائیں شہد و شیر و کباب   یاں نمک بھی نہیں ہے نان کے ساتھ
اس زمانے میں غیرتِ ملت   رہتی ہے جان کی امان کے ساتھ

جو یہ سچ ہو کہ جو چاہوں وہی ہو   تو چاہوں گا وہی ہونا ہے جو کچھ
ہنساتے ہیں وہ کیوں غیروں کو مجھ پر   یہی رونا ہے اب رونا ہے جو کچھ

کچھ پتا اللہ کی مرضی کا پا جائے گا تو　　حالتِ موجودہ کا کیا اقتضا ہے اس کو دیکھ

لاکھ نظریں میں دکھاؤں کہ جو ہیں جانبِ بُت　　ایک دل آپ دکھا دیں جو ہو اللہ کے ساتھ
تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست　　تیری تو کچھ نہ ترقی ہوئی تنخواہ کے ساتھ

عاشق کی طبع لاکھوں ہی موجوں میں ہے رواں　　الفاظ کر سکیں گے نہ اُن کا محاصرہ
اے عقل اعتراض سے کچھ فائدہ نہیں　　کیوں کرتی ہے زبان سے دل کا مقابلہ

ایں سخن مقبول اہل دل بُود ہر آئینہ　　بے خودی در سجدہ جا خواہد خودی در آئینہ

کیا ہے جس نے اس عالم کو پیدا اس کو کیا کہیئے　　خرد خاموش ہے اور دل یہ کہتا ہے خُدا کہیئے
اسی حیرت میں عمریں کٹ گئیں اربابِ بینش کی　　کسے اللہ کہیئے اور کس کو ماسوا کہیئے
سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیئے اُن کی　　اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیئے
مری قرآن خوانی سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت　　مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدّعا کہیئے
یہ اُن کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے　　مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دُعا کہیئے

نئی ترکیب اب شیطان کو سُوجھی ہے اغوا کی
خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو بُرا کہیئے

اگر میں ہوں تو سب کچھ ہے جو تُجھ سے ہے تو جھگڑا ہے　　اِسی مَیں کی خبر لینا ہے کچھ ہے بھی کہ دھوکا ہے

جو روز افزوں نہیں ترکِ تعلّق آپ کا اکبرؔ
تو پھر یہ شاعری کیا واہ وا کا اک تماشا ہے

معاذ اللہ دورِ چرخ کیا کیا رنگ لاتا ہے — جنھیں آتا تھا ہم پر رشک اب ان کو رحم آتا ہے
نسیمِ صبح اور کلیاں تو دیکھیں اس گلستاں میں — ہم ایسے دل گرفتوں کو بھی یاں کوئی بناتا ہے

طبع پر عبرت کی بدلی ایک دن چھا جائے گی — شوخیٔ برقِ فنا اُن کو بھی تڑپا جائے گی
دِل نئے ہیں اور تمنائیں ابھی کم عمر ہیں — رفتہ رفتہ نوجوانوں کو سمجھ آجائے گی

شادی کی کیا خوشی ہے غم کا بھی رنج کیا ہے — وہ بھی تھی ایک بجلی اور یہ بھی اک ہوا ہے
آنکھوں نے خوب دیکھا اور دِل نے خوب سمجھا — کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ اللہ کے سوا ہے
معنی کا آئینہ ہے اکبر کا یہ لطیفہ — ہنسنا بھی اِک مرض ہے رونا بھی اِک دوا ہے

ایک پاتا ہے ایک کھوتا ہے — ایک ہنستا ہے ایک روتا ہے
سارے اسباب ہیں اسی کے مطیع — جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے

دِل کو جنبش نہیں چلتی ہیں زبانیں بے سود — بے عمل علم کی تکرار سے کیا ہوتا ہے
جب قدم راہ طلب میں نہ بڑھے اے اکبر — بیٹھ کر پاؤں ہلانے کا نتیجہ کیا ہے

میں نے تو اپنے دل کو روکا ہے — آپ کو بھی کسی نے ٹوکا ہے

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر — ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

عام الزام ہے اکبر پہ کہ پیتا ہے کیوں
اس کی پرسش نہیں ہوتی کہ یہ کھاتا کیا ہے

خدائی تیری ہے ہم بھی ہیں اے خدا تیرے
مصیبتوں میں پُکاریں کسے سوا تیرے

گزری بہار پھول تماشا دِکھا گئے
آنکھیں کھُلی ہی رہ گئیں کیا آئے کیا گئے

اکبر جگر افگار ہے رسوا بھی بہت ہے
عزّت کے لئے عشق میں اتنا بھی بہت ہے
مطلوب نہیں زینتِ دُنیا کا نظارا
اب دیکھ بھی سکتا نہیں دیکھا بھی بہت ہے

نشانِ ظلم مٹا دے مجھے مٹا کے فلک
خدا کے علم کو کیوں کر مٹا سکے گا کوئی
وہ مستغیثوں کی سُننے کو آئے تیغ بہ کف
بھلا زبانِ شکایت ہلا سکے گا کوئی

بادو باراں مدد کریں جس کی
وہی پودا یہاں پنپتا ہے
ہر طرف سے جو ٹوٹتی ہے آس
آدمی ہر کا نام جپتا ہے
گرمیٔ موسمِ شباب اُف اُف
یہ سمجھیے کہ جیٹھ تپتا ہے
فُرقتِ دائمی معاذ اللہ
آدمی مدّتوں تڑپتا ہے
لو نکلنا پڑا اسٹرک کے ساتھ
آج تو میرا گھر بھی نپتا ہے

عبث اس زندگی پر غافلوں کا فخر کرنا ہے
یہ جینا کوئی جینا ہے کہ جس کے ساتھ مرنا ہے
جو مستقبل کے شائق ہیں انھیں انجمن مبارک ہو
ہمیں تو صرف اب گزرا زمانا یاد کرنا ہے
گُلِ پژمردہ سے غنچے کو ہمدردی نہیں ممکن
ابھی تو اس کو کھِلنا ہے ابھی اس کو سنورنا ہے
مرا دل مجھ سے کہتا ہے مرے سینے میں اے اکبر
تعجب ہے کہ رہنا سہل ہے مشکل ٹھہرنا ہے
خدا جانے وہ کیا سمجھے کہ بگڑے اس قدر مجھ پہ
کہا تھا میں نے اتنا ہی مجھے کچھ عرض کرنا ہے

فطرت میں کہاں وہ شکلیں ہیں جو وہم دکھا دیتا ہے کبھی
فطرت ہی کا جزو اک وہم بھی ہے دل یہ بھی سکھا دیتا ہے کبھی

جہاں کے حادثوں پر اک نہ اک وتاہی رہتا ہے
مگر جو اقتضا فطرت کا ہے ہوتا ہی رہتا ہے

نہ کھول آنکھ کسی عکس بے بقا کے لئے — صفائے دِل پہ نظر رکھ فقط خدا کے لئے
رضا کی شرط یہی ہے کہ کچھ طلب نہ کرو — دُعا سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں میں خدا کے لئے

اے بتو کیا میں بتاؤں مجھے کیا آتا ہے — بس تمہیں سچ سمجھنے میں مزا آتا ہے

کانپ جاتا ہوں جو سُنتا ہوں کسی سے زندہ باش — بعد اس غم کے مرا جینے سے ڈرنا دیکھئے
رنج دینے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے حریف — حضرتِ اکبرؔ کا اس پر کچھ نہ کرنا دیکھئے

شیخ جی کی نظر میں میں ہوں فقط — میری نظروں میں ساری دنیا ہے
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبرؔ — مجھ کو حیرت ہے ان کو غصّا ہے

ایک جمتا ہے ایک پگھلتا ہے — کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دِل تعلق بڑھا کے پچھتایا — پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

غفلت کی ہنسی بھی خوب ہنسا اور رنج میں اکثر رویا بھی

دنیا کو بہت کچھ اے اکبرؔ حاصل بھی کیا اور کھویا بھی

حقیقت زیست کی پیری میں ہم سمجھے تو کیا سمجھے
بڑا دھوکا دیا ظالم نے دُنیا سے خدا سمجھے

ہزار آرائشیں صدقے ہیں اس کی سادہ وضعی پر
نہیں محتاجِ فیشن علم نے جس کو سنوارا ہے

کُھلتی نہیں کوئی راہِ عمل اور وقت گزرتا جاتا ہے
اُلجھی ہوئی ہے غفلت میں زباں اور دل ہے کہ مرتا جاتا ہے

مایوسی نے محفوظ کیا امیدوں کی بیتابی سے
اب اشک بھی تھمتے جاتے ہیں اور دل بھی ٹھہرتا جاتا ہے

خدا کا نام روشن ہے خدا کا نام پیارا ہے
دِلوں کو اس سے قوّت ہے زبانوں کو سہارا ہے
خدا ہی ہے زمین و آسماں کا خالق و مالک
اسی کی قدرت و صنعت نے عالم کو سنوارا ہے
تماشا اس کی قدرت کا ہے برّ و بحر میں ہر دم
اِدھر موجیں ہوا کی ہیں اُدھر پانی کا دھارا ہے
اُسی کے حکم سے ہے رات دِن کی یہ کمی بیشی
اسی کے حکم کا تابع فلک پر ہر ستارا ہے
اُسی کے حکم سے پھل اور غلّے کی ہے پیدائش
زمیں پر بدلیوں سے اس نے پانی کو اتارا ہے
اُسی کے انتظام و حکم سے موسم بدلتے ہیں
وہی ہے وقت پر جس نے ہواؤں کو ابھارا ہے
زمیں پر سبزہ و گل کی نمودیں کیسی پیاری ہیں
فلک پر چاند سورج کا بھی کیا دلکش نظارا ہے
کوئی ذرّہ نہیں عالم میں اس کے علم سے باہر
جو مرضی اُسکی ہے دخل اس میں دیکھ کسکو یارا ہے
وہی دنیا میں ہے اس زندگی و موت کا خالق
ہر اک کو اپنی مرضی سے جلایا اور مارا ہے
دو روزہ زندگی ہے جاہ و حشمت پر نہ ہو غافل
فریدوں ہے نہ کیخسرو سکندر ہے نہ دارا ہے

یہ جب تک سانس چلتی ہے سمجھتے ہو ہمیں ہم ہیں — اجل جب سر پہ آپہنچی تو پھر کیا بس ہمارا ہے
کرو طاعت خدا کی بس وہی معبود برحق ہے — اسی کی شان یکتائی جہاں میں آشکارا ہے
اگر اعمال اچھے ہیں تو پاؤ گے بڑے درجے — سمجھ لو امتحاں اس دارِ فانی میں تمہارا ہے

بزرگوں کا ادب اللہ کا ڈر شرم آنکھوں میں
انھیں اوصاف کی نسبت مذاہب میں شمارا ہے

فقیروں ہی کی سبھا ہے بہتر جو مستمند ہے یہی جتھا ہے
ہمارے صوفی کا رنگ اچھا کہ وجد ہے اور برہم کتھا ہے

وہ اس کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے — اس اونٹ کو خرِ عیسٰے بنا کے چھوڑیں گے
کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل — شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے
کہا یہ شیخ سے اکبر نے روک اپنی زباں — کہ تجھ کو بھی وہ مجھی سا بنا کے چھوڑیں گے

فریب امواجِ بحرِ ہستی سکھا ہی دیتا ہے خود پرستی — ہوا نے دم بھر جو کی لگاوٹ حباب بھی سر اٹھا رہا ہے

نظر وہ ہے جو دل پر نقشِ حسنِ مدعا کھینچے — نفس وہ ہے کہ جو سینے سے آہِ بکا کھینچے
وہ جان اچھی جو مستِ وعدۂ دیدارِ فردا ہو — وہی دل خوب جو یہ انتظارِ جانفزا کھینچے
محبانِ الٰہی خلق سے نخوت نہیں کرتے — کھنچے بندوں سے کیوں اپنی طرف جسکو خدا کھینچے
نہ چھوڑا صفحۂ روئے زمیں تعمیرِ غفلت نے — ہزاروں نقشِ عبرت گو فلک نے جا بجا کھینچے

حرم میں دم بخود بیٹھا تو اکبر نے کیا اچھا
وہ کیوں بے سود بتخانے میں آہِ نارسا کھینچے

نگاہ اٹھی ہے احساسِ ماسوا کے لئے کہاں ہے دل اسے رو کے ذرا خدا کے لئے
رواں ہو کارِ جہاں کیوں ہماری مرضی پر خدا ہمارے لئے ہے کہ ہم خدا کے لئے
عمل خدا کے لئے ہو تو اُس کا کیا کہنا مگر ریا یہ بُری صرف واہ وا کے لئے

شبِ تاریک غفلت میں جو خوفِ حق سے روتا ہے وہ گویا اپنی زلفِ سعی میں موتی پروتا ہے

متاعِ حسنِ یوسف ہی نہ وہ شوقِ زلیخا ہے ریا کی گرم بازاری زبردستی کا سوَدا ہے

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے غلط الزام بس اَوروں پہ لگا رکھّا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

خزاں آتی ہی ہے اور خاک میں ملنا ہی پڑتا ہے مگر کلیوں کو اِس گلزار میں کھلنا ہی پڑتا ہے
جگر کو زخم سے زخموں کو آہوں سے بچاتا ہوں مگر ہوتے ہی ہیں زخم اور انھیں چھلنا ہی پڑتا ہے
فنا کے زنگ سے دل خون ہوتا ہی مگر اکبرؔ زباں کو واہ کرنے کے لئے ہلنا ہی پڑتا ہے

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

خاصانِ حق کو حشر میں کیسی شکایتیں عالم ہی دُوسرا ہے وہ دُنیا نہیں رہی
ایسے ہُوئے ہیں محوِ تماشائے حُسنِ دوست دشمن سے انتقام کی پروا نہیں رہی

طبیعت سے خیالاتِ غم افزا جا نہیں سکتے بُرا ہو حافظے کا داغِ دل مُرجھا نہیں سکتے

فلک کیا اس چمن میں جوشِ دل کا مجھ سے طالب ہے ، کہ شاخیں ہل نہیں سکتیں عنادل گا نہیں سکتے

کس طرح کہتا کہ جو چاہوں وہ ہونا چاہیئے کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا چاہنا کیا چاہیئے
کہہ دیا میں نے کہ ہوں اور یہ نہیں سمجھا کہ کیا اس خودی کا حشر کیا ہوتا ہے دیکھا چاہیئے

کیا اثر اس پہ مرا ہوگا یہی رونا ہے یہ تو ظاہر ہے مرے بعد بھی کچھ ہونا ہے

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے اچھا سمجھتا ہے تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

حرصِ دنیا سے نہیں ہر صاحبِ عزلت بری خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے
مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

شکم پرور ہنر تو باپ سے بیٹے تک آتا ہے مگر انسان بننا یہ فرشتہ ہی سکھاتا ہے

خدا ہی ہے نہیں اس کے سوا حاجت روا کوئی خلاف اس کے جو ہو مشرک ہی میں ہیں تم ہو یا کوئی

ہر وقت ہے جس پر غم طاری ہر روز جسے عاشورا ہی سمجھا ہے وہی معنی عزا ایمان اسی کا پورا ہے

گورنسل اپنا کام کرتا ہے شیر بھی موت ہی سے مرتا ہے

بس یہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

اب رہی بحث رنج و راحت کی — یہ فقط وقت کا گزرنا ہے
سب سے بدتر بتوں سے ہے امید — سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے
گُل سے پوچھو کس انتظار میں ہے — غنچے کو تو ابھی سنورنا ہے
نشہ جن کو چڑھا ہے نخوت کا — ان کے چہروں کو بھی اترنا ہے

یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہیئے پڑھنا نماز — یہ بھی سُن لو جی لگا کر سانس لینا چاہیئے
دیکھ مِن حَبلِ الوَرِید اور ہر نفس رکھ یادِ حق — زندگی کو دستِ غفلت میں نہ دینا چاہیئے

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے — ترقی کے ہجّے کیا کیجئے

بس کدورت سے دل اس تیرہ دروں کا ہے بھرا — یہ تو بربادئ اربابِ دغا چاہتی ہے
لگی لپٹی نہ لگا رکھتی تھی تلوار کی جنگ — توپ کیا چاہتی ہے صرف دغا چاہتی ہے

جسم و جان و گروہ بندی میں — مبتلا یاں کا ذرّہ ذرّہ ہے
طب میں پرہیز شرع میں تقویٰ — پالٹک میں وہی تبرّا ہے
مدّعا سب کا جو نہ سمجھے ایک — غالباً عقل سے مُعرّا ہے

تقاضا اضطرابِ شوق کا بڑھتا ہی جاتا ہے — یہ پارہ شیشۂ دل میں مرے چڑھتا ہی جاتا ہے

جو ہم کو بُرا کہتے ہیں معذور ہیں اکبر — حق یہ ہے کہ ہم بھی انھیں اچھا نہیں کہتے
ہم حضرتِ عیسےٰ کا ادب کرتے ہیں بے حد — لیکن اُنھیں اللہ کا بیٹا نہیں کہتے

جس نے اس ضعف پہ بھی مجھ کو جِلا رکھا ہے
میں نے بھی دِل اُسی قوت سے لگا رکھا ہے

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبطِ پولس
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

علم ابتدا کا ہے نہ خبر انتہا کی ہے
دَورِ انقلاب کا ہے حکومت فنا کی ہے
جُغرافیے سے حال گورمنٹ پوچھئے
ہم تو یہ جانتے ہیں خدائی خدا کی ہے
مجبور عاجزی پہ ہے منکر کی طبع بھی
خواہش کو کیا سمجھتے ہو صُورت دُعا کی ہے
جو منزلیں ہیں نفس کی سب ہیں فنا پذیر
حق پر قیام دل ہو یہ صورت بقا کی ہے

مذہب کسی سے میں نے سیکھا پڑھا نہیں ہے
اتنا ہی جانتا ہوں بندہ خدا نہیں ہے

اسے جنگی بنائے گی اُسے ذوقِ بکا دے گی
جدھر جائیگی یہ فطرت اُدھر اس کو جھکا دے گی

شکستہ دل مدتوں سے ہوں میں جگر بھی اب خون ہو چلا ہے
خدا کی جو مصلحت وہ بہتر اسی میں شاید مرا بھلا ہے

کوئی ہو اچھا تو اپنے حق میں کوئی بُرا ہو تو اس کا ذمہ
نہ اس کی نعمت کے مستحق تم نہ بد کی تم پر کوئی بلا ہے
نہیں ہیں شیطان کے مقابل تو کیا ہے مرحِ دلی سے حاصل
کمر سے تلوار تو ہے غائب مگر چمکدار پر تلا ہے
نظر میں ہو ہادیٔ طریقت قدم ہو سوئے طریقِ وحدت
یہی میں دل میں بھی کہہ رہا ہوں یہی مرا قول برملا ہے

فریبِ ہستی کا کھل گیا ہے نگاہ دنیا کو پا گئی ہے — عمل کی توفیق بھی خدا دے سمجھ تو کچھ مجھ کو آ گئی ہے
کہاں کے ارض و سما کو کب کہاں کے ہم تم کہاں کے یہ سب — قدم کی اک موج ہے زمانہ سو یہ بھی اک لہر آ گئی ہے

زباں کھولی ہے محفل میں واہ وا کے لئے — کبھی تو بند کر آنکھوں کو بھی خدا کے لئے

فلاسوفی کے مکالموں میں کسی نے یہ خوب ہی کہا ہے
جو تندرستی ہو تیری اچھی تو سانس ہی میں بڑا مزا ہے

شکرِ خالق کی ہمیشہ مجھ کو جا ملتی رہی — سانس لینے کے لئے کافی ہوا ملتی رہی
غم کے داغوں سے رہی ایذا مگر یہ بھی ہوا — مجھ کو پیہم لذّتِ یادِ خدا ملتی رہی

رفتار اور سمت میں اِک موج ہوا کی ہے — اے قصّہ گوئے بدر ضرورت حرا کی ہے

بے ساز و بے مغنّی یاں وجد آ رہا ہے — ہر وقت بج رہا ہے ہر ذرّہ گا رہا ہے

ہو مجھ پہ بتوں کی چشمِ کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی
مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی اُن کو جو مری پروا نہ رہی
دنیا کا تردّد جب تک تھا جبتک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم رغبت نہ رہی دُنیا نہ رہی
سچ پوچھئے تو راحت ہی ملی دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اُداسی ہے بھی تو ہو آفت تو مگر برپا نہ رہی

میں یہ نہیں کہتا کہ دوا کچھ نہیں کرتی
کہتا ہوں کہ بے حکمِ خدا کچھ نہیں کرتی

اچھی وہ آرزو کہ جو دل کا ادب کرے
اچھا وہ دل جو درد کی لذّت طلب کرے

خاک کے ساتھ کھیلتی ہے رُوح
مَیں کی مٹی خراب ہوتی ہے

دل میں خاک اڑتی ہے خالی لہجہ و لب دیکھئے
مذہب اب رُخصت ہی بس تاریخ مذہب دیکھئے

کیوں میں پوچھوں کہ جناب آپ کا مذہب کیا ہے
دیکھتا ہی ہوں شب و روز کہ مطلب کیا ہے

صرف دعووں سے تو آتی نہیں عظمت دل میں
آنکھ کچھ دیکھتی ہے تب وہ ادب کرتی ہے

یہ عقل ہی ہے محب بھی عدو بھی ہوتی ہے
کہ مانتی بھی نہیں مضطرب بھی ہوتی ہے
وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

کچھ فرض نہیں آپ کا ہر چیز پہ قبضہ
دنیا میں بہت کچھ ہے تو کیا سب کے لئے ہے
کر آہ جو تیرہ ہو ترا مطلعِ اُمید
یہ شمع شب افروز اسی شب کے لِئے ہے

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو قصّہ لمبا ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اُس کُل میں مرا کیا حِصّہ ہے

کریں کیا یہ تو ان حضرات کو مطلب سکھاتا ہے
کہیں کیا یہ مناسب وقت ہیں مذہب سکھاتا ہے

جہاں قول و عمل یکساں ہیں اور ہے اک دلی طاقت
تو اُن کا پوچھنا کیا اُن کو ان کا رب سکھاتا ہے

اِن کو تو ہمیں شب سے کیا کرتے ہیں منسوب
تخصیص کواکب کو فلک پر نہیں شب سے

نہ ماضی اس پہ غالب ہے نہ مستقبل کا طالب ہے
اسی کو حال کہتے ہیں یہی دل کو مناسب ہے

مطبع کی یاں مدرنہ کتابوں کا زور ہے
میخانۂ دل ہے اُس کی شرابوں کا زور ہے

میرا تو ہر سخن اسی مطلب کے ساتھ ہے
کم ہیں خدا کے ساتھ خدا سب کے ساتھ ہے

پولیسِ خفیہ پئے انسدادِ جرم ہے ٹھیک
نہ چاہیئے کہ وہ ہو انسدادِ گپ کے لئے

کوئی نہ آیا مرے پاس گھر کو جیب کے لئے
جو صورتیں نظر آئیں وہ صرف ہپ کے لئے

نگاہ ظاہر طریق عرفاں میں سوئے انکار کیوں نہ لپکے
کہاں سے لائے وہ چشم معنی کہ برق چمکے نظر نہ جھپکے

بس طاقت ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تِل کے نظر بھی مجھکو ملی ہی نپ کے

تمہاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی
مری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشمِ خوباں سے شرم ٹپکے

ہوا ہے خون آرزو کا اکثر یہ ہے بہارِ کلامِ اکبر

سخن کو رنگین کر دیا ہے دل و جگر نے تڑپ تڑپ کے
جو میرے دل کا ابھار دیکھا جو رنگ اس کا بتوں کو بھایا
تو پوچھا یہ پھل کہاں سے پایا کہا یہ میں نے کہ ہر کو جپ کے

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضموں انھیں کا کاغذ قلم انھیں کا دوات اُن کی

یہی خصائل یہی طبیعت رہی تو قسمت یہی رہے گی — زمانہ بدلیگا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہیگی
یہی سیکہ رواں اگر ہیں تو نورِ صبحِ امید کیسا — یہی ہے زلفِ بتاں کا سودا تو میری شامت یہی رہیگی
عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکرِ عصیانِ غیر کیسا — عدو کی قسمت بگڑ ہی جائے تو اپنی قسمت یہی رہیگی
ہزار سائنس رنگ لائے ہزار قانون ہم بنائیں
خدا کی قدرت یہی رہے گی ہماری حیرت یہی رہیگی

تاکیدِ عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے — پیری میں بھی اکبرؔ کی ظرافت نہیں جاتی

لحد کی تیرگی سے حق بجانب دل کی وحشت ہے — یہی وہ شب ہے جس کی صبح بھی صبحِ قیامت ہے
مصیبت بہرِ مومن پرتوِ عرفاں ہے اے اکبرؔ — ظہورِ داغِ دل دیباچۂ صبحِ سعادت ہے

امنگیں ہیں ہر دل میں جنون و عشق و وحشت کی — پھر اس میں بحث کیا افتاد ہے اپنی طبیعت کی

ہوائے نفس نے محروم رکھا اوجِ عرفاں سے
بتوں کے زیرِ پا دیکھی بلندی اپنی ہمت کی

٭

ٹھیک ہی مصرعے کا مضموں قافیہ گو سخت ہی
اہلِ دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کم بخت ہے

٭

جو مضطرب ہی اس کو ادھر التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

٭

دخلِ واعظ صرف استحقاق جنت ہی میں ہے
فیصلہ جینے کا حق کے دستِ فطرت ہی میں ہے
کینۂ و پیکار میں بھی یوں تو ہے اک حظِّ نفس
زیست کا اصلی مزا لیکن محبت ہی میں ہے

٭

کیا خبر تھی کہ گناہوں سے ہے عزّت میری
قابلِ دید ہے توبہ پہ ندامت میری
ہیں عیادت کا تقاضا نہیں کرتا اُن سے
اتنا ہی کہتا ہوں اچھی نہیں حالت میری
قامتِ یار پہ حاوی جو ہوئی زلفِ دراز
بل کی لیتی ہے کہ دیکھو یہ قیامت میری
کس کو اُمید ہے اس کی کہ یہ اچھا ہوگا
کون اس وقت میں کرتا ہے عیادت میری

٭

دیدۂ تحقیق سے دُنیا کی حالت دیکھئے
نفس کی ہر لذت اور آخر نجاست دیکھئے

٭

دولت و عزّت سے بیگانہ نہیں حالت مری
یہ مصیبت میری دولت۔ صبر یہ عزّت مری

٭

جمالِ معنیٔ احباب میں ہے جہانِ صورت کا سامنا ہے
نگاہِ جویائے امرِ حق کو یہاں مصیبت کا سامنا ہے
عذاب کی یہ بنیاد تی ہے کہ اس میں منظور ہی کمی کچھ
جحیم میں جو جگہ ملی ہے وہاں سے جنت کا سامنا ہے

٭

نفس نابینا حریص و طالبِ لذّات ہے
عقل کی خدمت فقط ترتیبِ محسوسات ہے
ان مشاغل میں تو اے اکبر نہیں کچھ اوجِ دل
رُوح کی طاقت جو غالب ہو تو ہاں اک بات ہے

آئے وہ خنجر بکف میں ڈر کے مارے مرگیا
اُن کی ورزش رہ گئی میری شہادت رہ گئی
باغباں خاموش گل پژمُردہ اور گلشن اُداس
جب ہوا بدلی تو ساری زیب و زینت رہ گئی

حضرت کی معاشرت بہت اچھی ہے
مشہور ہیں انتظامِ راحت کے لئے
اپنے مذہب میں کیوں بلاتے ہیں مجھے
جنت کے لئے کہ لطفِ صحبت کے لئے

اِس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اِس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا
سائنس سے سُنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب افعلن و فعلن
چرخا ہی چلا کرتا ہے اور سُوت نہیں ہے
نیچری کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبر
تم دیکھتے ہو پھل میں کوئی پھُوت نہیں ہے

مرزا ہوں وہ یا خاں صاحب ہوں دونوں کی محبّت ہم کو ہے
وہ نام کے ہیں یہ کام کے ہیں دونوں کی ضرورت ہم کو ہے

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے
ہے اب تو جنگ حکم و تجارت کے واسطے
لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو پریڈ پر
تیّار ہو رہا تھا میں جنّت کے واسطے

جوشِ جنوں میں بھی عمل ذہن چُست ہے
احساس میں ہے فرق تعطّل درست ہے

ہو رہا ہے ہر طرف قانونِ فطرت کا نفاذ — انقلابِ عالمِ فانی خدا کے ہات ہے
جو ہوا وہ کیوں ہوا اس کی تو توجیہیں بہت — چاہتا جو ہوں وہ کیونکر ہو یہ مشکل بات ہے
کام لیتا رہ امیدوں سے دعا کر صبر کر
امتحانی زندگانی موردِ آفات ہے

مایوس ہیں باغِ عالم میں امید سے یاری چھوٹ گئی — جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

ہماری خاطر ہو جمع کیونکر کہ یاس رہ رہ کے لوٹتی ہے — الم کا اک سلسلہ ہے قائم امید بندھ بندھ کے ٹوٹتی ہے
اگرچہ عزت کا بھی ہوں طالب مذاقِ رندی ہے مجھ پہ غالب — جو شیخ چھوٹیں تو چھوٹ جائیں شراب کب مجھ سے چھوٹتی ہے
دمِ سحر جوشِ شوقِ دل سے ضرور ہے انبساطِ باطن
کلی بھی گل کی چٹکے ہی ہے کرن بھی سورج کی پھوٹتی ہے

تقلیلِ غذا میں ہو پیرِمنٹ ہی ہے — کر ضبطِ ہوس سلف گورمنٹ ہی ہے

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظمِ ملت بی اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر سنکر یہ شعر بولے — بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے
کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

مذاقِ بادہ کشی تھا خلافِ حکمِ خدا — بحمداللہ کہ بہت کچھ جڑ اس کی ٹوٹ گئی
عجیب نسخۂ عرفاں دیا تصوف نے — کہ نشہ تیز ہوا اور شراب چھوٹ گئی

دریا میں تو صاحب سے اگن بوٹ میں ہارے　　میدانِ الکشن میں گئے ووٹ میں ہارے

تہذیب دم بخود ہے طمع کی گھسیٹ سے　　حضرت بھی کام لینے لگے مار پیٹ سے
ممنون تو میں ہوں ترا اے سایۂ شجر　　سر پر مگر عذاب ہے چڑیوں کی بیٹ سے
عزت کی تو شناخت نہیں ہے مگر مجھے
لذت ضرور ملتی ہے کونسل کی سیٹ سے

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی　　ملا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی

اصل اللہ سے لگاوٹ ہے　　ورنہ مذہب میں سب بناوٹ ہے

مجھے یہ انقلابِ دہر کب خطرے کا باعث ہے　　مری طبعِ رواں اک ماہیِ بحرِ حوادث ہے

میں کیا کہوں شکایت کل کیا تھی آج کیا ہے　　جینا ہی رنج دہ ہے اس کا علاج کیا ہے
قوت نہیں ہے جس میں کیوں چاہتا ہے زینت　　جب تخت ہی نہیں ہے پھر ذکرِ تاج کیا ہے

مجھے حیات کی اب احتیاج ہی کیا ہے　　مگر مروں نہ تو اس کا علاج ہی کیا ہے
سنا تھا کل کہ ترقی ظہور پائے گی کل　　مگر جو غور سے دیکھا تو آج ہی کیا ہے

مقابل ترے پیچ سب ہیچ ہے　　مگر تو ہی خود پیچ در پیچ ہے

مذہب کی پناہ آخر کو ملی اور کفر کی زد سے بچ نکلے　　ہر دم ہے یہی اب اپنی دعا اللہ کا ہونا سچ نکلے

اس کی حرکت ہے کلیدِ مغربی پر منحصر　　دل یہ سینے میں ہے یا پاکٹ کے اندر واچ ہے
نجد کے نغمے کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے　　دیس کو جس نے بھلایا یہ وہی کھماچ ہے
ہم رولی بن کے میں بھی خوب ہی تنتا ہوں اب
آئرش کوئی، کوئی انگلش، کوئی اسکاچ ہے

دنیا یوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی　　برباد کئے جائے گی آباد رہے گی
گلچیں کا ستم بھول بھی جاؤں کبھی شاید　　صیاد کی بیداد مگر یاد رہے گی
نالے ستم افزا ہیں تو روکوں گا زباں کو
دل ہی میں نہاں اب مری فریاد رہے گی

اگرچہ مضمونِ زندگی میں الم کی تمہید بھی بڑی ہے　　خدا کے فضل و کرم سے لیکن مجھے تو امید بھی بڑی ہے
طلب کی منزل میں رنج و راحت سے رہتا ہے اعتدال قائم　　بہت ہے رمضاں کی جو سختی مسرت عید بھی بڑی ہے
منہ اپنا غفلت سے موڑ اکبرؔ نماز ہرگز نہ چھوڑ اکبرؔ
بہت فوائد ہیں اس کے اندر اور اس کی تاکید بھی بڑی ہے

بتوں کی بات سے دل مائل فریاد ہوتا ہے　　مگر کہنا ہی پڑتا ہے "بجا ارشاد ہوتا ہے"
مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں　　یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

جب حکم ہی ہے کوششِ بے سود کیجئے　　کوئے بتاں میں خوب اچھل کود کیجئے

سینے میں دل آگاہ جو ہو کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی　　بیدار تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے　　اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بےچین سہی برباد سہی

وہ خوش کہ کرونگا ذبح اسے یا قید قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ یہ طالب تو ہے مرا صیّاد سہی جلّاد سہی

جمعیتِ خاطر ہو نہ سکی اسبابِ الم موجود رہے　　کرتے ہیں مگر ہم شکرِ خدا حاسد نہ ہوئے محسود رہے

کارِ دُنیا سے ہماری دل کشی مفقود ہے　　جدّت اُس شے میں کہاں سے آئے جو محدود ہے

رہا نہ خانۂ ہستی میں دل کو لطف کوئی　　بس اب تو محو یہ حسرت ہی کے سرود میں ہے
نہ میں کسی پہ ہوں نازاں اب اور نہ مجھ پہ کوئی　　کسی کی گود میں ہوں اور نہ کوئی گود میں ہے

دل نوازِ حق نما اُن کا ہر اک ارشاد ہے　　دیدۂ صاحب نظر میں صوفیوں پر صاد ہے

عشق کو کیوں بےخودی مقصود ہے　　حُسن بےحد ہے خودی محدود ہے
منکشف ہو جائیں اسرارِ خودی　　بےخودی کا بھی یہی مقصود ہے
شرمِ آدم ہے اطاعت نفس کی　　وہ ملائک کا اگر مسجود ہے

سُنتا ہوں مجھے رخصتِ فریاد ملے گی　　منظور تماشا ہی ہو یا داد ملے گی
مل جائے نظر اُن کی۔ دُعا مانگ رہے تھے　　معلوم نہیں تھا ستم ایجاد ملے گی

ذرّہ ذرّہ اپنی حد بندی میں مست و شاد ہے — تفرقے کے جوش پر ہر سُو مبارک باد ہے
حافظے کے فیض نے روکا ہے بابِ اتحاد — شکوہ انگیز اک نہ اک قصّہ ہر اک کو یاد ہے

واعظِ توحید پر دیتے ہیں فتوائے جنوں
خود پرستی کا سبق ہے کافری اُستاد ہے

میں تو ہمدرد ہوں بس اُن کی گرفتاری کا — قیدِ ہستی سے جو مشتاق ہیں آزادی کے
ڈھونڈنا چاہئے تھا اکبرؔ بے کس کو وہاں — ایک ویرانہ بھی ہے متصل آبادی کے

نیک ہو منزل تو اکبرؔ راہِ بد کیوں مانگئے — دوست سے ملنے کو دشمن سے مدد کیوں مانگئے

حرصِ دُنیا ظلمتِ دل کی مؤیّد ہی رہی — پھر بھی یہ پیرانِ نابالغ کی مُرشد ہی رہی

تو رہے جب تو یہ مشکل ہے تردد نہ رہے — یہ تو اُس وقت نہ رہ جائے کہ تو خود نہ رہے
چھاؤنی میں رہیں صاحب تو وہیں لیڈر بھی — یعنی کیوں ساتھ سلیمان کے ہُدہُد نہ رہے

پہچان بزرگی کی ہے یہی دل خوفِ خدا کی زد میں رہے — اندیشہ بہت گستاخ نہ ہو اور وہم ادب کی حد میں رہے

آگیا ہوں تنگ سوءِ ظن سے طبیب اور بید سے — دیکھئے کب ہو رہائی زندگی کی قید سے

گو سب کو ہے تسلیم کہ معبود وہی ہے — کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے
آنکھوں میں اُتر آتے ہیں موہوم کے نقشے — دل میں یہ سمائی ہے کہ موجود وہی ہے

اللہ ہی کی موج سے پہنچے گا تیرا دل　　سر چشمۂ فیض و کرم وجود وہی ہے

گزری کی جب ہو صورت گزر جانا ہی بہتر ہے　　ہوئی جب زندگی دشوار مر جانا ہی بہتر ہے
رہِ اصلاح میں گو تیز گامی خوب ہے لیکن　　قدم کو لغزشیں جب ہوں ٹھہر جانا ہی بہتر ہے
مواقع دیکھ کر اظہارِ مردی چاہیئے اے دل　　ڈرائیں کھیل میں بچے تو ڈر جانا ہی بہتر ہے
بٹھایا ہے بتوں نے بزم میں جب پنا ہی ہو کہ　　جو ہیں اللہ والے ان کو اٹھ جانا ہی بہتر ہے

بُلاتا ہے مجھے بُت خانے سے شیخِ حرم اکبؔر
نہ جانا گو کہ جائز ہے مگر جانا ہی بہتر ہے

رزقِ مایحتاج مل ہی جائے گا　　خواہشوں میں مختصر ہو جایئے
فقر سے شیطاں ڈراتا ہو اگر　　حسبنا اللہ سے نڈر ہو جایئے
خیر خواہی کر کے سَر ہو جایئے　　ورنہ مفقود الخبر ہو جایئے

کیا پوچھتے ہو طوقِ غلامی کو۔ کدھر ہے　　اپنا ہی تعلّق ہے یہ اور اپنا ہی گھر ہے
پیدا ہے غلامی زن و فرزند کے دم سے　　پروا نہ ہو ان کی تو پھر آزاد بشر ہے
یعنی وہ چلا چاہیں گے دنیا کے مطابق　　عزّت نہ محلّے میں گھٹے اس کا خطر ہے
تم دل کو لئے پھرتے ہو وہ نفس کے حامی　　رسموں سے غرض دین کی عزت کا ضرر ہے
ایسے بھی ہیں۔ طینت ہی میں جن کی ہے غلامی　　پابندی دُنیا کا رگِ دل میں اثر ہے
خالق پہ بھروسا ہو تو عزّت نہیں گھٹتی　　افسوس کہ انسان بہت پست نظر ہے

محنت کا دیانت کا قناعت کا شجر ہو
جس رنگ کا پھل آئے وہ عزّت کا ثمر ہے

تم سے اُستادوں میں میری شاعری بیکار ہے　　ساتھ سارنگی کا بُلبل کے لئے دشوار ہے

جنہیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں　　یہ اُن میں کیوں ابھی تک جنگ و تکرار باقی ہے
سبب اس کا تو ہے ظاہر خدا لب پر خودی دل میں　　بُتانِ سنگ ٹوٹے ہیں بُتِ پندار باقی ہے

ہمارا مشرقی دل نزع میں ہے وقت آخر ہے　　نہیں مغرب کو غم۔ اس کی نظر میں مرگِ کافر ہے
غرور آشنا نہ کر قوت پر اپنی اے بُتِ ترسا　　ہمارے ہوش غائب ہیں مگر اللہ حاضر ہے

بہ دل حاضر ہوئی ہے قوم بزمِ عشقِ دنیا میں
بس اک میری طبیعت ہے کہ اب تک غیر حاضر ہے

جو ہیں صائم انھیں یہ طاعتِ دشوار کیا کم ہے　　نہ ہوں صائم تو اُن پر معذرت کا بار کیا کم ہے

رہتے ہیں اس خیال میں ہم اپنے گھر پڑے　　کیوں لوگ چاہتے ہیں کہ ہم پر نظر پڑے

مشتاق حق کے واسطے نعمت کا ڈھیر ہے　　بس زندگی حجاب ہے مرنے کی دیر ہے

جب دین ہو اصلاحِ بشر دنیا میں پھر آخر کون کرے　　غفلت کے سوا اس محفل میں مہمان کی خاطر کون کرے
اک علم تو ہے بُت بننے کا اک علم ہے حق پر مٹنے کا　　اس علم کی سب دیتے ہیں سند اُس علم میں ماہر کون کرے
غوطے تو لگائے زمزم میں اور غرق ہیں حُبِ دنیا میں　　پانی نے بدن کو پاک کیا اب جان کو طاہر کون کرے
مذہب کی دھوم اور ساتھ اسکے اعمال نہیں اخلاق نہیں　　چُپ چُپ کی صدا ہے چار طرف اس راز کو ظاہر کون کرے
جب علم ہی عاشقِ دُنیا ہو پھر کون بتائے راہِ خدا　　جب خضر اقامت پر ہوں فدا تائید مسافر کون کرے

سودا بھی ہے رنگِ طبع بشر فطرت ہی میں ہیں اسباب جنوں
اکبرؔ کو بھی ہوش آجائے تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

عشق کہتا ہے بیانِ حال کی پروا نہ کر — تیرے دل کی خود بخود اُنکو خبر ہو جائے گی
مجھ کو اک حیرت ہے اپنے شوق کی اُمید پر — کیا نگاہِ قہر الفت کی نظر ہو جائے گی
میں نے پوچھا ہے تمہیں مجھ سے محبت یا نہیں — ہنس کے فرمایا نہیں اب تک۔ مگر ہو جائے گی
میں شب فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے
کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

قالب میں جان آئی تو کیا آئی سفر کرنے لگی — ہر سانس مجھ کو موت سے نزدیک تر کرنے لگی

عجب پیچیدگی ہے صورت و معنیٰ کی دُنیا میں — جو نافع ہو وہ باطن ہو جو دلکش ہے وہ ظاہر ہو

خالی حرم کو شیخ ہی تنہا نہ کر گئے — حیرت میں بُت بھی ہیں کہ برہمن کدھر گئے
سودائے مغربی سے ہیں سب کے حواس گم — ایسی یہ تپ چڑھی ہے کہ چہرے اُتر گئے
آیا وطن میں پھر کے مگر اس کی کیا خوشی — جن جن کو پوچھتا ہوں یہ سُنتا ہوں مر گئے

گم کی تھی میں نے راہِ مصیبت ہی تھی سخت — اس پر ہوا یہ قہر تم ایسے خضر ملے
کس سے میں پوچھتا گل و بُلبل کی سرگزشت — دو چار برگ خشک، تو دو چار پر ملے
باتیں بھی مجھ سے کیں مری خاطر بھی کی بہت
لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

ٹیمز کے ساحل پہ جا کر دیکھتے قسمت کی فال
گومتی پر شیعہ و سُنّی نے کیوں تکرار کی

سر سے سودا ے حرم نکلے خدا سے دل ہو سرد
دَیر میں پھر کیا کمی ہے گرمیٔ بازار کی

تہذیبِ نَو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبرؔ
دُنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے

نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو
کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے

دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردّد
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

زندگی بے لطف ہے دشوار ہے
سانس لینا اب مجھے بیگار ہے

امید ٹوٹی ہوئی ہے میری جو دل مرا تھا وہ مر چکا ہے
جو زندگانی کو تلخ کر دے وہ وقت مجھ پر گزر چکا ہے

اگرچہ سینے میں سانس بھی ہے نہیں طبیعت میں جان باقی
اجل کو ہے دیر اک نظر کی فلک تو کام اپنا کر چکا ہے

غریب خانے کی یہ اُداسی یہ نادرستی نہیں قدیمی
چہل پہل بھی کبھی یہاں تھی کبھی یہ گھر بھی سنور چکا ہے

یہ سینہ جس میں یہ داغ ہیں اب مسرتوں کا کبھی تھا مخزن
وہ دل جو ارمان سے بھرا تھا خوشی سے اس میں ٹھہر چکا ہے

غریب اکبرؔ کے گرد کیوں ہیں جنابِ واعظ سے کوئی کہہ دے
اسے ڈراتے ہو موت سے کیا وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

عشق ہی میں اس کے حُسنِ پاک کا اظہار ہے
اشتیاقِ دید کی تکمیل ہی دیدار ہے
ہر تعلق سے جُدا کر کے تو اپنے دل کو دیکھ
دل وہ ہے جو بے ہمہ ہونے پہ بھی خود دار ہے
ہجر میں اُس گُل کے مجھ پر سانس لینا بار ہے
زندگی ظالم مگر اب تنگ گلے کا ہار ہے
داد دے رفتار کی سُستی پہ کیا ہے معترض
آبلہ ہے پاؤں میں اور آبلے میں خار ہے

دعوتِ دیوانگی دیتا ہے نورِ آفتاب
یہ شعاع اے دِل گریبانِ سحر کا تار ہے

نفس تو کہتا ہی ہے ہر دم یہ کرنا چاہیئے
کیوں کوئی پُوچھے کہ کیونکر جی کے مرنا چاہیئے
نفس کی خواہش کے آگے عقل کی سُنتا ہے کون
میں کہوں کس سے کہ اس غفلت سے ڈرنا چاہیے

ہماں بہ کز حدیثِ دی و فردا بے خبر باشی
بہ ذوقِ لم یزل امروز سرتاپا منظر باشی
بکش دامانِ شب برخیز و شمعِ دل فروزاں کُن
چرا افتادہ در بندِ گریبانِ سحر باشی

تجھے اے اُمیدِ فردا دل و جاں سے پیار کرتے
مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
ہے بُتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم
میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
لیا ہم نے بوسۂ رُخ تو نہ بدگماں ہوئے جاں
کوئی پھول دیکھ لیتے تو اُسے بھی پیار کرتے

ترے ہاتھوں کی یہ زینت تو ہے شاخِ گُل سے افزوں
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

جفائیں بھی ہیں فریب بھی ہے نمود بھی ہے سنگار بھی ہے
پھر اس پہ دعوائے حق پرستی اور اس پہ یاں اعتبار بھی ہے

پھیلائیے نہ پاؤں کو زنجیر کے لئے　　دنیا سے ہاتھ اٹھائیے تکبیر کے لئے

***

دل مرا اور خواہشیں ان کی یہ کیا اندھیر ہے　　سحر ہے یا ظلم ہے یا کچھ سمجھ کا پھیر ہے
لوگ کہتے ہیں یہاں اکبر کبھی آباد تھا　　شاید ایسا ہی ہوا اب تو خاک کا اک ڈھیر ہے

***

جاں بر نہ ہو سکا گو فرقت کی شب سحر کی　　تھوڑی نہیں تھی اکبر تکلیف رات بھر کی

***

ہوا گر سینے میں ناسور ہوا جاتا ہے　　غم سے دل خون تھا اب نور ہوا جاتا ہے
دیکھ ہی لو گے زمانے میں قیامت برپا　　نالۂ خستہ دِلاں صور ہوا جاتا ہے

***

چشمِ بتاں نے نفس کی خواہش ابھار دی　　دنیا ہماری دشمنِ دیں نے سنوار دی
لذّت خدا کے نام میں کچھ کم نہ تھی مگر　　پیشِ شکم زبان نے ہمّت ہی ہار دی

بندوق کا نہیں ہے جو لیسنس غم نہیں
میں نے تو اِس خیال ہی کو گولی مار دی

***

جس طرف دیکھو خیالِ تیزیٔ رفتار ہے　　منزلِ مقصود کیا ہو یہ سمجھ دشوار ہے

***

قرار دل کو نہیں حسنِ انتشار تو ہے　　وصالِ یار نہیں ہے خیالِ یار تو ہے

***

اتنا جیے کہ جاننے والے گزر گئے　　پرساں رہا نہ کوئی تو چپ چاپ مر گئے

***

تم دیکھتے ہو اکبرؔ دُنیا کا رُخ کدھر ہے ۔۔۔ یہ وقتِ الاماں ہے یہ وقتِ الحذر ہے
حیرت سے دیکھتا ہُوں ہر صاحبِ خرد کو ۔۔۔ اس کی زباں کدھر ہے اور اسکا دل کدھر ہے

کیا ہو رہا ہے دل میں اثر کچھ نہ پوچھئے ۔۔۔ کس پر پڑی ہے میری نظر کچھ نہ پوچھئے
کیا کر رہی ہے کبر شکن قدرتِ خُدا ۔۔۔ ہے پوچھنے کی بات مگر کچھ نہ پوچھئے

جینے والوں ہی کے ہیں ہنگامے ۔۔۔ خلق اُنھیں پر نگاہ کرتی ہے
مست دُنیا میں ہیں یہ کیا جانیں ۔۔۔ مرنے والوں پہ کیا گزرتی ہے

خُدا کے گھر سے اب آنے کی جو خبر آئے ۔۔۔ بتوں کے پاؤں پہ ہم کو تو سعی نظر آئے

ہوا کیوں شوقِ آزادی کا جب زنجیر ایسی تھی ۔۔۔ دل ایسا کیوں ملا ہم کو کہ جب تقدیر ایسی تھی

خرد کی ناتوانی ہے منظر کی ناصبوری ہے ۔۔۔ ہوا جو کچھ ضروری تھا جو کچھ ہوگا ضروری ہے

حادثے اپنے طریقوں سے گزرتے ہی رہے ۔۔۔ کیوں ہُوا ایسا یہ ہم تحقیق کرتے ہی رہے
صفحۂ ہستی پر آخر کس قلم کی ہے کشش ۔۔۔ نقش مٹتے ہی رہے لیکن اُبھرتے ہی رہے
انتظار آخر اجل سے کر گیا یاں ہم کنار ۔۔۔ چشمِ بد دُور آپ اپنے گھر سنورتے ہی رہے

کچھ دیکھتا نہیں میں دلِ زار کے لئے ۔۔۔ جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

یادِ حق دل سے دُور کر نہ سکے — مجھ سے یہ بت غرور کر نہ سکے
مجھ کو رنجِ شکستِ شیشۂ دل — اُن کو غصّہ کہ چُور کر نہ سکے
مجھ کو تو بس میں کر لیا بیشک — حق کو راضی حضور کر نہ سکے

دنیا سے قطع خوب اگر خوش نہ رکھ سکے — آنکھوں کو بند کر جو نظر خوش نہ رکھ سکے
دُنیا کی لذّتیں جو ملی تھیں وہ ہوچکیں — خوش کر لیا تھا دل کو مگر خوش نہ رکھ سکے

جسمِ بے سر ہے اب ہماری قوم — خوار زار و خراب و ابتر ہے
ہنس کے کہنے لگے جنابِ مذاق[1] — بس یہ کہئے ہر ایک خودسر ہے

جو مسرت تیری محتاجِ نگاہِ غیر ہے — اس مسرّت میں نہ خوبی ہے نہ کوئی خیر ہے

جس کے دل میں شانِ باری کا تصوّر گھر کرے — اس کو کیا پروا کہ کوئی بُت مرا آدر کرے

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے — خدا کیا ہے خدا ہے اور کیا ہے
بڑھاتے کیوں ہو تم لفظوں کو آگے — بساطِ ذہن پر یہ جور کیا ہے

اس باغ میں یہ نگاہ اکبر — دِل کو بے حد اُبھارتی ہے
ہے کس کے فراق میں پپیہا — کوئل کس کو پکارتی ہے

---

[1] نواب صاحب پریانواں

کہا صیاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے

کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر میری
نشاطِ طبع کی مہلک مگر بیکاری پر ہے

دیر کے عیش میں تکلیف مع الخیر تو ہے
کعبہ میں کچھ نہ سہی خاتمہ بالخیر تو ہے

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے

شکم کی پیٹھ ٹھونکی نفس امارہ نے خوش ہو کر
صدائے باطنی اٹھی کہ یہ کمبخت کافر ہے

رشتۂ توحید سے لپٹا نہیں تارِ نظر
الجھنیں کیں خوب پیدا سبحہ و زنار نے

چل گئی موسیٰ کی لاٹھی رہ گیا جادو کا کھیل
ساحروں کے سانپ کو مارا خدا کی مار نے

ریل کعبے تک اگر بن بھی گئی تو ناز کیا
عرش باری تک نہیں پائی رسائی تار نے

دیدنی تھا ہجر کی شب وہ ہجومِ انتظار
اور دیکھا ہی نہیں کچھ دیدۂ بیدار نے

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار کے

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھجک جب منہ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیوں کر جینا ہو اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے یا کچھ نہ کہے یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے

قائل کو بھروسا قوت کا اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

دل کی بیتابی ہے ثابت آنکھ کے اظہار سے
بجلیاں پیدا ہوئی ہیں آنسوؤں کے تار سے

جب طبیعت خوش نہیں تو کیا کرے اچھا مکاں
دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

چشمِ بینا تونے پائی ہے تو یہ دنیائے دوں
اک نہ اک دن تیری نظروں سے اتر ہی جائے گی

کس قدر دلکش نگاہِ ساقئ مخمور ہے
صبر بھی بے تاب ہے تقوٰی بھی اب معذور ہے

خانۂ ہستی کی ترکیبوں میں کیا دخلِ خرد
حکم ہے تقدیر کا تدبیر اک مزدور ہے

میں جسے سمجھا ہوں وہ نفس کی ہیں خواہشیں
میں حقیقت میں جو ہی مجھ سے نہایت دور ہے

امتحانوں سے ہوئی طے بحث جبر و اختیار
فیل جب ہو جائے مختاری میں تب مجبور ہے

آپ سے مل کر میں کیوں نقصان اٹھاؤں اے جناب
آپ کو جب صرف اپنا فائدہ منظور ہے

ڈاروِن صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے
دعوئ مخدومیت میں مست ہر لنگور ہے

تدبیرِ بشر خوب الٹ پھیر کرے گی
رفتارِ فنا سب کو مگر زیر کرے گی

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے
پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اِک جبر ہے

اب شیخ ہند برہمنوں کے گلے لگے
تسبیح بن کے آئے تھے زنار ہو گئے

اِس منزلِ فنا میں جو رکھی بِنا تو کیا
دیوار اٹھا کے نقش بہ دیوار ہو گئے

نہ چھوڑ دل کو کسی دل شکن اثر کے لئے　　ہے مبتدا یہ خبر دوسری خبر کے لئے

جنونِ عشق سے انساں کی طینت سنورتی ہے　　یہی مستی وہ ہی جو عقل کو ہُشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بے خبر ہی نصف دنیا نصف دنیا سے　　کہ یہ ماتم میں ہی مصروف اور وہ چین کرتی ہے
بیاں اپنے اثر میں حس کی قوت لا نہیں سکتا　　زباں کہہ نہیں سکتیں دلوں پر جو گزرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبرؔ　　کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

سخن سنجی کا کیا کہنا مگر یہ یاد رکھ اکبرؔ
جو سچی بات ہوتی ہے وہی دل میں اُترتی ہے

نہ سہی حسنِ عمل خوبیٔ گفتار سہی　　ہے تو اکبرؔ میں بھی اک بات گنہگار سہی
دل جو تسبیح میں مصروف ہو حاصل ہی مُراد　　قشقہ بالائے جبیں دوش پہ زنّار سہی

خالق ہی سے ملی ہی فطرت کی جو لڑی ہے　　بینا وہی ہے جس کی اس پر نظر پڑی ہے

ذرہ ہائے خاک کس ترکیب سے جکڑے گئے　　جینے مرنے کے تماشے کے لئے پکڑے گئے
بے اطاعت ناتواں کا کام چل سکتا نہیں　　جُھک گئے تو رہ گئے قائم۔ اگر اکڑے گئے

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے　　ہوا ہی بدلی ہوئی ہی فلک سے کون لڑے
خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے　　ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض جڑے
اگر اٹھے تو علم اپنا گاڑیں گے کہیں　　جو اُٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم خود ہی گڑے

عرفان ضو فگن ہے شریعت کی آڑ سے
آتش فشاں زمین دبی ہے پہاڑ سے

خدا کی مار کا کرتا نہیں میں کچھ مذکور
طبیعت اور ہی پہلو پہ جا کے لڑتی ہے
نہ رہ سکے گی لطافت جو زن ہے بے پردہ
سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

عقل کو فردا و دی کے غم میں ساز و سوز ہے
عشق ہی اچھا کہ مست جلوۂ امروز ہے
پھیر ہی لی ہے جمالِ لم یزل سے اس نے آنکھ
ورنہ ہر مدِّ نظر انساں کو عشق آموز ہے
زیست میں ہر دم ہے محتاجِ فنا ہر ذی حیات
زندہ دِل وہ ہے جسے ہر سانس عجز آموز ہے

بدلی ہوئی رُت محسوس ہوئی بھونرے کی ابھی آواز سُنی
فطرت کی بسنتی یہ ٹھمری بیساختہ دبے ساز سُنی

دل نہ مایوسی پہ مائل ہے نہ محوِ ناز ہے
منزلِ ہستی میں ہر انجام اک آغاز ہے

حرج کیا ہم بھی جو چشمِ سرمگیں پہ پِس لئے
یہ بلائیں اس تماشا گاہ میں تھیں کس لئے
سجدۂ دیر و حرم سے معرفت کس کو نصیب
سنگِ در آیا نظر خلقت نے ماتھے گھِس لئے

ڈیڑھ سو محراب مسجد میں ذرا دشوار ہیں
سایۂ ہوٹل میں بسئے یا فقط دس لیجئے
حضرتِ اکبر سے کہہ دو قافلہ تیار ہے
اک رزولیوشن کا ٹٹو آپ بھی کس لیجئے

اب کیا میں طلب دُنیا کی کروں کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے
دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کَے دن کے لئے اور کس کے لئے

ہو تم کو مبارک شوقِ نمود افسردہ پڑا رہنے دو مجھے
کافی ہے یہاں یہ داغِ جگر تم شمع بنو مجلس کے لئے

یہ گوش و زبان و چشم چمن غوغائے جہاں سے فارغ ہیں
کرتا ہوں دُعائیں گل کے لئے سوسن کے لئے نرگس کے لئے

رُوح کا ہے امتحاں اور زندگی کا کورس ہے
ہے مبارک وہ سمجھ قرآں جس کا سورس ہے

کیا وہ درست ہو مری نظموں کے فورس سے
فرصت کہاں ہے قوم کو کالج کے کورس سے

استخوانِ مغربی کا شکر کرنا ہے بجا
با ہمی عف عف یہ لیکن قابلِ افسوس ہے
بسٹ ہی تو رہ گیا تیرا ذرا آئینہ دیکھ
شاہدِ مغرب سے کیا فکرِ کنار و بوس ہے

بنگلۂ جاناں سوا دو کوس ہے
چل نہیں سکتے بڑا افسوس ہے

فسانیّت ہی جب نہیں ہے تو پھر مجھے خطرہ کیوں کہیں ہے
بہت مکلّف ہیں یہ اشارے کہ اس سے بچئے اور اس سے بچئے
برہنہ ہی ہو جو جبر ہم پر خیال اس کا نہ آئے کیونکر
شعور ہو کس طرح معطّل کہاں یہ ممکن کہ حس سے بچئے
وہ اک زمانے سے بدگماں ہیں خبر نہیں کیا اثر کہاں ہیں
سمجھ میں آتا نہیں کچھ اکبر کہ کس سے ملیئے کس سے بچئے

شامت آئی ہے یہ مسلّم ہے
بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی

میری جانب اشارہ غالب ہے — یعنی اکبر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو — کھل ہی جائیگا آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے — بڑھ گئی ہے مری بہت ڈھکی

اکبر کو کیا ابھاروں مایوس ہی نہیں ہے — ایسا مٹا کہ مٹنا محسوس ہی نہیں ہے

ارتقائے نے کی برکت دیکھئے — تاجر اب اہلِ قلم ہیں یانس کے

عقل نے اچھی کہی کل دلالہ مجلس رائے سے — جھک کے چلنا چاہئے ہم سب کو وائسرائے سے
شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیے اس کے ہیں خوب — کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

پوچھتے کیا ہو کہ تو پلیرو ہے یا ھلبس ہے — بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لیسنس ہے

یاس اس سے ہو گئی امید تھی جس بات کی — جی رہا ہوں شکر ہے لیکن خوشی کس بات کی

سیٹھ جی کو فکر تھی ایک اک دس دس کیجئے — موت آ پہنچی کہ حضرت جان واپس کیجئے
ماتمِ شام اودھ میں میں تو اب مصروف ہوں — آپ ہی نظارۂ صبحِ بنارس کیجئے

افواہ ہے کہ اکبر بے ہوش ہو گیا ہے — یہ تو غلط ہے لیکن خاموش ہو گیا ہے

فلسفہ ان کا انھیں کی چال کا ہمدوش ہے — ان میں دولت بخش ہے اور ہم میں مذہب نوش ہے

بزمِ ہستی میں محبت کے ترانوں کو نہ چھوڑ — یہ وہ شے ہے جسے ہر ساز سے اک سازش ہے

خود گوارا نہیں فریاد کا یہ جوش مجھے — کر بھی چکتی اجل آکر کہیں خاموش مجھے
عقل کچھ کر نہ سکی قدر شناسیٔ جنوں — بزمِ ہستی میں مبارک نہ ہوا ہوش مجھے
حالتِ قابلِ فریاد کے سب ہیں شاہد — اس سے کیا ہوتا ہے کر دیجئے خاموش مجھے
تابِ نظارۂ گلزار میں کیا لاؤں گا — رُت بدلنا ہی کئے دیتا ہے بیہوش مجھے

بُت پرستی میں بھی پردہ کا ہوں حامی اکبرؔ
بخش ہی دے گا خداوند خطاپوش مجھے

سبحہ صندل کا ہے مگر افسوس — دب گئی بُو فرنچ پالش سے

مقابل غیر مذہب کے تو مذہب جوش رکھتا ہے — عموماً ورنہ اپنے آپ کو بے ہوش رکھتا ہے
رہِ حق کے جو سالک ہیں وہ مستثنیٰ ہیں اے اکبرؔ — کہ اُن کو ساقیٔ توحید ساغر نوش رکھتا ہے

دلِ سوزاں کو اک نعمت سمجھ یہ گرمجوشی ہے — اُمیدِ آخرت میں مست رہ یہ بادہ نوشی ہے

ان بتوں کے باب میں اتنی ہی میری عرض ہے — کفر ہے اُن کی پرستش پیار کرنا فرض ہے

اب تو ہے یہ سوچ کیا ہیں کیا بساطِ زندگی — ہو چکا دو دن کا وہ دورِ نشاطِ زندگی
دیکھئے انجام کیا ہو۔ ڈر رہا ہوں دیکھ کر — لذّتِ دُنیا سے اتنا اختلاطِ زندگی
یہ بھی فانی وہ بھی فانی دونوں ہیں بے اعتبار — انقباضِ موت ہو یا انبساطِ زندگی

یُوں تو ہیں جتنے شگوفے سب کو فکرِ باغ ہے
یہ مگر سچ ہے کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہے

خودیوں میں قافیئے ہیں زمانا ردیف ہے
یہ نظمِ کائنات بھی کتنی لطیف ہے

سُخن میں یُوں تو بہت موقعِ تکلّف ہے
خودی خُدا سے جُھکے بس یہی تصوّف ہے
کوئی عظیم نتیجہ ضرور ہے ملحوظ
نظامِ جسمِ بشر میں بڑا تکلّف ہے
خدا کا شوق نہ ہو آخرت کا ذوق نہ ہو
اسی کا نام ہے دُنیا تو لائقِ تُف ہے
بسانِ تیغ کبھی سُرخرو یہ ہو نہ سکی
عجب نہیں کہ اسی سے تفنگ پر تُف ہے

حسین جیسے ہو تم یونہی جو خوش اخلاق ہو جاتے
زمانہ مدح کرتا شہرۂ آفاق ہو جاتے
حواس ہوش رخصت ہو چکے دم بھی نکل جاتا
تو فطرت کے جو قرضے ہیں وہ سب بیباق ہو جاتے

بے مثل فائدہ ہمیں دل کے سبق سے ہے
خلوت میں انجمن کا مزا یادِ حق سے ہے

خلق مجھ سے طالبِ پابندئ اخلاق ہے
میری یہ حالت کہ مجھ پر تھینک یُو بھی شاق ہے
دل کے ٹکڑے کر دیئے غم نے جگر خُوں ہو گیا
ہوش کا یہ تو ستم دیکھو کہ اب تک چاق ہے

یار کا حسن سب پہ فائق ہے
واقعی دیکھنے کے لائق ہے
ان مصائب سے کام لے اکبرؔ
غم بڑا مدرکِ حقائق ہے

دوسروں پر نکتہ چینی کا تجھے کیوں شوق ہے
اپنی اپنی خو ہے اکبرؔ اپنا اپنا ذوق ہے

صوفیٔ باصفا کا بھی اچھا مذاق ہے
اس فلسفے میں ہوش کا آنا فراق ہے

ہر کس و ناکس سے دُنیا میں تملّق کیجئے
یا جہاں تک ہو سکے ترکِ تعلّق کیجئے

فقط سڑکوں سے تسکینِ نگاہِ چشمِ شرقی ہے
اندھیرا ہے گھروں میں راستوں میں لمپ تی ہے

عشق کے معنے کے عالم تھے مگر عاشق نہ تھے
صُورتِ عذرا سے واقف تھے مگر وامق نہ تھے

پھنسا ہوں زندگی میں سانس رو کے رُک نہیں سکتی
مگر دُنیا کی خاطر میری گردن جھک نہیں سکتی

تیری باتیں رہِ تحقیق کی سالک ہی نہیں
میں نہ مانوں گا کہ میرا کوئی مالک ہی نہیں
لُطف جب تھا کہ مُنی اور رشی رہتے تھے
ہردوار اب وہ نہیں اور وہ سوالک ہی نہیں

شکر ہے سنّی و شیعہ کا ارادہ نیک ہے
طرزِ طاعت دو سہی ترکیبِ کالج ایک ہے
گھر میں گو یہ فرق ظاہر ہو کہ حلوا یا پلاؤ
خوانِ مغرب پر مگر دونوں کے آگے کیک ہے

آنکھ مجبور نہیں بُت کو اگر تکتی ہے
ہو خدا پر جو نظر بند بھی ہو سکتی ہے

یہ لفظ تو ہیں برائے معنی مگر نہایت ہی ہیں یہ ناقص
زبان پیچھے ہی رہ گئی ہے نگاہِ دل دُور تک گئی ہے

کافی اگرچہ لیٹنے کو اک پلنگ ہے انگڑائیوں کو عرصۂ دُنیا بھی تنگ ہے

قومِ ضعیف تنگ ہی چندوں کی مانگ سے کالج کے جیونٹے لپٹے ہیں ٹڈی کی ٹانگ سے
عالم ہیں چپ جو مستند و باوقار ہیں گو نجا ہُوا پریس ہے وفاتی کے سانگ سے

یہ دنیا اپنے سازوں میں اک روز بھی خوش آہنگ نہ تھی
وہ کون زمانہ گزرا ہے جب حرص نہ تھی جب جنگ نہ تھی
ہاں نفس کے بندے لڑتے ہیں شوکت کیلئے دنیا کیلئے
جو حق کی طرف سے مصلح ہیں ہیں تیغ بکف عقبیٰ کے لئے

واعظ کا جو ارشاد ہے وہ ریزنیبل[1] ہے رندوں کی یہ مستی بھی مگر سیزنیبل[2] ہے

گو سعی ہوائے شوق نے کی بُو اُس کی نہ نکلی محفل سے مجنوں نے اڑائی خاک بہت لیلیٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دُنیا کے تغیّر کا نہیں حسن شیدائے جمالِ باری کو پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگِ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت نہ خنجر تھا گلا آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

جلوہ گر ہی حسنِ بُت وقت اضطرابِ دل کا ہے اللہ اللہ اے ذوقِ عرفاں سامنا مشکل کا ہے
تیرے مجنوں کے بیاباں کا ہے عالم دوسرا جو بگولا ہے وہ اک ناقہ کسی محمل کا ہے

---

[1] معقول [2] موافق موسم

ذرّہ ذرّہ ہے طریقِ عشقِ حق میں دل نواز
ہر قدم پر سالکِ رہ کو گماں منزل کا ہے

بحرِ ہستی خود حدوں سے اپنی ہے ناآشنا
اک تلاطم ہے بپا کس کو پتا ساحل کا ہے

یہ نظر کی ناتوانی یہ بتوں کی زینتیں
کیا کہوں اکبرؔ بس اب اللہ مالک دل کا ہے

کیا شان ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

پھنستی ہے اگر تو صرف مچھلی
کہنے کو تو جل بھی جال میں ہے

نیٹو کی گزر ہے دال ہی پر
کالا اسی طرح دال میں ہے

نہیں جب اپنی ملّت کا اصولِ مستقل کوئی
کرے کیا رکھ کے سینے میں وفا اندیش دل کوئی

ہم پر الزام کے دھبّے جو ہیں دُھل جائیں گے
حسبنا اللہ کے معنے کبھی کُھل جائیں گے

کیا تصوّر ہے کہ دل جس سے دہل جاتا ہے
دم نکلتے ہی وہ قانون بدل جاتا ہے

وہی فطرت کہ جو تھی حفظِ بدن پر مامور
اسی فطرت سے بدن خاک میں گل جاتا ہے

قیّوم وحیّ کا ہے تصوّر معیّنِ رُوح
فانی کا شوق فتنۂ ہستی کا جال ہے

مضموں ملا جو موج میں نقشِ برآب کا
بیخود ہوئے حباب بھی ٹوپی اُچھال کے

اے شمع با فروغ ہے راہِ فنا میں تو
سالک بہت ہی کم ہیں تری چال ڈھال کے

بزمِ ہستی ہے طلسمِ بے مثالِ زندگی
خاک ہے پروانۂ شمعِ جمالِ زندگی

جسم بن کر جان سے لپٹی ہوئی آخر فنا
خاک تھی پروانۂ شمعِ جمالِ زندگی

ہے یہی دستور لیکن کس قدر افسوسناک
زندگی ہی کو سمجھ لینا مآلِ زندگی

عشقِ حسنِ آخرت میں چاہیے مستیٔ روح
موت سے آساں نہیں اکبر وصالِ زندگی

ہے دلیلِ نورِ باطن حُبِّ دُنیا کا زوال
موت کا مشتاق ہونا ہے کمالِ زندگی

خوبیٔ معنی کا ہے فطرت میں اکبرؔ اعتبار
حسنِ صورت میں نہیں جاہ و جلالِ زندگی

الحذر اُس درد سے جو مشتعل ہو کر رہے
الاماں اس یاد سے جو زخمِ دل ہو کر رہے

بزمِ ہستی میں رہا اکبر تو کیا اس کی خوشی
حکم جب یہ ہے کہ بجید مضمحل ہو کر رہے

بجائے مرحبا و آفریں فریاد اُٹھی دل سے
مجھے شرمندگی ہے قوتِ بازوئے قاتل سے

سکوت اولیٰ ہے کیا حاصل بیانِ حالتِ دل سے
تعجب خیز باتیں ہیں یقیں آئے گا مشکل سے

جنونِ پردہ در ہے شائقِ رسوائیِ مجنوں
عجب کیا ہے کہ اب لیلیٰ کو بھی وحشت ہو محمل سے

ضرورت کم ہے راہِ عشق میں خضرِ ہدایت کی
بہ قدرِ شوقِ سالک خود کشش ہوتی ہے منزل سے

بصیرت نے قیامت کی ہے اس بیدست و پائی پر
مصیبت میں پھنسا ہوں امتیازِ حق و باطل سے

جھکا سکتا ہوں میں سر کو زباں کو روک سکتا ہوں
جواب اس کا مگر کیا ہے کہ تو کافر نہیں دل سے

جنوں ہنگامۂ بے مدعا میں مست رہتا ہے
مُبارک سعی ہے اس کی کہ مستغنی ہے حاصل سے

بیانِ مدعا سے روک لیتا ہوں زباں اپنی
تمنا سے ہے مجبوری کہ وہ گستاخ ہے دل سے

تدبیر بشر پیشِ قضا چل نہیں سکتی
میں دیکھ چکا ہوں شدنی ٹل نہیں سکتی

ارمان کوئی اب مرے دِل میں نہیں آتا
ٹوٹی ہوئی جو شاخ ہے وہ پھل نہیں سکتی
مر جائیں مگر رکھیں گے ثابت قدم اپنا
ہے مرد میں جو دال کبھی گل نہیں سکتی

لاکھ آرائش کرے کوئی مگر اے جانِ جاں
جس کی زینت آپ ہیں رونق اسی محفل کی ہے

کھیل جینے کا کھیل ہی لیں گے
جو گذرتی ہے جھیل ہی لیں گے

معاذ اللہ کیا بیداد ہے تقدیرِ بسمل ہے
تڑپنا سامنے قاتل کے گستاخی میں داخل ہے
وہی قانونِ فطرت ہے جسے تقدیر کہتے ہیں
جسے قسمت سمجھتے ہیں وہ تدبیروں کا حاصل ہے

نفس میں اُلجھا ہے تو اکبر ابھی دِل دور ہے
راہ کے یہ خوشنما منظر ہیں منزل دُور ہے

جہاں میں عقل کی حسرت نکل نہیں سکتی
خدائی ذہن کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتی

جینے میں یہ غفلت فطرت نے کیوں طبع بشر میں داخل کی
مرنے کی مصیبت جانوں پر کیوں قدرتِ حق نے نازل کی
کیوں طول امل میں الجھایا انسان نے اپنے دامن کو
کیوں زلفِ ہوس کے پھندے میں پھنستی ہے طبیعت غافل کی
کیوں ہجر کے صدمے ہوتے ہیں کیوں مردوں پہ زندے روتے ہیں
کیوں جنگ میں جانیں جاتی ہیں کیوں بڑھتی ہے ہمت قاتل کی
منطق کا تو دعویٰ ایک طرف طاقت کی یہ شوخی ایک طرف

کیا فرق ہے خیر و شر میں یہاں، کیا جانچ ہے حق و باطل کی

کہاں ثبات کا اس کو خیال ہوتا ہے
زمانہ ماضی ہی ہونے کو حال ہوتا ہے

فروغِ بدر نہ باقی رہا نہ بُت کا شباب
زوال ہی کے لئے ہر کمال ہوتا ہے

میں جانتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال ہے
مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے

بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عزلت
دِل اپنا ہوتا ہے اپنا خیال ہوتا ہے

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

سوسائٹی سے الگ ہو تو زندگی دشوار
اگر ملو تو نتیجہ ملال ہوتا ہے

پسندِ چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں
بس اک کرشمۂ وہم و خیال ہوتا ہے

اگرچہ آہ سے تکلیف دِل کو ہو لیکن
ہوائے نفس میں کچھ اعتدال ہوتا ہے

نگاہِ لطفِ بتاں مطمئن نہیں کرتی
فریب ہی کا مجھے احتمال ہوتا ہے

خدا کا شوق ہو جس کو میں اس کا شائق ہوں
خدا کا یوں تو ہر اک کو خیال ہوتا ہے

اگرچہ ریش منڈانے سے ہو صفائی رُخ
گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہے

خودی کے اظہار میں دوئی ہو دوئی کو وحدت سے کیا تعلق
فراق اپنا کرے گوارا جو کوئی اس کا وصال چاہے

ابتدا گرمی کی ہے اپریل سے
اب میں گھبرانے لگا کھپریل سے

حضور سے سبب افسردگی کا کیا میں کہوں
نشاطِ طبع غلامی کے ساتھ مشکل ہے

کتمان رازِ عشق مرے آب و گل میں ہے
خاموش ہے زبان جو کچھ ہو وہ دل میں ہے
افعی زلفِ مِس کا تو سودا بُرا نہیں
پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے
ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی امیدوں کا
دِل تو بڑھتا ہے طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہو انجام
مگر اس عزم سے سانچے میں تو ڈھل جاتی ہے
وعدۂ بوسۂ ابرو کا نہ کر غیر سے ذکر
دل لگی میں کبھی تلوار بھی چل جاتی ہے

طبیعت تیری انجنیر کے آگے کیوں بدلتی ہو
یہ تیری سانس چلتی ہو تو کیا انجن سے چلتی ہے
کبھی سائنس کے ان دیوتاؤں سے ذرا پوچھو
یہ مشتِ خاک کیونکر جان کے سانچے میں ڈھلتی ہے
وہی بیخ شجر تحریک موسم بھی وہی لیکن
کوئی ڈالی تو رہ جاتی ہے کوئی شاخ پھلتی ہے
نہ اس میں دخل دولت کو نہ منطق کو نہ طاقت کو
دِلی حالت خدا ہی کی عنایت سے سنبھلتی ہے

اکبر شگفتگی سے بے گانہ ہو گیا ہے
پھر کیا اسے چمن کی کوئی ہوا کھلائے

دین کا ادعا ہے خلق میں سہل
حق ہو راضی یہ بات مشکل ہے
آمنوا میں تو سب کے آگے ہیں
عملوا الصالحات مشکل ہے
چشمِ ظاہر جسے نہ دیکھ سکے
اُس طرف التفات مشکل ہے
وصل ہو یا فراق ہو اکبر
جاگنا ساری رات مشکل ہے

اسٹیشن فنا کی بھی کیا خوب ریل ہے
اس راہ میں ہر ایک پسنجر کا میل ہے
غفلت نے کر دیا جنہیں آزاد وہ ہنسیں
میری نگاہ میں تو یہ دنیا ہی جیل ہے

عیش دنیا میں بہت ہے کہ مصیبت ہے بہت
اس سے پوچھو جو کوئی پیرِ کہن سال ملے

اُمیدِ راحت اس دُنیا میں تصویرِ خیالی ہے
کہاں ہے جامِ عیش ایسا کہ جو تلخی سے خالی ہے

کارِ دُنیا میں بھی یادِ مرگ غالب دل پہ ہے
راہ ہے زیرِ قدم لیکن نظر منزل پہ ہے

غنچہ کھل جائے تو پھر زینتِ محفل نہ سہی
خود شگفتہ رہے گلدستے میں داخل نہ سہی
زاہدِ خشک کی صحبت سے میں گھبراتا ہوں
سوزِ دل جب نہیں پھر کچھ نہیں جاہل نہ سہی
چشمِ کم سے یہ بتِ اکبر کو جو دیکھیں دیکھیں
ہے وہ مقبولِ حرم دیر کے قابل نہ سہی

دل وہ ہے جو باغِ ایماں کی ہوا سے پھول جائے
آخرت کی یاد میں دنیا کو بالکل بھول جائے
یہ ارادے ہیں تو ذکرِ مکتب و مسجد فضول
کہہ دو لڑکے سے خریدے ریڈ ٹاؤ اسکول جائے
پالسی کے باغ میں جھولے اُمیدوں کے بہت
جس کا جی چاہے وہ بر سوئے تکلّف جھول جائے

ذہن عالی اور ہے جمعیتِ دل اور ہے
علمِ منزل اور ہے اور قربِ منزل اور ہے

مصرعہ بہت بلیغ یہ اُن کی غزل میں ہے
شیخی تو مسئلوں میں ہے جنّت عمل میں ہے

بلا زینت بھی رنگیں دل کو راحت مِل ہی جاتی ہے
کلی پر دن گلشن ہو تو وہ بھی کھِل ہی جاتی ہے
بھروسا انتظامِ عافیت کا کیا ہے دنیا میں
کہ ہر بنیاد آخر اک نہ اک دن ہِل ہی جاتی ہے

تازگی رنگِ گل پژمردہ میں ممکن نہیں
کیا چلے بادِ صبا کی لطفِ شبنم کیا کرے
نیٹوویت پر کیا میں نے جو اظہارِ ملال
سن کے صاحب نے کہا "سچ ہے مگر ہم کیا کرے"
انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے
کبر ظاہر حرص غالب ذکرِ حق دیوانگی
اس جگہ کوئی سرِ تسلیم کو خم کیا کرے
چاہتا ہوں صرف اِک بوسہ دہانِ تنگ کا
خواہشیں اس سے زیادہ اب کوئی کم کیا کرے

خیر کب ہے عشق گیسو میں دلِ ناکام کی
دیکھتے ہو ہند میں حالت جو ہے اسلام کی
دیکھ کر تیری اُداسی ہائے اے شمعِ سحر
محو دل سے ہو گئی رونق چراغِ شام کی
واقعاتِ دہر سے دل بستگی کم کیجئے
پھر شکایت کم رہے گی گردشِ ایّام کی

حضرتِ اکبر مرے کس کام کے
ہیں تو مسلمان مگر نام کے
لے گئی ایمان تیری چشمِ مست
اہلِ نظر رہ گئے دل تھام کے

خالق سے دل لگانا اسلام ہے تو یہ ہے
ہر کام میں توکّل بس کام ہے تو یہ ہے
کرتا ہوں اللہ اللہ اور دل میں ہوں سمجھتا
کام آئے مرتے دم بھی وہ نام ہے تو یہ ہے
تکلیف صبر سہیئے آرام ہے تو یہ ہے
ناکردنی سے بچیئے بس کام ہے تو یہ ہے

اس قدر گستاخ دل سے شدتِ غم ہو گئی — آپ اپنے ساتھ ہمدردی مری کم ہو گئی
وہ طبیعت وہ امیدیں وہ مشاغل وہ نشاط — اب کہاں وہ بات تھی اک بزم برہم ہو گئی
دل تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ کچھ سمجھا نہیں — اب زباں بھی قائلِ وَاللّٰہُ اَعلَم ہو گئی
شاہدِ بزمِ ازل کے فیض کا کیا پوچھنا — خاک نے اتنی ترقی کی کہ آدم ہو گئی

ہو مسلمانوں کو شاید اب بھی عقبیٰ کا خیال
آخرت پر لیکن اب دنیا مقدّم ہو گئی

خدا کہاں ہے جواب اس کا ہر مقام میں ہے — نہ سمجھے کوئی تو کہہ دو کہ اپنے نام میں ہے
بغیر موت و مصیبت کے چل نہیں سکتا — عجیب راز یہ دنیا کے انتظام میں ہے

آنکھ محروم سہی لب پہ ترا نام تو ہے — تیری ہستی کا یقیں قاطع اوہام تو ہے
کہتی تھی سبز پری ہو کے سبھا سے خارج — راجہ اندر نہ سہی جلوہ گلفام تو ہے
برہمن دل میں اگر رام سے کہتا ہے کہ آ — بات یہ خوب ہے اک صورت آرام تو ہے

ہمیں تو خامشی میں اپنے دل سے کام لینا ہے — زباں وہ بزم میں کھولیں جنھیں انعام لینا ہے
نہایت خوشنما کھولی ہیں راہیں آپ نے لیکن — وہ رکھیں پاؤں جن کو اپنے سر الزام لینا ہے

سنو لتے تھے کہ اک عالم کی آنکھیں ہم کو دیکھیں گی — خبر کیا تھی ہماری مجلسِ ماتم کو دیکھیں گی

عالمِ معنی میں ہیں اتنا ہی ہم میں زور ہے — ہاتھ میں رعشہ ہے اب لیکن قلم میں زور ہے

سچّی خوشی جہان میں ہو بھی اگر تو کم ہے
بس غفلتیں ہیں طاری اور یہ نہیں تو غم ہے

میرا مسلک کچھ جُدا ہے شیخ کے اسلام سے
یاں خدا سے کام ہے اس کو خدا کے نام سے
یاں نگاہ خاص سے ہوتا ہے دل کو انبساط
اس کو راحت مِلتی ہے فطرت کے فیضِ عام سے
عشوۂ ساقی کا یاں طالب ہوں میں بہرِ سرور
اخذ کر لیتا ہے وہ مستی کو دورِ جام سے
ہے کفیل کار میرا یاں جنونِ صلح خیز
واسطہ رہتا ہے اس کو عقل جنگ انجام سے
مست رکھتے ہیں اُسے جھونکے ہوائے باغ کے
کام اِملی سے نہ اکبرؔ کو نہ مطلب آم سے

اگرچہ تکلیف نزع میں ہوں سکونِ خاطر بھی کم نہیں ہے
کسی سے مِلنے کی ہیں امیدیں کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

چشم و دِل میں عکس دنیا کا ہجوم عام ہے
مشتبہ ہنگامۂ ادراک کا انجام ہے
چشمِ ابراہیم در دورِ انجم و شمس و قمر
اس کو کہتے ہیں نظر اور عقل کا یہ کام ہے

اتنے ساتھی اُٹھ گئے اس بزمِ غم انجام سے
دل کو شرم آنے لگی اب خواہشِ آرام سے

کہاں حلوں سے شریعت کا کام چلتا ہے
فقط زباں سے بزرگوں کا نام چلتا ہے
ہوئی طریقِ بزرگاں کی پیروی مفقود
بس اُن کے نام پہ لٹھ صبح و شام چلتا ہے

فلسفہ غم کا جسے معلوم ہے
ہو مبارک وہ اگر مغموم ہے
کر دیا اس کو بصیرت نے خموش
اب تو اکبرؔ کی نظر کی دھوم ہے

مُسلّم پر عمل کرنے سے غافل نفسِ آثم ہے
جدھر دیکھو وہی بحثیں ہیں جن میں لا نُسلّم ہے

گھلایا شیخ کو اُس شوخ کے شیریں تکلّم نے
مٹایا زہد کی خشکی کو اک موجِ تبسّم نے

تصوّف ہی زباں سے دل میں حق کا نام لایا ہے
یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے

حضرتِ اکبر کا ان روزوں بڑا ہی نام ہے
پولوپوٹنی پر حُدی خوانی انھیں کا کام ہے

نہ مدحِ بت سے نہ آرائشِ کلام سے ہے
مری زبان کی عزّت خُدا کے نام سے ہے
یہ معذرت تو ملاقاتیوں سے آپ کریں
مجھے تو کام فقط آپ کے سلام سے ہے

کیا پوچھتے ہو دل کو مرے کیا مقام ہے
فطرت کے کارخانہ میں غم کا گُدام ہے

باغباں ہی کے یہ طالب ہیں ہوا سے غافل
پختگی کی نہیں اُمید کچھ ان خاموں سے

الم ضعیف ہو لذّت اگر عدم ہو جائے
خوشی کو مُنہ نہ لگاؤ تو غم بھی کم ہو جائے

کیوں یہ کہتے ہو ہر اک میں وہ اثر جو ہم میں ہے
تم کو کیا معلوم اکبر کون کس عالم میں ہے

ہمیں چمکیں ہمیں اُبھریں عبث دل پہ ہوا اس غم کے
کرو حمدِ خُدا سمجھو خُدا چمکا تو ہم چمکے
یہاں مستِ بادۂ عبرت ہوا ہوں اس تصوّر سے
کہ وہ ذرّے بھی اب اک جا نہیں ہیں ساغرِ جم کے

سارى دنیا آپ کی حامی سہی　　ہر قدم پر مجھ کو ناکامی سہی
نیک نام اسلام میں رکھے خدا　　کفر کے حلقے میں بدنامی سہی

چھوٹے ہی دنیا میں ہوتے ہیں زیادہ کم بڑے　　سب مگر لڑتے ہیں اس پر تم بڑے یا ہم بڑے

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی
زور آزمائیاں ہوئیں سائنس کی بھی خوب　　طاقت بڑھی کسی کی کسی میں نہیں رہی
دنیا کبھی نہ صلح پہ مائل ہوئی مگر　　باہم ہمیشہ برسرِ پیکار و کیں رہی
پایا اگر فروغ تو صرف اُن نفوس نے　　جن کی کہ خضرِ راہ فقط شمعِ دیں رہی
اللہ ہی کی یاد بہر حال خلق میں
وجہ سکونِ خاطرِ اندوہگیں رہی

جس نے دل کو لے لیا ہے دل لگی کے واسطے　　کیا تعجب ہے کہ تفریحًا ہماری جان لے

وہی الم وہی سوزِ جگر فغاں بھی وہی　　وہی زمیں کا چلن دورِ آسماں بھی وہی
بھرا ہوا ہے مضامینِ غم سے مکتبِ دہر　　فلک کا کورس وہی میرا امتحاں بھی وہی
ہیں صاف گو وہ ستم گر خدا ہی خیر کرے　　مری زباں بھی وہی اور وہ بدگماں بھی وہی
نہ اُن سے میری صفائی نہ ان سے میرا بگاڑ　　کدورتیں بھی وہی اور چنیں چناں بھی وہی
حرم نظر میں ہے قسمت ہے دیر سے اٹکی　　خدا کا گھر بھی وہی بُت کی شوخیاں بھی وہی
مذاقِ بزمِ احبا جو کچھ ہو اسے اکبر
مری زباں بھی وہی اور مرا بیاں بھی وہی

ہے منع ملاقات مری ہم نفسوں سے — فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے
تعداد وہی انگلیوں کی گو ہے بدستور — بیگانگی ساعد و بازو ہے دسوں سے
ہے حکم کے جس پالسیوں کے ہو مطابق — اب کام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے
چوری نہ کبھی کی ہے نہ کرنے کا ارادہ
پھر بھی یہ ضرورت ہے کہ بھاگوں عسسوں سے

خموش شمع صفت کیوں نہ ہو زباں میری — کہ خود ہی بزم میں روشن ہے داستاں میری
اگرچہ عقل سے کرتا ہوں میں حفاظت جاں — مگر نہ عقل مرے بس کی ہے نہ جان میری

اگرچہ قدرت ہی بولنے کی مگر فسردہ دلِ حزیں ہے — عجیب حالت ہوئی ہی پیدا زبان باقی ہی مُنہ نہیں ہے
جہان فانی کی اتنی وقعت تمہارے ہی فلسفے میں ہوگی — مرا عقیدہ تو یہ نہیں ہے کہ جو خدائی میں ہے یہیں ہے
نہیں ہی قومی چمن میں قائم جہاں ضرورت وہیں شگفتہ — دلِ ان کا گُلّے کا پھول ہی اب کبھی کہیں ہی کبھی کہیں ہے
بہت نہ رونے سے یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوشِ سرشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایتِ ظرفِ آستیں ہے

مبارک اُن کو جو حالات طبقات زمیں سمجھے — پہنچ وہ بھی گئے زیرِ زمیں جو کچھ نہیں سمجھے

بزمِ طرب میں بھی جو حزیں تھے حزیں رہے — دل اُس کا اُس کے ساتھ ہے کوئی کہیں رہے
رکھیں نہ ہم سے دوست امیدِ نشاطِ طبع — گو انجمن وہی ہے ہم اب وہ نہیں رہے
پیدا زیادہ سب سے دلیلیں ہمیں نے کیں — اور شبہے میں بھی سب سے زیادہ ہمیں رہے
کرتے تمام عمر گُماں اور یقیں رہے — آخر میں کی نظر تو جہاں تھے وہیں رہے

یہ سانس نہیں ہے سینے میں اک پھانس بشر کی جان میں ہے
درد اُس کا مگر محسوس نہیں غفلت کا خمیر انسان میں ہے
دنیا کی اُمید اور اس کے مزے دنیا کی چمک دنیا کی صدا
کب ہم کو سمجھنے دیتی ہے کس درجہ کمی ایمان میں ہے
جو ہجر کے معنے سمجھے ہیں ہے موت وصال اُن کے حق میں
لیکن یہ سمجھ ہر اک کی نہیں یہ بات فقط عرفان میں ہے

فروغِ دل اب نہیں ہے باقی وہ سوز و ساز اس میں اب کہاں ہے
یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے

دلِ شکستہ میں ایمان رہ سکے تو رہے اُجاڑ گھر میں یہ مہمان رہ سکے تو رہے
دلِ ضعیف کو چارہ نہیں ہے کفر سے اب اگر زبان مسلمان رہ سکے تو رہے

ہمہ تن درد کا مضمون ہوا جاتا ہے حالت ایسی ہے کہ دل خون ہوا جاتا ہے
اتفاق امرِ مصیبت کو میں سمجھا تھا مگر اب وہ میرے لئے قانون ہوا جاتا ہے

رگِ جاں پر ہے جب مضراب ہجراں میں کیا ہوگی جہاں یہ سوز ہے اس ساز سے تسکین کیا ہوگی
کہاں اور کس طرف قائم کروگے یادگار اُن کی دمِ آخر یہ ذکر اُن سے کرو یا سین کیا ہوگی
بتانِ دیر میں پرستش مری ہو یا نہ ہو اکبر جو ہو اعزاز کیا ہوگا۔ نہ ہو توہین کیا ہوگی

رندی میں ذرا خوف بتوں کا نہ کریں گے ڈرنا کبھی ہوگا تو خدا ہی سے ڈریں گے

اس حُسن کے عاشق کو فنا ہو نہیں سکتی　　جو آپ پہ مرتے ہیں وہ ہرگز نہ مریں گے

جائے تیری ہی محبّت میں مجھے وہ جان دے　　عیش و کلفت میں رہے محفوظ وہ ایمان دے
منتشر رہتا ہے مکروہات دنیا سے بہت　　اِس دل مضطر کو یا اللّٰہ اطمینان دے

خوب ہے مرگ و فنا سے جو مٹے میری خودی　　اور اُسے واصلِ حق پر توِ عرفاں کر دے
گل کو کیوں اس کا الم ہو گا کہ وہ گُل نہ رہا　　ارتقا اُس کو اگر عارضِ جاناں کر دے

آپ کے لطف سے اللّٰہ بچائے دل کو　　ہم تو سمجھے ہیں بلا آپ کے احسان کو بھی

اللّٰہ تو بے شبہ وہیں ہے کہ جہاں تھا　　مُسلم سے تو پوچھو وہ یہیں تھا کہ جہاں ہے

بحث کی خو اور ہے اور عشق یزداں اور ہے　　رنگِ مذہب اور ہے اور نورِ ایماں اور ہے

مرے خورشید سے سوا ان کا رُخِ گلفام روشن ہے　　یہی جلوے وہ ہیں جن سے خدا کا نام روشن ہے
مرے دل پر ہے شمع صبح کی افسردگی چھائی　　ترا رُخ زلف میں مثلِ چراغِ شام روشن ہے

جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا خیال اُن کا زبان میری

چھیڑنا اچھا ہے سازِ سعی کا اس بزم میں　　آدمی کو زندگی میں اک نہ اک دُھن چاہیے

ہو دسمبر میں مبارک یہ اچھل کود آپ کو — خون مجھ میں بھی ہے لیکن مجھ کو پھاگن چاہیئے

ہے تحتِ فلک میں جو زمیں ہے — دنیا اچھّی جگہ نہیں ہے
شک اس میں نہیں کہ ہے وہی وہ — ہم میں لیکن ہمیں نہیں ہے

کان میں بات بزرگوں کی سماتی ہی نہیں — ناک میں دم ہے جوانی کے خریداروں سے

گو ہو گئے شکم کے مطالب کے ترجمان — افسوس ہے کہ دل کے زباں داں نہیں رہے

سامنا ہر قدم قیامت کا مجھے جینے میں ہے — کچھ نہ پوچھو کس قدر بے چین دل سینے میں ہے
کیا ثباتِ عمر بس اک جنبشِ فطرت کی دیر — زندگی کیا ہے فقط اک عکس آئینے میں ہے

اجل آ پہنچی قبل اس کے کہ سمجھیں رازِ ہستی کا — بگاڑا موت نے اور یہ نہیں سمجھے بنے کیوں تھے

پڑھیں میں شیخ ہیں مسجد اُجاڑ۔ ایوان خالی ہے — کتب خانہ بھرا جاتا ہے اور میدان خالی ہے
جو کچھ چاہیں سنائیں اور بٹھائیں وہ مرے دل میں — کہاں روزوں ہی میری آنکھ بند اور کان خالی ہے

زبان ولفظ کا جلوہ فقط حدِّ بیاں تک ہے — تسلسل موجِ معنی کا خدا جانے کہاں تک ہے
خدا کی راہ میں بے شرط کرتے تھے سفر پہلے — مگر اب پوچھتے ہیں ریلوے اس میں کہاں تک ہے
تمہارے مذہبی دعوے جو کچھ ہوں میں یہ دیکھوں گا — عقیدوں کا اثر فکرِ معیشت پر کہاں تک ہے
میں اپنے دل کی قیمت عرض کر ہی دوں گا بالآخر — مگر ارشاد تو ہو آپ کی نیّت کہاں تک ہے

خدا ہی کی ہدایت کرتی ہے نورِ یقیں پیدا ۔۔۔ دلیلوں کی رسائی تو فقط وہم و گماں تک ہے
کہو ملّت کے لیڈر سے وہ مذہب سے نہ ہو غافل ۔۔۔ کہ قومی زندگی کچھ ہے تو بس اس نیم جاں تک ہے
ترقی خواہ دل کو آہ سوزاں چاہیئے اکبرؔ ۔۔۔ یہی شعلہ وہ ہے جس کی بلندی آسماں تک ہے

جنوں کا ادّعا حدّ تکلّف میں نہ کر اکبرؔ!
گریباں چاک ہے تیرا مگر دیکھوں کہاں تک ہے

معنی کی گرہ کہاں کھُلی ہے ۔۔۔ الفاظ ہی کی دُکان کھُلی ہے
ہر واہ کی تہ میں ہے یہاں آہ ۔۔۔ دم بند ہے اور زباں کھُلی ہے

نظرِ نثارِ نقوشِ ظاہر، یہ ہوشِ دنیا کا پاسباں ہے ۔۔۔ جو یہ نگاہیں ہیں ایسا دل ہے تو آخرت کا پتا کہاں ہے

اس بزم میں کیا آثار ملے ہنگام سحر ساما نوں کے ۔۔۔ اک داغ تھا شمع مردہ کا کچھ پَر تھے ٹوٹے پروانوں کے
ہستی کی یہ لہریں دامِ نظر دم بھر میں نشاں ان کا نہ اثر ۔۔۔ گردابِ فنا میں غرق ہیں سب دریا ہیں رواں افسانوں کے
دِل لذّتِ نفس کا گرویدہ دنیا کی حقیقت پوشیدہ ۔۔۔ اُمڈے ہیں فریبِ امیدوں کے طوفاں ہیں بپا ارمانوں کے
ہر گام پہ ہیں قبروں کے نشاں ہر سمت ہے اک عبرت کا سماں ۔۔۔ اُجڑا ہے محل آبادی کا آباد ہیں گھر ویرانوں کے
دولت ہیں جو شرطِ عصیاں ہو بہتر ہے کہ قانع انساں ہو ۔۔۔ غالب جو نہ ہوں شیطانوں پر تابع نہ ہوں شیطانوں کے
یہ مدعی اسلام تو ہیں ساتھی ہیں مگر بیگانوں کے ۔۔۔ تقوے کی وہ بُو ہی ان میں نہیں وہ رنگ نہیں ایمانوں کے

تھی عقل زباں پر اے اکبر اور عشق پہ رکھی ہم نے نظر
ممتاز ہے ہشیاروں میں سرخیل ہے دیوانوں کے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی ۔۔۔ شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

ہمارا دل ہے عمارت کے ولولوں کے لئے
زمانہ کہتا ہے یہ سب ہیں زلزلوں کے لئے

ہنسنا بھی یہاں ہے رونا بھی دلکش بھی ہے دُنیا فانی بھی
جینا بھی ہے اور آبادی بھی مرنا بھی ہے اور ویرانی بھی
اللہ ہی ہے ان لڑکیوں کا فرفر بھی بنیں حد میں بھی رہیں
ہے کورس بھی ان کا سیکھی اور پاس شدہ اُستانی بھی

جو انقلاب گذشتہ ہے اک کہانی ہے
جو انقلاب کہ درپیش ہے وہ فانی ہے
اُلجھ کے دامِ حوادث میں آخرت کو نہ بھول
جو خوش نصیب ہے اس نے یہ بات مانی ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اس کے لئے لٹھ تان سکے
مذہب نے ہمیں پہچان لیا ہم اس کو نہیں پہچان سکے

کرے گا قدر جو دنیا میں اپنے آنے کی
اُسی کی جان کو لذّت ملے گی جانے کی
نہ پوچھو بیٹھا ہوں کیوں ہاتھ پر ہیں ہاتھ دھرے
اُٹھوں گا۔ نبض ذرا دیکھ لوں زمانے کی
مزا بھی آتا ہے دُنیا سے دل لگانے میں
سزا بھی ملتی ہے دنیا سے دِل لگانے کی
گہر جو دل میں نہاں ہیں خدا ہی دے تو ملیں
اُسی کے پاس ہے مفتاح اس خزانے کی
یہ شرط ہے کہ کرو اتباعِ حکمِ رقیب
غضب یہ ہے کہ ضرورت ہے دل لگانے کی
خیالِ وسعتِ تحقیق تا کجا اکبر
کہ ہر نگاہ ہے محتاج اک فسانے کی

نہ ایک رہ نہ سکے تو خوشی سے پون بنے
یہاں تو کچھ نہ بنے بے وقوف کون بنے

ایسا جو ہو تو شائد یہ دل رہے ٹھکانے ۔۔۔ دنیا کو میں نہ جانوں دنیا مجھے نہ جانے

دیکھ ہی لیں گے نتیجہ کفر کا یہ خام طبع ۔۔۔ تیری رونق اک دن اے ایمان ہو ہی جائے گی

کھانے سے اگر جینا ہو تا مرتے نہ کبھی کھانے والے ۔۔۔ کھانا بھی خدا کے حکم سے ہے جینا بھی خدا کے حکم سے ہے
ایمان سے اُلفت رکھتا ہوں شیطان کو دشمن جانتا ہوں ۔۔۔ الفت بھی خدا کے حکم سے ہے کینا بھی خدا کے حکم سے ہے
رہتا ہوں میں مستِ عہدِ ازل اور شیشۂ دل ہے زیرِ بغل ۔۔۔ مستی بھی خدا کے حکم سے ہے پینا بھی خدا کے حکم سے ہے

ہر چند با اثر ہے تدبیر باغباں بھی ۔۔۔ لیکن بہار بھی ہے اک چیز اور خزاں بھی
دورانِ سر کی اپنے میں کیا کروں شکایت ۔۔۔ گردش میں ہے زمیں بھی چکر میں آسماں بھی

تمناؤں کی حالت کچھ نہ پوچھو دل کے بجھنے پر ۔۔۔ اندھیرے میں نہیں معلوم پروانوں پہ کیا گزری
صدی ہے چودھویں اور انقلابوں کی نہیں کچھ حد ۔۔۔ خدا ہی کو ہے علم اس کا مسلمانوں پہ کیا گزری

تجھ کو بھلا کے آپ فقط ہیں کو دیکھئے ۔۔۔ ھم کا زمانہ اب نہ رہا میں کو دیکھئے

عیش فردا کی امیدیں حایہ ہیں ۔۔۔ طفل طبعوں کو کھلانے کے لئے

جان اڑی جاتی ہے حس موجود ہے دل خون ہے ۔۔۔ نزع طاری ہوش حاضر یہ عجب مضمون ہے

عبادت ترک ہے اور ہر طرف نعرے ہیں قوموں کے ۔۔۔ تماشے مشرقی پتلون میں ہیں مغرب کے جادو کے

چل بسے اسبابِ غفلت چشمِ عبرت رو چکی | میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی
خواب آور ہو نہیں سکتا بیانِ عاشقاں | ہے اگر افسانہ گو مجنوں تو لیلےٰ سو چکی

خوانِ ایوانِ فلک سے کم کر اکبرؔ اب امید
صبر کر نانِ جویں پر تیری باری ہو چکی

شگفتہ کس قدر بیلا ہے کتنی مست جوہی ہو | ترا ہی رنگ ہو گلشن میں خوشبوؤں میں تو ہی ہو
خدا کے شوق کا جن پر اثر ہو دیدنی وہ ہیں | خدا کے نام کی ہم ہیں تو خالی گفتگو ہی ہو
دل اپنا دوست ہو کر جب دکھاتا ہے غلط راہیں | تو ان کی آنکھ کو میں کیا کہوں وہ تو عدو ہی ہو

اکبرؔ تم اگر شرکِ خفی پر بھی ہنسو گے | سب تم سے الگ ہوں گے مصیبت میں پھنسو گے

جو اسِ عرقِ حیرت کو مجالِ گفتگو کیا ہے | میں کب کہتا ہوں میں وہ ہوں وہی کہتا ہو تو کیا ہے

کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے | کوئی پا رہا ہے کوئی کھو رہا ہے
کوئی تاک میں ہو کسی کو ہے غفلت | کوئی جاگتا ہے کوئی سو رہا ہے
کہیں نا امیدی نے بجلی گرائی | کوئی بیج امید کے بو رہا ہے

اسی سوچ میں میں تو رہتا ہوں اکبرؔ
یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے

دل تو ہے پاس مرے عقل پہ قابو نہ سہی | شہرتِ قیس تو حاصل ہے ارسطو نہ سہی

اللہ کی تلاش جو ہو کچھ بھی جانیے جو کہہ رہے ہیں آپ یہی ہو بھی جائیے
بیدار ہی حواس ہے ظلمت کدے میں بار افسانہ سُن لیا ہے تو اب سو بھی جائیے

* * *

اے چرخ مجھے نہ بہ سے اکراہ کہاں ہے لیکن بتِ خود بین کی طرف راہ کہاں ہے
اسلام کے دعوی سے میں باز آتا ہوں صاحب یہ کون بتلائے تمہیں اللہ کہاں ہے
سروس میں میں داخل نہیں۔ ہوں قوم کا خادم چندوں کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

* * *

فسانے رہ گئے وہ ہیں نہ ان کا جاہ باقی ہے وہی دنیائے فانی ہے وہی اللہ باقی ہے
مجھے دشوار ہے ان غافلوں کا ہم نوا ہونا مرے سینے میں جب تک یہ دلِ آگاہ باقی ہے

* * *

وہ قبلہ رو ہیں جنہیں رو براہ ہونا ہے بہک گئے ہیں وہ جن کو تباہ ہونا ہے
جو آج ساکت و خائف ہیں ساتھ طاعت کے انہیں کو حشر میں سب پر گواہ ہونا ہے

* * *

خرد نے ذہن کی حالت تباہ پائی ہے خدا کے نام میں دل نے پناہ پائی ہے
رہا نہ ہوش میں تقوئے جدھر اٹھیں آنکھیں بتِ حسیں نے غضب کی نگاہ پائی ہے
یہ عشق ہی ہے کہ منزل ہے جس کی اِلا اللہ خرد نے صرف رہِ لَا اِلٰہ پائی ہے

* * *

وعظِ الحاد کہو واہ نہیں ہے نہ سہی تم سلامت رہو اللہ نہیں ہے نہ سہی
شب غفلت میں نہ ہو روزِ ازل کا پرتو لمپ بجلی کا تو ہے ماہ نہیں ہے نہ سہی
ہے گدام آپ کا مسجد کی ضرورت کیا ہے پیٹ تو ہے دلِ آگاہ نہیں ہے نہ سہی
ہے میسر ہاں پائے تقلم کے لئے موجود اے دوست سر کو سجدے سے اگر راہ نہیں ہے نہ سہی

جس کے سینے میں دلِ آگاہ ہے — اس کے لب پر اللہ ہی اللہ ہے
منزلِ قومی سے آتی ہے صدا — جو نہیں ہے قبلہ رو گمراہ ہے
ساری دنیا کو جو چھوڑے بہرِ حق — ساری دنیا میں اُسی کی واہ ہے
لا الٰہ آسان ہے سائنس میں — فلسفے میں مشکل الا اللہ ہے
قبر پر کر اک تعمق کی نظر — بحرِ ہستی کی یہیں پر تھاہ ہے
دورِ قرآن و تجارت ہو چکا — اب زمینداری ہے یا تنخواہ ہے

حامں کا چمکی نہ تھی انگلش سی جب بیگانہ تھی — اب ہی شمع انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

قدمِ شوق بڑھے راہ ملے یا نہ ملے — ماسوا ترک کر اللہ ملے یا نہ ملے

جلائے جب شعلۂ تحیر تو ذہن ڈھونڈے پناہ کس کی — یہ کس کے معنے ہوئے ہیں ثابت یہ صورتیں ہیں گواہ کس کی
یہ چشمِ لیلیٰ کہاں سے آئی یہ قلب مجنوں کہاں سے ابھرا — جو باخبر ہیں انھیں خبر ہے نگاہ کس کی ہے آہ کس کی
جمالِ فطرت کے لاکھ پرتو قبول پرتو کی لاکھ شکلیں — طریق عرفاں میں کیا بتاؤں یہ راہ کس کی وہ راہ کس کی

یہ کس کے عشووں کا سامنا ہے کہ لذتِ ہوش ہو گئی گم
خودی سے کچھ ہو چلا ہوں غافل پڑی ہے مجھ پر نگاہ کس کی

قدم رکھتا ہے وہ اس میں جسے جو راہ ملتی ہے — صداقت ہو تو ہر سُو داد خاطر خواہ ملتی ہے

اب زباں ساکت ہے خوفِ سامع بدخواہ سے — دل یہ کہتا ہے ملے گی چپ کی داد اللہ سے

اب کہاں وہ راحتِ دلخواہ اٹھتے بیٹھتے — کرلیا کرتے ہیں یا اللہ اٹھتے بیٹھتے

ابتدا میں غفلتوں پر واہ ہے — انتہا میں اللہ ہی اللہ ہے

محوِ کار اس بزم میں ہر شمع ہر پروانہ ہے — حسرت اُس پر ہے جو صرفِ قصّہ و افسانہ ہے

ہیں مست اُس مزے میں جو ہم نے چکھ لیا ہے — صراف کی نظر نے ہم کو پرکھ لیا ہے
اغیار کے عمل کو ہوں گے کچھ اور میداں — ہم کو تو اب فلک نے کالج پہ رکھ لیا ہے

دل میں تو ضعف عقیدت کو کبھی راہ نہ دے — کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

شاعر جو ملازم ہوا اکبر ذوقافیتیں اسکا ہے لقب — پوچھو گے یہ کیوں توضیح سنو تنخواہ بھی ہے اور رواہ بھی ہے

میں تو کہتا ہوں کہ یارو اللہ ہی اللہ ہے — منکروں کی اس صدا سے صدمۂ جانکاہ ہے
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ہیں اللہ کے سوا — ماسوا کی فکر سے پھر کیوں تجھے اکراہ ہے
بات ٹالی میں نے یہ کہہ کر کہ وقتِ احتیاج — میرا مسلک بھی وہی ہے جو تمہاری راہ ہے

نہیں وقوع حوادث میں کچھ یہاں غلطی — یہ بات یوُنہی ہے۔ جو تیرے دل میں ہو کہہ لے
ہزار بار جو وقتِ گذشتہ پھر آئے — ہزار بار وہی ہو جو ہو چکا پہلے

خدا کی یاد ہے طاقت ہماری — مُصلّٰے ہے ہمارا تختِ شاہی

ہماری فوج ہے اخلاقِ حسنہ — ہمارا حصن ہے ترکِ مناہی
بلند اپنی نظر ہے فضلِ حق سے — کرے گی کیا کسی کی کم نگاہی

اِس کا پسیجنا ہے اور اُس کے ہیں بھپارے — یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے
اس خوانِ مغربی سے بچتا ہے کون لیکن — حضرت نگل رہے ہیں بندے نے چکھ لیا ہے

ہے ہوائے چمن دہر اُنھیں کے رُخ پر — اُن کے کھِلنے کے یہ دن ہیں مرے مرجھانے کے

آپ کے عارض کے آگے کیا جمے گا اس کا رنگ — گل جو گلشن میں سنورتا ہے سنورنے دیجئے
ہو چکا بسمل۔ کہاں تک آفریں ہر وار پہ — واہ کی طاقت نہیں اب مجھ کو مرنے دیجئے

جی رہا ہوں فقط اب انتظارِ مرگ میں — سانس لینا رہ گیا ہے جان دینے کے لئے

عبث اظہارِ خودی میں ہے یہ مستی میری — وقت کے ساتھ اڑی جاتی ہے ہستی میری
خس و خاشاک بھی ہو جاتے ہیں شعلے سے بلند — سوزِ باطن کے نہ ہونے سے ہے پستی میری

حریفوں کے لئے ہنگامۂ مشقِ قوافی ہے — یہاں انشائے دِل کو آہ کا مصرعہ بھی کافی ہے
کہا جب میں نے ہوں بیمار تیری چشمِ فتاں کا — بتِ طنّاز نے ہنس کر کہا اللہ شافی ہے

اِن آنکھوں نے بہت نیرنگیاں فطرت کی دیکھی ہیں
مرے دِل نے بہاریں عالمِ حیرت کی دیکھی ہیں

خود ناتوان و مضطر اوروں کے رنگ پھیکے   کر رکھیں کیا کسی کو کیا ہو رہیں کسی کے

غم و شادی کی نیرنگی دلیلِ خود پرستی ہے   وہی دل خوب ہے جس کو فقط ہستی کی مستی ہے

وجد میں آئے حیرتوں میں رہے   عجز کے ساتھ لب کشائی کی
بندگی کا صلا ملے نہ ملے   داد دیدی مگر خدائی کی

ہر قدم کہتا ہے تو آیا ہے جانے کے لئے   منزلِ ہستی نہیں ہے دل لگانے کے لئے
کیا مجھے خوش آئے یہ حیرت سرائے بے ثبات   ہوش اُڑنے کے لئے ہے جان جانے کے لئے
دل نے دیکھا ہے بساطِ قوتِ ادراک کو   کیا بڑھے اس بزم میں آنکھیں اٹھانے کے لئے
خوب اُمیدیں بندھیں لیکن ہوئیں حرماں نصیب   بدلیاں اٹھیں مگر بجلی گرانے کے لئے
سانس کی ترکیب پر مٹی کو پیار آ ہی گیا   خود ہوئی قید اس کو سینے سے لگانے کے لئے
جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو۔ ہنس کر کہا   یاد پھر مجھ کو دلانا بھول جانے کے لئے
دیدہ بازی وہ کہاں آنکھیں رہا کرتی ہیں بند   جان ہی باقی نہیں اب دل لگانے کے لئے
مجھ کو خوش آئی ہے مستی شیخ جی کو فربہی   میں ہوں پینے کے لئے اور وہ ہیں کھانے کے لئے
اللہ اللہ کے سوا آخر رہا کچھ بھی نہ یاد   جو کیا تھا یاد سب تھا بھول جانے کے لئے
سُر کہاں کے۔ ساز کیسا۔ کیسی بزم سامعین   جوشِ دل کافی ہے اکبر تان اڑانے کے لئے
انتساب ایسے کمالوں کا شکم سے چاہیئے
جن کو تم حاصل کرو روٹی کمانے کے لئے

ٹپکتے ہیں وہ مضمونِ جنوں زا میرے خامے سے   کہ اکثر موش ہو جاتا ہے باہر اپنے جامے سے

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے انجمن میں ہوں مگر عالمِ تنہائی ہے

حُسنِ بُت یہ ہے تو اب یادِ خدا کی نہیں خیر یہ ادا ہے تو نمازوں کی قضا آئی ہے

محوِ حیرت وہ ہے اس پر ہے خموشی کی بہار آنکھ نرگس کی ہے سوسن نے زباں پائی ہے

طلبِ عشق کا اک جوش ہے فطرت سے عیاں جس طرف دیکھئے طوفان خود آرائی ہے

عشوۂ دہر سے ہیں مست بدن میں جانیں گم ہیں جو سوچ رہی ہیں کہ قضا لائی ہے

یہ مصیبت ناتواں دِل نے کبھی دیکھی نہ تھی پہلے بھی تکلیف اس کو تھی مگر ایسی نہ تھی

بے حواسی میں ہیں کچھ سمجھا نہیں اے ہم نشیں کیا دل پُر غم مرا تڑپا تھا یہ بجلی نہ تھی

فلسفی کی بات بھی میں نے سُنی واعظ کی بھی
جانبِ حق رہ نُما وہ بھی نہ تھی یہ بھی نہ تھی

مری دنیا جو تھی وہ ہو چکی کل اک کہانی تھی کوئی کہتا ہے فانی ہے میں کہتا ہوں کہ فانی تھی

عدو کی کَد ہو حامی تو بے کسی اولیٰ جو وصلِ ذوق شکن ہو فراق ہی اولیٰ

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

خدا ہی سے ہو اُمید اور وہ بھی عقبےٰ میں یہی ہے خوب۔ مناسب یہی۔ یہی اولیٰ

نظامِ مدعیٔ رہبری کو دیکھ اکبر مری نظر میں تو یہ تیری ابتری اولیٰ

مذہب کے یہ مباحث نِکلے ہیں ہسٹری سے اِن کو ہے کیا تعلق وحدت کی مسٹری سے

رہِ مقصود میں ہم بھی کبھی انجن چلاتے تھے مگر پتھر کے کوئلوں کے عوض بُت جھونکے جاتے تھے

کمربستہ خلوصِ دل سے حاضر رہ۔ تری خدمت | کسی دن مستحقِ الطافِ سلطانی کی ٹھہرے گی
ذرا سیرِ بہارِ عالمِ فانی کی ٹھہرے گی | نشاط افزا ہے منزل کچھ نشے پانی کی ٹھہرے گی

حجابِ تمکنت کو دور کرنا ہے زبیدہ سے | سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے

اب میری زندگی میں نہیں نورِ انبساط | یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی
جس پر پڑے گی سخت مصیبت زمانے میں | جو کچھ کہے گا ہو گی ہماری کہی ہوئی
سب کو فنا خدا کو بقا بات حق یہ ہے | میں کیا کہوں گا ہے یہ خدا کی کہی ہوئی
مرنے میں اس خیال سے تسکین ہے بہت | لی میری جاں اسی نے کہ تھی جس کی دی ہوئی

میری نگاہِ شوق پڑی خوش ہوئے یہ بت
اک چیز مفت مل گئی ان کو پڑی ہوئی

مٹ گئے ہیں مگر اک نقش ابھی باقی ہے | آنکھ مایوس ہے شوریدہ سری باقی ہے
آنکھ سے نور گیا دل سے گیا صبر و قرار | جان بھی جسم سے رخصت ہوئی ہی باقی ہے

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبرؔ
قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

فغان و آہ کی لذت جو دل ہلے تو ملے | نشانِ نکہتِ گل جب کلی کھلے تو ملے
وہ باغِ حسن ہیں لیکن ہے بندِ غنچۂ لب | مزا چمن کا اگر یہ کلی کھلے تو ملے
ہوئی جو صلح تو اب احتیاط یہ کیسی | تکلّفات کو تہ کیجیے ملے تو ملے
میں شکوہ کرتا تھا اس وجہ سے نہ ملتے تھے | جو ترک کر دیئے میں نے وہ سب گلے تو ملے

گھبرا رہا ہے تو زخموں کو اپنے اے اکبرؔ — پر اس کا لطف کوئی زخم اگر چھلے تو ملے

زبانیں بحث میں اُلجھی ہیں حیرت دل پہ چھائی ہے — حدیثوں میں مذاہب ہیں حوادث میں خدائی ہے

شکلِ اطمینان کم اس عالم فانی میں ہے — کامیابی بھی جہاں ہے اک پریشانی میں ہے
دولتِ دُنیا کی کیا لذّت ہے اہل جور کو — ساری قوت صرف جب اُسکی نگہبانی میں ہے
حضرتِ اکبر کو مشکل ہے بیانِ حالِ دل — گو یہ سُنتا ہوں کمال اُن کو سخن دانی میں ہے

ہند میں تو مذہبی حالت ہے اب ناگفتہ بہ — مولوی کی مولوی سے روبکاری ہوگئی
اِک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نِکلی تن سے جان — خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہوگئی
اپنے میلانِ طبیعت پر جو کی میں نے نظر — آپ ہی اپنی مجھے بے اعتباری ہوگئی
نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہوگئی — لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہوگئی

سازِ عیشِ مغربی کی دل نوازی کچھ نہ پوچھ
میں نے جس جس کو یہاں چھیڑا استاری ہوگئی

اس انجمن میں آکر راحت نصیب کس کو — پروانہ بھی جلے گا اور شمع بھی جلے گی
دنیا اُبھارتی ہے آج اپنے عاشقوں کو — مرجائیں گے تو ان کا کل نام بھی نہ لے گی
دُنیا کی آرزو سے خالق بچائے دِل کو — پیدا ہوئی تو پی کر خُون جگر پلے گی
عبرت زدہ جو دل ہو ارمان اس میں کیسے — بجلی گری ہو جس پر وہ شاخ کیا پھلے گی

جنّت بنا سکے گا ہرگز کوئی نہ اس کو
دُنیا یونہی چلی ہے اکبرؔ یونہی چلے گی

بس عشق و وفا ہی کی مرے دل میں ٹھنی ہے — ناصح کی میں سنتا نہیں ہو جو شدنی ہے
پردے نے میاں ہم کو بنا رکھا ہے اب تک — بگڑی ہوئی حالت ہے مگر بات بنی ہے

ہے زندگی اُسی کی فخرِ جہانِ فانی — جس نے فنا کو سمجھا مرنے کی قدر جانی
طوفانِ جوشِ دل کی آنسو میں اک جھلک ہے — موتی میں کیا دھرا ہے بس ایک بوند پانی
ہستیٔ آخرت سے اُمید ہے بہُت کچھ — بہتر کشد ز اوّل نقاش نقشِ ثانی

رکھی رہی نصیحت نافذ ہوئی مشیّت
کس نے سُنی کسی کی اور کس نے کس کی مانی

جہاں تک اپنے لئے ہوں وہ میں کی مستی ہے — جو کچھ خدا کے لئے ہوں وہ اصل ہستی ہے
نہیں ہے نشۂ وحدت میں خوفِ زلفِ بتاں — جو ہوش میں ہیں یہ ظالم اُنھیں کو ڈستی ہے
نہ بھول شہرِ خموشاں کا نقشہ اے کالج — خیال رکھ کہ یہی ہسٹری کی بستی ہے

بتوں کو مجھ سے توقع ہے مدح کی اکبر
یہ سُن لیا ہے کہ اردو زبان سستی ہے

نہایت فکر گو مذہب کو ہر خوش انتظامی کی — نہیں ہے موت کو پروا کچھ اپنی نیک نامی کی
طلب تحسین کی کیوں تجھ کو ہے بزمِ حریفاں سے — سرورِ طبع خود ہے داد تیری خوش کلامی کی
تمہارا انتظامِ دل اگر روشن نہیں اکبر — تو بتیوں کو نہ چمکائیں گی ترکیبیں نظامی کی

اللہ اللہ کتنی نازک وہ رنگیلی ہو گئی — نام ہی بوسے کا سنکر نیلی پیلی ہو گئی
سایۂ مغرب میں شوقِ دل نے پھیلائے تو پاؤں — چار ہی دن میں مگر پتلون ڈھیلی ہو گئی

جماعت منتشر ہو فطرتی مجلس تو باقی ہے — زبانیں بند کر دو دل کے اندر حس تو باقی ہے
اسی کا رنگ حیرت دیکھ کر بہلائیں گے دل کو — چمن سے گل اگر رخصت ہوا نرگس تو باقی ہے

یہ مصرعہ قافیے ہی کے لئے ہے خوب اے اکبرؔ
جو اُجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں پیرس تو باقی ہے

ملانا خاک میں فطرت جب اپنی دل لگی سمجھے — تعجب ہو کہ تو اس زندگی کو زندگی سمجھے

یہ عجب عمل ہے عجب اثر یہ عجیب نقش بھرے گئے — جو لچے بہت تو بچے ذرا جو کھری کہی تو دھرے گئے
تری بزم اکبرؔ خوش بیاں ہے محل فرحت دوستاں — جو ملول آئے وہ خوش گئے جو فسردہ آئے ہرے گئے

قومی ترقیوں کی زمانے میں دھوم ہے — مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

تیزیاں کرتے ہیں قانون بدلنے والے — زحمتیں سہتے ہیں قانون پہ چلنے والے

اِدھر فریاد بلبل ہے کہ یہ سب رنگ فانی ہیں — اُدھر رونا ہے شبنم کا کہ گل کی یہ ہنسی کیسی
کبھی خوانِ فلک سے کوئی نعمت میں نے چکھی تھی — مگر یہ بھی نہیں یاد اب کہ لذت اُس کی تھی کیسی
تماشائے جہاں اے بے خبر تجھ کو مبارک ہو — یہاں دل داغ حسرت سے بھرا ہے دل لگی کیسی
جہاں گھر تھا وہاں قبریں جہاں محل تھا وہاں شعلے — یہ ماتم خیز منظر سامنے ہے خوش دلی کیسی
گل مضمون سے اکبرؔ رنگِ خونِ دل ٹپکتا ہے — تری حالت یہ کیا ہے یہ غزل تو نے کہی کیسی

نہ سہی لطفِ لحم گھی ہی سہی — شیخ صاحب مہنت جی ہی سہی

زندگی کو ضرور ہے اک شغل خیر بالفعل لیڈری ہی سہی

دینِ آخرت کا واعظ دنیا ہوس کی بانی جھگڑے میں پڑ گئی ہے انساں کی زندگانی
الفاظ سے نہیں ہے تسکین اس کے دل کو اکبرؔ پہ رحم فرما اے خالقِ معانی

قصیدے سے نہ چلتا ہو نہ یہ دوہے سے چلتا ہے سمجھ لو خوب کارِ سلطنت لوہے سے چلتا ہے

کِبر بھی شرک ہی کی مستی ہے خود پرستی بھی بُت پرستی ہے

بھنڈار سے دیدوں گا بہ خوشی سیدھا جو گرو جی مانگیں گے
ہاں کام ذرا ٹیڑھا ہوگا بسکٹ کو جو سوجی مانگیں گے

مشتاق نہیں زندگی کے مرنا ہے تو کیا کریں گے جی کے
پائی نہ کسی میں بو وفا کی چاہا تھا کہ ہو رہیں کسی کے
توحید کا مسئلہ ہے اصلی باقی ہیں شگوفے ھسٹری کے
زندی کس کام کی یہ اکبرؔ ملتے نہیں جب کسی سے پی کے

گل ہوا چاہتی ہے شمع حیات اب خدا ہی سے لو لگائی ہے

تعارف باہمی مخلوق کا تاریک و ناقص ہے خدا ہی کو ہے پوری آگہی ہر اپنے بندے سے

صرف اللہ ہی کی یاد میں مستی اچھی   خود پرستی سے مگر گور پرستی اچھی

دامنِ گل پھیل کر اس باغ سے کیا لے گئے   ہو گئے نذرِ خزاں اور داغ حسرت دے گئے
مُردوں پر روتے نہیں روتے ہیں اپنے حال پر   "رہ گیوں" پر ہے مصیبت جو گئے اچھے گئے
صورتِ فانی سے آخر کیوں نہ پہچانے گئے   مجھ کو حیرت ہے کہ یہ بُت کیوں خدا مانے گئے
بزمِ دُنیا میں فقط صورت پرستی رہ گئی   وہ جمالِ شاہدِ معنے کے دیوانے گئے
اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہمکو لوگ   اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اسقدر جانے گئے
بولے چپراسی جو میں پہنچا بہ امیدِ سلام   پھانکئے خاک آپ بھی صاحب ہوا کھانے گئے

مجھ میں اظہارِ محبت ان میں اظہارِ کمال
میں وہاں رونے گیا اور وہ کہیں گانے گئے

کامیابی ہو گئی تو بے وقوفی پر بھی ناز   اور جو ناکامی ہوئی تو عقل بھی شرمندہ ہے

شیخ صاحب آپ کو شیریں مقالی چاہیئے   وعظ الفت چاہیئے اور خوش خیالی چاہیئے
طعن میں غمزے میں بجوئی میں نہیں ہی بہتری   مدعی نورِ حق کا ظرفِ عالی چاہیئے

تنہائی میں دل گھبراتا ہے صحبت میں لڑائی ہوتی ہے
دُنیا کی روش کوئی سی بھی ہو کچھ اس میں بُرائی ہوتی ہے

پرستش اُس بُتِ عیّار کی کس کو خوش آتی ہے   کوئی کیا شوق سے کرتا ہی مجبوری کراتی ہے
ہمارے ذہن کو اس مصرع اکبرؔ پہ مستی ہے   خوش اخلاقی عبادت ہی خوشامد بت پرستی ہے

چپکا کھڑا ہوں اپنی تباہی کے سامنے — کہنا جو ہے کہوں گا خدا ہی کے سامنے
ہوں ہر نفس میں اپنے خدا ہی کے سامنے — کیسی دلیل دل کی گواہی کے سامنے

میں کسی بات کا نہیں خوگر — صرف عادت ہے سانس لینے کی

اُن کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی — کمپ میں غل مچ گیا مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

پڑے ہیں بسترِ غم پر نہ دانا ہے نہ پانی ہے — نظر تک اُٹھ نہیں سکتی یہ زورِ ناتوانی ہے
چمن کا رنگ جوشِ موسمِ گُل میں معاذ اللہ — خدا حافظ نگاہوں کا حسینوں کی جوانی ہے

قدر دانِ طرز و وضعِ عہدِ شاہی کون ہے — لاکھ تنیئے آپ کو اب پوچھتا ہی کون ہے
اب میں چندے میں یہ غرقی بھی کروں گا نذرِ قوم — سنز کیسا میری جانب دیکھتا ہی کون ہے
لیڈروں کی دُھوم ہے اور فالو کوئی نہیں — سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

اُن سے بوسا مانگتا ہوں اِن سے ووٹ — بت بھی مجھ سے تنگ ہیں اور شیخ بھی

تھے معزز شخص لیکن اُن کی لائف کیا لکھوں — گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

نفس سے بچنے کی انسان چارہ جوئی کیا کرے — فطرتی رہبر یہی ہے اس کو کوئی کیا کرے

کاہلی کرنے کی فرصت مل ہی جاتی ہے مجھے — رشک آتا ہے عدیم الفرصتی پر وقت کی

گردوں نے ملایا خاک میں بھی اور غم نے بھی گھیرا عفات کو
با ایں ہمہ اکثر اہلِ جہاں کچھ روز تنے اور خوش بھی رہے
صیّاد ہُنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے
بُلبل کے لئے کیا مشکل ہے الّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

شکم سے حضرتِ انساں نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

عالمِ وحدت میں کثرت رنگ دکھلانے لگی
ہوش کے ٹکڑوں میں مَیں مَیں کی صدا آنے لگی

حضرتِ اکبؔر نے فرمایا یہ خوب
داد کے قابل ہے یہ فرزانگی
عذر ہم کو کچھ غلامی میں نہیں
ہے فقط تکلیفِ دہ بیگانگی

موج ہے دِل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں جے مائی کی

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی
اب تک میں بچا تھا آج پی لی
پھاڑے مغرب نقابِ نسواں
مشرق نے تو آنکھ اپنی سی لی

بولی فطرت دل و زباں دیکھو
یہ ہمارا ہے وہ تمہاری ہے
ذمّہ داریِ پیشِ خلق اُس پر
اس کا شاہد جنابِ باری ہے

اب ہر ساون کا سماں اور مہ جولائی ہے
یہ ہوا خوب کہ بیلے کی بھی بولائی ہے

قوّتِ ایماں سے کہہ دو سب کو سمجھاتی رہے
نیکیاں کثرت سے ہوں مغلوبیّت جاتی رہے

ہم سے چھن کر ہو گئی بزمِ ترقی کے سپرد
سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہو گئی

خوشامد ہے بیجا دنائت ہے چغلی
دل و دیں کی بیشک تباہی یہی ہے
فسادات کے تم نہ حامی ہو ہرگز
گورنمنٹ کی خیر خواہی یہی ہے

بہتر سمجھے ہو تم جو خاموشی کو
یہ بھی نہ کہو کہ خامشی بہتر ہے

غفلتوں کا خوب دیکھا ہے تماشا دہر میں
مدتیں گذری ہیں مجھ کو ہوش میں آئے ہوئے
خانۂ دل کو مرے توڑا تو کیا ایسی نمود
چشم بددور آپ تو ہیں مسجدیں ڈھائے ہوئے
سیٹھ صاحب کے یہاں شادی ہے رندوں کو نوید
اچھے اچھے طائفے ہیں شہر میں آئے ہوئے
بابو جی نے سچ کہا لاؤ کوئی "تازہ غزل"
گیت کیا گاؤں گراموفون میں گائے ہوئے
ہو چکی دو دن کی شادابی اڑا رنگِ بہار
پھول ہیں سوکھے ہوئے غنچے ہیں مرجھائے ہوئے

شیروں نے شتر بن کے اٹھایا ہے اُن کا بار
بکری بنے ہوئے ہیں طرفدار گائے کے
فاتح کے سامنے نہیں رہتے تعصّبات
آخر مطیع ہوتے ہیں سب ان کی رائے کے
اچھے وہی جو شوقِ الٰہی میں محو ہیں
تم کر ہی کیا رہے ہو بجز ہائے ہائے کے

ہمیں خدا کے لئے ہیں بیشک خدا ہمارے لئے نہیں ہے
قضا پہ راضی ہوں اور جئیں ہم مفر ہی جب ہے جئے نہیں ہے
یہ طبع اکبرؔ یہ رنگ اکبرؔ یہ اس کی باتیں یہ اس کے نغمے
ادب کے قابل ہے اُس کی مستی شراب اگر وہ پیئے نہیں ہے

اک مرض بن کر مسلّط ہے بلائے زندگی
درد ہی سے ہوتی رہتی ہے دوائے زندگی

دُنیا کا ذرا یہ رنگ تو دیکھ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے
بن بن کے بگڑتا جاتا ہے اور بات بنائے جاتا ہے
انسان کی غفلت کم نہ ہوئی قانون فنا کی عبرت سے
ہر گام پہ کٹتے پاؤں بھی ہیں اور سر بھی اٹھائے جاتا ہے
اِس کو نہ خبر کچھ اُس کی ہے اُس کو ہے نہ کچھ پروا اِس کی
روتا ہے رُلائے جاتا ہے ہنستا ہے ہنسائے جاتا ہے
کچھ سوچ نہیں کچھ ہوش نہیں فتنوں کے سوا کچھ جوش نہیں
وہ لوٹ کے بھاگا جاتا ہے یہ آگ لگائے جاتا ہے

بہارِ بے بقا پر ناز کیسا اور خوشی کیسی!
بجا ہے حیرتِ نرگس کہ گل کی یہ ہنسی[1] کیسی
خلافِ بیخودی کیوں ہے یہ وعظِ حضرتِ واعظ
خودی ہی کو نہیں سمجھا میں ابتک بیخودی کیسی
نہ پوچھا قیس نے لیلیٰ نے کچھ مجھکو بھی پوچھا تھا
جو آیا واں سے بس اتنا ہی پوچھا اُس سے تھی کیسی
خدا کے ساتھ ہونے کا یقیں مشکل سے آتا ہے
وگرنہ جب خدا ہی ساتھ ہو پھر بے کسی کیسی

---

[1] مصنف خود ان قوافی کو بالکل ٹھیک نہیں سمجھا۔

جب "خوب کیا" کا کوئی موقع نہ نکالا — پھر کیا جو ہوئی دھوم فقط "خوب کہی" کی

قرآن پڑھ کے میری تو قائم ہوئی یہ رائے — صرفِ دعا نہ ہو نہ آہا ہا نہ ہائے ہائے
گردن کشی کریں گے عرب میں اب اونٹ بھی — اب تک تو ہند ہی میں بھڑکتی تھی مجھ سی گائے

اے فلک انگلش ورجن ہو مبارک تجھ کو — ہم کو تو اُردو و ہندی میں بسر کرنا ہے

مذہب دبا ہوا نہ ہو فکرِ معاش سے — اندازۂ ترقیِ ملت اسی میں ہے

جو خدا کے جاننے والے تھے صوفی ہو گئے — داستانِ بدر والے شیعہ سنّی ہو گئے

شیرانِ شرق کا انھیں منظور ہے شکار — بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقّی کے شوق کے

مسٹر نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی — شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس — چارہ کیا تھا اے خدا۔ تعلیم ہی ایسی ملی

قطعات

ابتدائے عالمِ ہستی میں میں بیہوش تھا
ہوش جب آیا تو دل میں غفلتوں کا جوش تھا
پھر مصائب اور فنا کے تجربے پیہم ہوئے
بعد ازاں جب تک جیا مغموم تھا خاموش تھا

اک بحرِ بے کراں ہے حوادث کا سلسلا
اُلجھا جو ذہن اس میں وہ دیوانہ ہو گیا
اٹھے مورخین زمانے میں گم ہوئے
افسانہ گو جو تھا وہ خود افسانہ ہو گیا

فنا کے سامنے ہم کیا ہماری ہستی کیا
برائے نام مگر اک نشان پا ہی لیا
ہوا جو ہم نفس قطرہ بن گئی دم بھر
حباب نے بھی خودی کا مزا اٹھا ہی لیا

ہوئی تدبیر کفر آمیز سے بد تر مری حالت
بجا ہے مجھ کو اس تاریک باطن کا گلا کرنا
پریشانی کو افعی کر دیا زلفوں کو سلجھا کر
بلا کو سخت تر کرنا ہے اصلاحِ بلا کرنا

شوق اگر یہ ہے کہ ہوتی رہے صحبت پیدا
بے تکلف نہ کیا کیجئے رغبت پیدا
گھر میں احساس ضرورت ہو تو بازار کو جا
کر نہ بازار میں تو جا کے ضرورت پیدا

پیٹ سے دل نے کہا درجہ ہمارا ہی بڑا ! ساغرِ جمشید ہم ہیں تو ہے بنئے کا گھڑا
پیٹ بولا اصطلاحیں تری سب منسوخ ہیں ہم ہیں اب غربی گلدام اور تو ہی شرقی جھوپڑا

تمکین اک نشان ہے عصمت کی آن کا پردا بس اک ظہور ہے عورت کی شان کا
پردا تو اُن کا حق ہے نہیں اُن پہ جبر کچھ آیا ہے اُن پہ وقت یہ سخت امتحان کا
شوخیٔ مغربی کے خریدار ہیں بہت گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکان کا

یہ کہتے نہیں ہم کہ گردوں نے ہمکو مسلمان ہونے کا شائق نہ رکھا
مگر یہ کہ اوضاعِ دنیا نے ہمکو مسلمان رہنے کے لائق نہ رکھا

انتظامی بات ہی یہ ہوتی آئی ہے یونہیں اس کا کیا شکوہ کہ ان کو ہم پہ غالب کر دیا
ہاں ہی یہ افسوس ہم سے چھن گیا صبر و قرار طالبِ حق کو فلک نے ان کا طالب کر دیا

کہا بقراط سے دنیا میں کیوں آیا تو اے دانا
کہا اُس نے کہ میں لایا گیا مجھکو پڑا آنا
کہا کیوں کر بسر کی عمر بولا ساتھ حیرت کے
کہا کیا جانا بولا کچھ نہیں جانا یہی جانا

مرگِ ہاشم ۱۳ ۱۹ء

اک زمانہ تھا کہ مجھ کو اپنے دل پر ناز تھا
ہر مصیبت میں وہ میرا مونس و دمساز تھا

بزمِ ہستی میں کدورت سے رہا کرتا تھا پاک
گو حوادث کے لئے اِک فرشِ پا انداز تھا

میرے ہر اندیشۂ مضطر کا تھا وہ غمگسار
ہر نفس میرے لئے وہ گوش بر آواز تھا

انقلابِ دہر سے بے اعتنائی تھی اسے
اس میں حیرت آفرینی تھی تو یہ طنّاز تھا

پیش آیا ناگہاں وہ اِک فراقِ روح سوز
برقِ بیتابی بنا جو صبر میں ممتاز تھا

اب وہی آرامِ جاں اک زخمِ پہلو ہو گیا
کیا یہی وہ دِل ہے اکبرؔ مجھکو جس پر ناز تھا

ہاں وہی دل ہے کہے گا تجھ سے اک دن راز سے
تیرا صدمہ خوبیٔ انجام کا آغاز تھا

فریادِ مجنونانہ

مرگِ ہاشم پر:

جس سے میری زندگی تھی مر گیا۔ کیوں مر سکا
چرخ نے یارب ستم مجھ پر کیا۔ کیوں کر سکا

واقعاتِ جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع
کیوں نہ میری آہ سے قانونِ فطرت ڈر سکا

بھلا سائنس کیا سمجھے نزاکت شوق عاشق کی | کہاں فوٹو سے وہ نکلا جو میرے دل میں ارماں تھا
لیا فوٹو نے زندہ عکس لیکن چشم بے جاں میں | ہماری آنکھ میں گو حِس تھا لیکن عکس بیجاں تھا

کریں کوشش مگر اس وقت میری رائے میں اکبر | مناسب مشورہ ہی صبر و یکسوئی و تقویٰ کا

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن | شام اُسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا
عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ | عرصۂ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

اکبرؔ کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے | نامہ ہے نہ پیغام نہ حِصّہ ہے نہ نخرا
مانا کہ حسینوں کے لئے ناز ہے لازم | لیکن کوئی پوچھے تو کہ پاگل سے بھی نخرا

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا | سیکھا زباں نے کہنا ہندوستاں ہمارا
رقبے کو کم سمجھ کر اکبرؔ یہ بول اُٹھے | ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا

لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم
جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

کل واقعاتِ دہر کہاں ہسٹری میں ہیں | فوٹو ہے صرف سطحِ پیشِ نگاہ کا!
وہ بھی فقط خیالِ مصنّف بہ قیدِ خود | کیا بن سکے چراغ صداقت کی راہ کا

اس طرف تو نے ہسٹری رٹ لی | اس طرف جا کے فلسفا پھانکا
لیکن اکبرؔ خیالِ عقبےٰ سے | نار و جنت کو بھی کبھی جھانکا

غرور توڑ کے منطق کو سُست کر دے گا
زمانہ آپ ہی اُس کو درست کر دے گا
بلا پہ صبر کرو تم خدا خُدا میں رہو
خدا ہی صبر کی ہمّت کو چُست کر دے گا

صد حیف کہ ماہ رمضاں ختم ہوا آج
پھر رات کو عالم ہے وہی بے خبری کا
اٹھتے تھے سحر کھانے کو اور جلتی تھیں شمعیں
افسوس گیا نور چراغِ سحری کا

میری طرف سے سارا جہاں بدگماں ہے اب
آزادیٔ کلام وہ مجھ میں کہاں ہے اب
رکھتی ہیں پھونک پھونک کے باتیں مری قدم
تیغِ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب

کتابوں ہی میں رہ جائے گی ساری تین پانچ اُن کی
طریقے اس کے لیکن اور ہیں کہنے کی کیا حاجت
بتوں نے سچ کہا اس پشت میں رخصت ہے یہ شیخی
عقیدوں کی دوا کالج تعصّب کی دوا حاجت

طرح مغرب کو دیکھ کر جو کہے
با ہمیں طرح ہا بباید ساخت
کہہ رہے قرآن سے بھی وہ یہ بات
با ہمیں شرح ہا بباید ساخت

درِ دیر پر میں نے کی جو ڈنڈوت
بھری تھی مرے دل میں ٹھاکر کی پیت
کیا شور چیلوں نے یہ ہر طرف
مہاراج کی جے گرو جی کی جیت

کر لی ہے خوب میں نے نئی روشنی کی جانچ
مجھ سے بہت نہ کیجئے اب آپ تین پانچ

ان لیڈروں کی شعلہ زبانی سے کیا ہوا
ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پر آئی آنچ

---

۲ میں نے کہا یہ اپنے خیالِ خضر سے آج
بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا اُمید
ہر گام پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا
ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب
ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مُرید
شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے درس کے پردے میں ناپدید
حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا
حافظ کا اک یہ شعر جو معنی کو تھا مفید

سرِّ ازل کہ عارف سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کُجا شنید

انور سے کہا میں نے کہ خاموش ہو کیوں تم
تقریر نہ تحریر نہ غصّہ نہ خوشامد
بابو کے نہ دمساز نہ یاروں کے ہم آواز
ماہی میں نہ ممتاز نہ اشتر میں سر آمد
کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے
کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اگر ہیں بھی باقی کچھ اب دردمند
تو بس پھینکتے ہیں وہ لفظی کمند
بہ یک لکچر آوازِ ھُرّا بلند
بہ یک بزم مقدار چندہ دو چند
کہاں اب وہ دل اور وہ طبع بلند
جنھیں کہہ گئے سعدی ارجمند

بیک نعرہ کوہے ز جا بر کنند
بیک نالہ مُلکے بہم بر زنند

اصلی غم و شادی کا نہیں قوم میں اب حس
چشم عقلا سے یہ بصیرت ہوئی مفقود

پابند ہیں اُس کے رزولیوشن جو ہما پاس
ہنسنے پہ بھی تیار ہیں رونے کو بھی موجود

بہ چشمش بود رنگ بے ثباتی
بہار آورد گلہا را خزاں بُرد
بہ عبرت زندگانی کرد اکبر
براں زاد و براں بود و براں مُرد

خزاں سے جنگ کروں یہ نہیں مجھے سودا
ملول میں بھی ہوں لیکن ہے انتظارِ بہار
نفیس تخم بنا رکھو اپنے عزموں کو
اور اس کے بعد رہو تم امیدوارِ بہار

جینے والوں کی ترنگیں ہیں فقط پیش نظر
مرنے والوں کے مصائب کی بہت کم ہے خبر
یہی باعث ہے کہ غفلت میں پھنسی ہے دُنیا
لبِ خنداں کی ہے کثرت عوض دیدۂ تر

---

۱ میں کیا کروں گا عزیزو یہ پارٹی لے کر
مزا تو جب ہے کہ آئے وہ پارٹی لے کر
خموش ہو گیا بت کی طرح میں کونسل میں
برہمن اُٹھے جو اپنی مجارٹی لے کر

ملانے دیں گے مذاہب کبھی نہ ایسے سُر
کہ ہر طرف یہ سُنو یا اخی بیا و بجود
مخالفت سے نہ باز آئے گی دنی دُنیا
فقط یہ زور سے دبتی ہے یاد رکھو یہ گُر
انھیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے
انھیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر
نجات کے لئے کافی ہے سینۂ صافی
پیادہ پائی یہ خوش رہ اِلی الاِبلِ النظُر
مگر زمانے کی رونق ہے طفل طبعوں سے
اندھیری رات ہے اور پھُلجھڑی کی ہو پھُر پھُر
اگرچہ نام خدا و رسول لیتے ہیں
دراصل جزو شکم ہے یہ مذہبی عنصر

طبع کا شغل ہو جو پولیٹکل — تو نہیں ختم وہ فسانہ ہنوز
فتنہ انگیز اختلاف میں ہے — اس کے خرمن کا دانہ دانہ ہنوز
وہی اب تک ہے طاقتوں میں نفاق — وہی اندازِ حاسدانہ ہنوز
وہی سامان خانہ جنگی کے — وہی طرزِ معاندانہ ہنوز
ہے کھلا حرصِ جنگ دنیا میں — نار و آہن کا کارخانہ ہنوز
خود فراموش و خود فروش وہی — وہی سودائے تاجرانہ ہنوز
وہی لیسنس کی طلب گاری — وہی انکار کا بہانہ ہنوز
ہاں جو عرفان کھول دے دَرِ دل — ہے نظر میں وہی زمانہ ہنوز
وہی شوق اور وہی اثر موجود — وہی تیر اور وہی نشانہ ہنوز
دل حق بیں کو سلطنت کا مرور — وہی تمکین عابدانہ ہنوز
چشمِ مشتاق کا عروج وہی — اور وہی جوشِ عارفانہ ہنوز
وہی عہد الست پیشِ نظر — مستیٔ بادۂ شبانہ ہنوز

ہست مجلس براں قرار کہ بود
ہست مطرب براں ترانہ ہنوز

کچھ دل ایسے ہیں کہ ہے جن میں مضامین کا جوش — کچھ زبانیں ہیں دکھاتی ہیں جو تحسین کا جوش
ذوق طاعت کا مگر دل میں نہیں ہے پیدا — نہ زبانوں پہ دعائیں ہیں نہ آمین کا جوش

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر — دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار — شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

نیّت ہو اگرچہ خیر و ایماں کی طرف
آنکھیں نہ اٹھاؤ بزمِ عصیاں کی طرف
مانا کہ پڑھو گے واں پہنچ کر لاحول
جانا ہی ضرور کیا ہے شیطاں کی طرف

بے گزٹ ہو کے جو رہتے تو محلّے میں حقیر
باگزٹ ہو کے جو چلئے تو فرشتوں میں خفیف
کیسے چکّر میں بزرگوں کو پھنسا رکھا ہے
حضرتِ پیرِ فلک بھی ہیں عجب ذاتِ شریف

قرآن رہے پیشِ نظر یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیشِ نظر یہ ہے تصوف
مقصود تو واحد ہے اگر غور سے دیکھو
غافل نہ رہے اُس سے. اُسی کا ہے تاسّف

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت
دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو
انگریز کو ہے نیٹو سے جس قدر تعلق

ترقی خواہ ہے تو صحنِ مسجد چھوڑ اے اکبر
کہا اس نے ترقی ہے تو خود پہنچے گی مسجد تک
نود نہ نام اِدھر ننانوے کا پھیر اُدھر یعنی
انھیں سَو تک پہنچنا ہے مجھے اللہ واحد تک

گو کہ دونوں ہی نظر آتے ہیں نیک
ایک ظاہر ایک میں باطن کی ٹیک
میں نے پوچھا ایک اور اک کے ہوئے
دے جواب اس کا تمہاری طبعِ نیک
بے تکلّف کہہ دیا ملّا نے دو
حضرتِ صوفی یہ بولے پھر بھی ایک

سامانِ عیش کچھ نہ رہا اُڑ رہی ہے خاک
اس غم میں اپنی جان مگر کیوں کروں ہلاک
میں نے جو جل کے کہہ دیا اس سال جون میں
ٹٹی اگر نہیں نہ ہو خس کم جہان پاک

گو ہے ہندو ہم سے مسلم یہ دونوں مل کے ہم — سر بہ انگریزی ادا اس سے ہوئی حالت اہم
ہے ادا ہم سے جدا لیکن محافظ اور معین — اس کے سائے میں رہیں تو ہم شامل ہوں بہم
دوست کیونکر ہوں نہ ہوں جب ہم خیال و ہم مذاق — لیکن اس کا یہ اثر کیوں ہو کہ ہوں دشمن بہم
اپنا اپنا وقت ہے موقع ہے اور میلانِ طبع
آپ اپنے شغل میں رہیے اور اپنی دُھن میں ہم

بندوں کے فہم و نظر کی اک حد ہے وہ بھی ہے سچ — کرتا ہے خود وہ اپنی خدائی کا انتظام
ان ممبروں میں کوئی کدورت نہ ہو بہم — آپس میں بھی کریں یہ صفائی کا انتظام

خبر کیا انقلابِ دہر کی ان نوجوانوں کو! — نئی حالت نئی آنکھیں نئے ان کے ترانے ہیں
بڑی عمریں ہیں جن کی اُن سے سنیے حالِ دُنیا کا — نگاہوں میں زمانے ہیں زبانوں پہ فسانے ہیں

گوشۂ صبر و قناعت ہی میں اب محظوظ ہوں — شہد سے محروم ہوں تو زہر سے محفوظ ہوں
گو حریفوں کی نظر میں رنگ پھیکا ہو مرا — نرگسِ مستانۂ ساقی کا میں ملحوظ ہوں

---

۲ پاس کالج کے جو ہیں ووٹ طلب کرتے ہیں — پاس مسجد کے جو ہیں طاعتِ رب کرتے ہیں
عشوہ ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں کُشتہ — یہ رُخِ سادگیِ طرزِ عرب کرتے ہیں
ان کو ہے لمنیڈ و وسکی کی ضرورت اور یہ — رفع پانی سے فقط خشکیِ لب کرتے ہیں
پھیلتے وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ — یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظِ نسب کرتے ہیں
وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں
وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں — تم سے رہیں ملائم شیطاں پہ سخت بھی ہوں
قرآن ہی کرے گا ان بی بیوں کو پیدا — پاکیزہ تخم جب ہوں عمدہ درخت بھی ہوں

چرچ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں — قوم کالج میں اور اسکی زندگی اخبار میں
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں — بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

ہر خاک کے پتلے کو ابھارا ہے فلک نے — یکتائی کے اظہار میں مست اہلِ زمیں ہیں
ہر اک کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز — اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اُس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکّر دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دَورے میں پُن مگن تھے تمہارے دورے میں پاپ خوش ہیں

حاکمِ دل بن گئی ہیں یہ تھیٹر والیاں — میں لگاؤں گا گُلِ داغِ جگر کی ڈالیاں
ضبط کے جامے کے بخئے ٹوٹتے ہیں دوستو — ہائے یہ بیلیں کشیدے اور ایسی جالیاں
خورِ مستقبل پری ماضی مگر یہ حال ہیں — دی و فردا کیا کروں پاؤں جو یہ خوش حالیاں
آسماں سے کیا غرض جب ہو زمیں پر یہ چمک — ماہ و انجم سے ہیں بڑھ کر ان کے بُندے بالیاں
قول وہ کہتی ہیں مجھ کو میں انھیں سمجھا ہوں پھول — ہیں گلِ رنگیں سے بہتر ان گلوں کی گالیاں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ طلسمِ ہستی — اُس کی قدرت کے کرشمے بھی عجب ہوتے ہیں

جان جب خاک میں پڑتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں
حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں

لطفِ آزادی کی دل میں بڑھ گئی ہے چاشنی
اب تو شیشے میں اترنے کی نہیں یہ چیلیاں

اپنے ہاتھوں اپنے سانچے کا کریں گی بندوبست
یہ نہیں وہ گڑ کہ تم اُن کی بناؤ بھیلیاں[۱]

کچھ غرض اور ہے احباب اس شک میں رہیں
بس یہ ہے شوق کہ پبلک کی جھکا جھک میں رہیں

نہیں منظور نمازوں میں گذاریں راتیں
ہاں کمیٹی ہو تو الجھے ہوئے بک بک میں رہیں

نغمۂ مُرغِ سحر سے نہیں انجن کو غرض
پیٹ انگاروں سے بھر دیجئے بھک بھک میں رہیں

پایا جب کمپ کے چکر میں انھیں سب کا شریک
رشک جاتا رہا اس پر کہ بڑے عالم ہیں

صبر و آزادی و طاعت کے مزے لو اکبرؔ
اُن کی راہوں پہ نہیں چھوڑ دو جو حاکم ہیں

---

۲ ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزّل
گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کرتوں میں ڈٹیں
بخیے جو فطرتی تھے وہ اب ادھڑ رہے ہیں

سطحِ زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو
نظروں میں پھل جھڑی سے گو پھول جھڑ رہے ہیں

چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی
لیکن اُمید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں

یہ زیورِ معانی کس کی کریں گے زینت
لفظوں کے یہ نگینے کیوں آپ جڑ رہے ہیں

۱؎ بہ ضرورت قافیہ

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو — دُعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

سکھاتے ہیں جو اغیار اب اُسی کے دل سے شیدا ہیں — نہ جانا یہ کہ ہم کیا ہیں یہی سمجھے کہ وہ کیا ہیں
خرابی بے اصولی تفرقہ - اس کا نتیجہ ہے — تماشائی ہیں وہ - ان کے لئے ہم اک تماشا ہیں
ہماری حالت کو کچھ نہ پوچھو [1] — فعولِ فعلن فعول فعلن فعولِ فعلن فعول فعلن

پچھاڑیں کھاتے ہیں لوٹتے ہیں پکڑتے ہیں شیخ جی کا دامن — مگر مشینیں جو چل رہی ہیں انھیں میں اُلجھے گھسٹ رہے ہیں

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور — بھینس کو گون پہنا دیجئے عاشق ہو جائیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں — داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں
رزولیوشن ہی کے تختے کا سہارا ہے فقط — بحرِ تدبیر ترقی میں بہے جاتے ہیں
ملک الموت نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس — اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں

آپ فرماتے ہیں ہو لہر ترقی کی تو آہ
موجیں کہتی ہیں کہ یہ خود ہی بہے جاتے ہیں

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب — بُدھو فلاسوفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں
خاک اڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے — مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

---

[1] مطبوعہ کلیات میں یہ جگہ اسی طرح خالی ہے

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں اُن کے منتظم ... استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں مگر عشوے دکھاتے ہیں ... جو شخصی زندگی ہے اُس کو یہ قومی بتاتے ہیں
بجز الفاظ کے حاوی نہیں کلّی پہ کام اُن کے ... یہ خود جزئی ہیں لیکن گیت کلّی کا سناتے ہیں

اللہ نے کہا ہے تم زیرِ امتحاں ہو ... ہم جانتے ہیں بس ہم دنیا کے ممتحن ہیں
خود نفس کے ہیں تابع تقویٰ سے بے تعلّق ... اوروں پہ نکتہ چینی میں غرق رات دن ہیں

خانہ جنگی ہی میں حضرت مرد ہیں ... عیب جوئی کے ہنر میں فرد ہیں
اپنوں ہی کے واسطے ہیں شعلہ خو ... سامنے غیروں کے بالکل سرد ہیں

---

۲ اِدھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں
اُدھر خواتین خلوت آرا ہنوز مست اپنی فوج میں ہیں
مگر یہ قیدِ حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک
کہ گبر و ترسا کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

سوئے مسجد اس نئی تہذیب کی راہ اب کہاں ... تھینک یو میں صرف ہیں الحمد للہ اب کہاں
ہم غریبوں ہی کو لازم ہے توجہ اس طرف ... التفاتِ صاحبانِ شوکت و جاہ اب کہاں
بزمِ اکبر میں مراقب ہیں جو تھے درویش دوست ... شوق ہے دربار کا وہ ذوقِ درگاہ اب کہاں

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں ... جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں

وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جن کی خالق سے — نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

اللہ کو جگہ دے تو اپنے دِل میں اکبرؔ — اللہ خود ہی دے گا تجھ کو جگہ دلوں میں
اللہ ہی کو سمجھو مقصود علم و دانش — اللہ ہی کو چاہو ہستی کی منزلوں میں
خوف و رجا سے دیکھو ہر دم اُسی کی جانب — فطرت کے منظروں میں طاعت کے سلسلوں میں
کرتے ہو ساتھ ادب کے جب ذکر تم خدا کا — ہوتے ہیں خوش ملائک بھی اپنی محفلوں میں
جو دین کے ہیں عالم راہِ خدا کے ہادی — تم سمجھو خود کو ناقص بس وہ ہیں کاملوں میں
مسلم شریکِ ملت ہو بھی جو لغزشوں میں — کم وقت اپنا کاٹو طعنوں میں اور گلوں میں
شامل تمہاری صف میں طاقت ہو وہ تمہاری — کافی ہے یہ۔ نہیں ہے وہ حق کے مبطلوں میں
رحماء بینھم پر رکھو نظر ہمیشہ — ہر چند یہ طریقہ ہے سخت مشکلوں میں
ہنگامہ جو ہے شوقِ اعزاز و فکرِ روزی — کوشش کرو مگر تم شامل ہو عاقلوں میں

اِک بات ہم نے کہہ دی ورنہ یہ وقت وہ ہے
تم بھی ہو زخمیوں میں ہم بھی ہیں بسملوں میں

اک طرف تمکین ہے اور بیقراری اک طرف — انتظام طبع انساں ہے خدا کے ہاتھ میں
ہے وہی دیوار میں مٹی بگولے میں جو ہے — نمو کے پنجے میں وہ ہے یہ ہوا کے ہاتھ میں

بیجا ہو اعتراض تو اس پر بھی ہیں خموش — گو دِل ہی دل میں غصے سے بُھنتے بھی خوب ہیں
کہتے ہیں خوب حضرت اکبر شک اس میں کیا — لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سنتے بھی خوب ہیں

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے — مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ میں

صاحب سلامت اب بھی مری شیخ جی سے ہے لیکن چھٹے چھما ہے وہی راہ ہاٹ میں

خانقاہوں کے کھلیں در کس طرح ہیں کواڑ اب تنگ اپنی چول میں
حکم گردوں ہے کہ حلقے چھوڑ دو یا پیرس میں جاؤ یا اسکول میں

گردوں نے ہم کو اس کا لقمہ بنا دیا ہو تہذیب مغربی کے معدے میں ہم پڑے ہیں
شخصیتیں جو اکثر تم دیکھتے ہو باقی کیلوس ہو رہا ہے لقمے بڑے بڑے ہیں
اللہ نے جو چاہا ہم ہضم ہی نہ ہوں گے توحید اور قناعت کے پاسباں کھڑے ہیں
البتہ اُن کی نسبت کچھ رائے میں نہ دونگا جو اس سے خون ملنے کی آس پر اڑے ہیں

مناسب ہے نئی تعلیم نسواں یہی راہ آپ اب بے رد و کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات میاں بدلے تو بی بی کیوں نہ بدلیں

کفر پر غصہ نہیں فطرت پہ کچھ حیرت نہیں خانہ جنگی کے سوا بس اور کچھ رغبت نہیں
قوتِ انشار کو آخر صرف کرنا ہے ضرور کیا کریں زورِ قلم ہے اور کچھ طاقت نہیں

سنیں تو آپ قناعت کے غل مچانے کو وہ کہہ رہی ہے نہ چھوڑو غریب خانے کو
تمہاری حرص بدل کر تمہیں کرے گی ہلاک ہمارا صبر بدل دے گا اس زمانے کو

دنیا کو نہ کاغذِ خبر میں دیکھو اپنے فرد ایں اپنے گھر میں دیکھو
الفاظ کی شوکت و نزاکت پہ نہ جاؤ قائل کو قول کے اثر میں دیکھو

اپنی محنت کو اپنا آنر سمجھو | اپنے پاؤں کو اپنا موٹر سمجھو
صحت اچھی تو ہر جگہ ہے آرام | اپنے ہی بدن کو اپنا تم گھر سمجھو
اے بی بیو شرم ہی کو تم سمجھو حسن | اور اپنے ہنر کو اپنا زیور سمجھو
بی بی میں جو طرز مغربی ہو تو کہو | احسان ہے یہ جو مجھ کو شوہر سمجھو
دست اندازی پولس کی ہو جس میں روا | ہرگز نہ اُسے کلامِ اکبر سمجھو

کون کہتا ہے کہ تعلیمِ زناں خوب نہیں | ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم | قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

سب سعی میں مصروف ہیں حاصل کی نہ پوچھو | مغرب کے خضر ساتھ ہیں منزل کی نہ پوچھو
ہے بحرِ مباحث میں رواں کشتیٔ امید | لہروں کی لچک دیکھو ساحل کی نہ پوچھو

منزلِ گور تک پہنچنا ہے | خواہ چھکڑا ہو خواہ موٹر ہو

زمیں سے فیض نامحدود کا کیونکر تحمّل ہو | ترقی دنیوی یہ ہے کہ اوروں کو تنزّل ہو
یہی بنیاد ہے دُنیا میں جور و ظلم و غفلت کی | تو اس سے محترز رہنے میں کیوں تجھکو تامل ہو
طلب دنیا کی کر اتنی کہ طاعت ہو سکے رب کی | مصیبت ہے یہ شرط اس میں کہ شوکت ہو تجمل ہو
حکومت کی طلب کا بھی یہی مقصود ہے اصلی | کہ روحانی طریقوں سے خلائق کو توسّل ہو
ترقی ہے جو روحانی وہی ممدوح ہے اکبرؔ | کہ ہو ہر جزو کو آسودگی اور شرکتِ کُل ہو

وزن نامحدود میزانِ نظر میں خوب ہے | نام کی خاطر تر شکر تولہ ماشا کیوں بنو
دینِ حق ہے آنکھ زینت ہے تماشائے جہاں | تم تماشائی رہو اکبرؔ تماشا کیوں بنو

خواہ صاحب کو تم سلام کرو — خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا فقط یہ مطلب ہے — جس میں روپیہ ملے وہ کام کرو

پڑھ دیا اکبرؔ مغموم نے یہ شعرِ بلیغ: — جب کہا اس سے کہ اس بزم میں کچھ تم بھی کہو
چین کے ساتھ ہم اس وقت بھی رہ سکتے ہیں — شرط یہ ہے کہ فقط پیٹ ہو اور آنکھ نہ ہو

اک دل لگی ہے وقت گذرنے کے واسطے — دیکھو تو ممبروں کے ذرا ایر پھیر کو
ایسی کمیٹیوں سے ہے پھل کا امیدوار — اکبرؔ درخت سمجھا ہے پتّوں کے ڈھیر کو

مذہب کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل — بس عشق ہی مٹاتا ہے اُس کی کرید کو
دینِ خُدا کے نور کا جلوہ نصیب ہو — دِل کی نگاہ پائے جو وحدت کے بھید کو

رنگِ زمانہ طرزِ طبائع کا بھی ہے پاس — تقوے کا گو خیال بہت ہے جناب کو
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

اس کو سُنتا ہوں اُس پہ جُھکتا ہوں — کوئی دعوے ہو یا کوئی درگاہ
ایک اور اک دو مگر زبان پہ ہے — دل میں ہے لَا إِلٰهَ الَّا اللّٰه

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک لقمے میں — نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

پڑھے اُس جا جہاں تاثیرِ ملّت جا نہیں سکتی — بسے اس جا کہ آوازِ اذاں بھی آ نہیں سکتی

تمہیں کو ناز ہو اے نوجوانو اس طریقے پر
مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی

انساں کا علم کامل سابق میں تھا نہ اب ہے
لیکن نئی طرح کا اک تجربہ رہا ہے
مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردّی
بُدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

محوِ اضافہ وہ بت کھیوٹ پرست ہے
کہتا ہے آخرت کا یہی بندوبست ہے
اپنے عیوب پر تو ذرا بھی نظر نہیں
اوروں پہ اعتراض میں ہر وقت مست ہے

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید
بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ
شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

جناب ہی کو مناسب ہے یہ سوال لائن
نیازمند کو تو شہر ہی میں راحت ہے
زمانہ ہے کہ وہ دشمن ہے صاف گوئی کا
زبان ہے کہ نہیں مانتی مصیبت ہے

مرغی نے کہا خوب کسی کمپ میں لٹ کے
انڈا وہی اچھا ہے کہ بچّا جسے گھُٹ کے
دیوار شکستہ نے ترقی کی دعا کی
گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی کٹ کے

کیوں اپنے سر پہ زحمتِ بے سود لیجئے
کو فسل کے بدلے گھر میں اچھل کود لیجئے
کھاپی کے گھر میں بیٹھئے اور گائیے بھجن
کاشی سے جل پراگ سے امرود لیجئے

ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا
بہتر ہے راہ منزل بہبود لیجئے

ہوائے کوچۂ مشرق کی موجیں یاد ہیں ہم کو
وہی تھی منزلِ راحت وہی رفتار اچھی تھی
نئی محفل کی نکٹائی تو گویا طوقِ گردن ہے
وہی بت خانہ بہتر تھا وہی زُنّار اچھی تھی

شوخی یہ لیڈروں کی یہ ملّت کی ابتری
تاریک شب میں کشمکشِ برق و ابر ہے
محفوظ مثلِ انجم تاباں ہیں وہ بزرگ
ذوقِ صلوٰۃ جن کو ہے اور تابِ صبر ہے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اُس شوخ کے گھونگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ان عزیزوں کا عمل اکبر محلِ غور ہے
کہہ رہے کچھ اور ہیں اور ہو رہا کچھ اور ہے
آفشل حالت پہ ہے ان کا مدارِ زندگی
مذہبی ترکیب باقی ہے نہ سوشل طور ہے
قیمتِ کوثر سے بڑھ کے دیتے ہیں ٹھرّے کے دام
بے حسی کا میکدہ ہے غفلتوں کا دور ہے

دِل اس کے ساتھ ہے کہ خدا جس کے ساتھ ہو
لیکن خبر نہیں کہ خدا کِس کے ساتھ ہے
البتہ پیشِ چشم ہے قانونِ عافیت
جو نیک اور شریف ہو وہ اس کے ساتھ ہے

مِل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانے کی حکمرانی ہے
اک ادا سے کہا مِس وڈ نے کم آن
تیر کی مجھ میں اب روانی ہے

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے
چارا ہی مگر کیا تھا فطرت جو یہاں جن دے
جب چاند کی چالاکی گھٹ بڑھ میں نظر آئی
تقدیر نے چمکایا سورج نے دئے چندے

جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا — یاروں کے لئے عہدے چڑیوں کے لئے پھندے
خم ہو کے ہلال آیا گردوں نے کہا حضرت — ہو جائیے گا فربہ چکر تو لگیں چندے

میزانِ نظر میں اپنی قوت تو لے — خالی الفاظ کی دکان کیوں کھولے
اللہ کو مان لے دلیلیں کیسی — اکبرؔ سے کہو کہ خود تو ثابت ہولے

حکومت اُسکی اسی کی مرضی اُسی کے سب کام اور دھندے
کہاں کے انگلش کہاں کے نیٹو خدا کی دنیا خدا کے بندے

عجیب معنیٰ نازک ہیں اس مقولے میں — نظر وسیع جو ہو بندگی میں شاہی ہے
خدا کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم — خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

واقف ہوں ان بتوں کے مکر و فریب سے میں — سب ہیں یہ دل کے پتھر اور آنکھ کے رسیلے

یہ سڑک کس سمت میں آخر نکالی جائے گی — آنے والی نسل کس سانچے میں ڈھالی جائے گی
نفس کی جو ہیں ترنگیں اُن میں ہر گو ایک جوش — تا کجا لیکن یہ موجِ خوشس مقالی جائے گی
جھاڑ کر دامن الگ ہو جائیں خاصانِ طریق — ورنہ یہ توفیق بھی دل سے اٹھالی جائے گی
خود پرستوں کو مبارک ہو یہ ایوانِ رفیع — دِل شکستوں میں کوئی مسجد بنالی جائے گی
ان ستونوں سے نہ سنبھلے گی تری سقفِ حرم — خِطّۂ تر سایہ گر بنیاد ڈالی جائے گی

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سُنا — یہ تو کہئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

اے شوقِ وضعِ مغربی در ما فگندی ابتری — ہر چند مشقت می کنم لیکن تو زاں بالاتری
شیخم شہید جلوہ ہا افتادہ در کمپ شما — باشد کہ از مہرِ خدا سوئے شہیداں بنگری
سحرِ نگاہت تازہ من مرکوزِ طبعت رازِ من — ہر نغمہ ات بر سازِ من حقا عجائب دلبری
تو سینہ گشتی دل شدم ٹیچر شدی پیوپل شدم — تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
ہر چند با تو بستہ ام از طعنِ اکبر خستہ ام — للہ لطفے خاص کن پیدا الحقِ نیچری
آں را کہ تاجر دیدہٴ تازی ازو بشنیدہٴ — شد نوکری فنِ پدر اردو زبانِ مادری

اے بانوے خلوت نشیں تا کے بہ قیدِ آن و ایں
از پردہ بیروں آ و بیں تاز زنانِ لشکری

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے وہ لیڈی اور ناچنے کو ڈیڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

آپ اکبر لاکھ مشقِ خوش کلامی کیجئے — کتنا ہی اظہارِ اعزازِ دوامی کیجئے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اُس شوخ کو — یا کھسکئے سامنے سے یا غلامی کیجئے

کہاں ہم ہیں جماعت اور طاعت — شکستہ ہو گئے سابق کے رشتے
نہیں ہے کچھ شکایت لیڈروں کی — کہ جیسی رُوح ہے ویسے فرشتے

گُل برگد تھا جن کا براتی — اُن کی قبر پہ پھول نہ پاتی
عبرت ہے یہ دوہا گاتی — ستّر پوت بہتّر ناتی
(جن راون کے دیا نہ باتی)

ع ہندو کے اتفاق کو گنگا ہی گائے ہے
مرزا کے اتفاق کو مجلس کی ہائے ہے
البتہ شیخ جی کا کوئی مرکز اب نہیں
ہر پیر ہر جواں کی جُداگانہ رائے ہے

لات و عزّیٰ سے چُھٹے تو زید و خالد میں پھنسے
فائدہ کیا خلق کو پہنچا دینِ اسلام سے
انتظامِ دہر کہتا ہے کہ یہ اک بھید ہے
کام رکھ تو اپنے دل میں بس خدا کے نام سے

تصویر اصل سے نہیں رکھتی مطابقت
تصویر ادھر کھنچی اور ادھر تُم بدل گئے
تصویر بین کی فانی و ماضی پہ ہے نگاہ
ذرّاتِ جسم حال کے سانچے میں ڈھل گئے

جو پوچھا مجھ سے دَورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مُسلم تو ہے بندہ
و لیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

سکّہ بٹھا رہا تھا قرآن جب عرب پر
اس وقت پڑ رہی تھی بنیاد سلطنت کی
اس وقت میں ہو موذنوں کیا مذہبی ترانہ
جب پاؤں لڈ شیخ کا ہے اور کیے ہے اُنکی گت کی

میرے فراغِ دِل پہ تعجّب نہ کیجئے
پھیلے نہ پاؤں ہیں نہ ذرا اپنا ہاتھ ہے
کیا آپ نے ہنوز کسی سے سُنا نہیں
جس نے کیا ہے صبر خُدا اسکے ساتھ ہے

وجد میں لائے گا یہ مضمون اہلِ ذوق کو
دھوم تھی روزِ ازل اُس سیّدِ ذیجاہ کی
جب رُکے آثارِ فطرت کہہ کے حرفِ لا اِلٰہ
نورِ احمد سے اُٹھی آوازِ اِلّا اللّٰہ کی

عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا | اس قہر کو ملاحظہ لِلّٰہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں | کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

ہستی ہے خوب اکبر ناخوب یہ خودی ہے | دونوں میں فرق کرنا عرفان بس یہی ہے
نفی خودی ہیں لیکن ہستی کا حس ہو جس کو | کتنی قوی بظاہر یہ بحث فلسفی ہے
کیونکر جہانِ صورت اس مسئلے کو سمجھے | یہ عالم معانی بالائے زندگی ہے
ہوش و حواس گم ہیں لیکن زبانِ عارف | توحید کا مزا ان لفظوں میں لے رہی ہے

یہی بحثیں رہی سب میں وہ کیسے ہیں وہ کیسے تھے | یہی سنتے ہوئے گذری وہ ایسے ہیں وہ ایسے تھے
عمل اوروں ہی کے دیکھا کئے یہ نیک یہ بد ہیں | ترقی خود نہ کی کچھ رہ گئے ویسے کہ جیسے تھے

پاس انفاس ہو اگر ملحوظ | ہر نفس راہ کامرانی ہے
سانس لینے کا ورنہ کیا حاصل | صرف اک شغل زندگانی ہے

عاشقی اُن کی نہیں ہے عقل سے بالکل جدا | اہل دل وہ بھی ہیں لیکن دل بدن کے ساتھ ہے
وہ نہیں ہیں میرے چاک جیب و داماں میں شریک | ہے جنوں اُن کو بھی لیکن پیرہن کے ساتھ ہے
آہوئے رعنائے دشت ہو کے وہ قائل نہیں | آنکھ ان کی آہوئے دشتِ ختن کے ساتھ ہے
مجھ کو الجھانے کو کافی ہو گئی سنبل کی شان | جوشِ سودا ان کا زلفِ پرشکن کے ساتھ ہے

یہ نہیں تو کچھ نہیں باتیں ہی باتیں ہیں فقط
ہر زباں اپنے جدا طرزِ سخن کے ساتھ ہے

جس نے یہ بات کسی اور طرح جانی ہے | اس کے نزدیک یہ بے مثل ہے لاثانی ہے

جس نے اشعار ہی میں رنگِ تصوّف دیکھا　　وہ بھی کہہ دے گا یہ اک رندیِ روحانی ہے

بس اتنی بات ہے سامع میں ہو مذاقِ سخن　　مجال کیا کہ مرے شعر پر اچھل نہ پڑے
اب اپنے وعظ میں دنیا سے دل کسی کا نہ پھیر　　قلی گدام کی بھرتی میں تا خلل نہ پڑے

---

۴ خوب اِک ناصحِ مشفق نے یہ ارشاد کیا　　بزم میں اس نے تعلّی جو کل اکبرؔ کی سُنی
نہ تری فوج، نہ شاگرد، نہ پیرو نہ مرید　　نہ تو ارجن ہے نہ سقراط رشی ہے نہ مُنی
کس نگیں پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں　　نوٹ بُک تیری شکستہ تری پنسل ہے گھُنی
فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں　　واہ وا کے لئے لفظوں کی دکاں تو نے چنی
طبع میں تیری وہی خامئ حرصِ دنیا　　آتشِ خوفِ خدا سے نہ جلی ہے نہ بھُنی
خود پرستی ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے　　دل وہی کم ہے تو ہے دل شکنی چار گُنی
تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

کتنا ہی ذوقِ سخن ساز سخن ٹھیک کرے　　کتنی ہی کوئی کسی امر کی تحریک کرے
میں تو کہتا ہوں یہی اور کہوں گا بھی یہی　　بات وہ خوب کہ جو اللہ سے نزدیک کرے

کب کہتا ہوں میں شیخ معزز نہ رہیں گے　　البتہ یہ ہے خوف کہ مرکز نہ رہیں گے
یہ سچ کہتا تھا معمار کسی وقت میں اکبرؔ　　اُٹھا دو فتہ اب یہ مرے گز نہ رہیں گے

مادہ سب میں یہ ہو اِک خیالِ خام ہے　　اِک مذاقِ طبع ہے جس کا تصوّف نام ہے

وہ تو ہے معذور جس کے دل میں اس کا ذوق ہو　　اس سے خالی جس کا دل ہو اس پہ کیا الزام ہے

تعلّیوں کو طبیعت ریجکٹ[1] کرتی ہے　　جو دل شکستہ ہیں ان کو سلکٹ[2] کرتی ہے
ملا ہوں خاک میں خود اس سبب سے میری نظر　　گرا کے قصر بگولے ارکٹ[3] کرتی ہے

محنت کی فکر ادھر ہے تردد ہے کام کا　　دل میں اُدھر ترنگ بھی ہے خودسری بھی ہے
صنعت بھی محوِ سعی ہے فطرت بھی مستِ ناز　　باغِ جہاں میں بیل بھی ہے تیتری بھی ہے

کہاں اُردو و ہندی میں زرِ نقد　　وہی اچھا ہے جو گنتا منی ہے
مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث　　میانِ ہمدم[4] و چنتامُنی[5] ہے

حامی میں تصوف کا دل و جان سے ہوں لیکن　　ارواح پرستی کو تصوّف نہیں کہتے
دنیا کی مجھے فکر ہے غم اس کا نہیں ہے　　سن لو کہ تردد کو تاسف نہیں کہتے
پاکیزہ ہوا ڈھونڈتا ہوں سانس کی خاطر　　اِس شوقِ صفائی کو تکلّف نہیں کہتے

پارک میں زر دے کے مالی سے گُل بے بو لیا　　مال ضائع کرنے کا تم کو ہے مالیخولیا
شیخ کے دامن کو اکبرؔ نے دیا بوسا جو کل　　ہم نے برکت کے لئے اک مِس کا سایا چھو لیا

قوم پر ممبری کا فیر ہوا　　کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا

---

۱ رد کرنا　۲ منتخب کرنا　۳ تعمیر کرنا　۴ نام اخبار　۵ اڈیٹر لیڈر

شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

---

۲ اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا — اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ سائے میں پھیلی — پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا
کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے ہال میں رقصاں — باقی جو تھے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
بہرا دہ بنا کیمپ میں یہ بن گئیں آیا — بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا

دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ
آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

اگرچہ ہے ذوق تمکنت کا لحاظ رکھتا ہوں سلطنت کا
خدا نے قائم کئے ہیں درجے خیال ہے حدِ منزلت کا
زباں کھولوں تو سوچ لوں گا کہ دل کہاں تک ہے اسکا ساتھی
قدم بڑھاؤں تو دیکھ لوں گا جو منتہا ہے مری سکت کا
میں کب ہوں نغمات دل سے غافل نہیں ہوں سازوں پہ پھر بھی مائل
برا جو کھینچ جائے گا کوئی سُر تو لطف جاتا رہے گا گت کا
وہ قوم کی شرط ہی نہیں ہے زباں کہیں ہے مکاں کہیں ہے
ستون ہی جب نہیں میسر تو کیا دکھاؤں میں ٹھاٹھ چھت کا
سنوارے خود آپ ہی نے پتلے اور ان میں کنجی لگائی غربی
لگے وہ جب ناچنے اچھلنے کسی کو پھینکا کسی کو پٹکا

کیوں نہ اپنے دل کو ہو اُن سے ملاپ — لاٹ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ

اُن کے حق میں بھی دُعا کرتے ہیں ہم — مندروں میں جب کبھی کرتے ہیں جاپ
اُن کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں — خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ
ہر طرف سامان ہیں آرام کے — کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ
ہو گئے روشن حدودِ آسماں — علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ
ساری دھرتی دب گئی سائنس سے — لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ

حضرتِ واعظ ہیں راضی رقص پر
دیر کیا ہے اب پڑے طبلے پہ تھاپ

ممبرِ لیگم صفِ مسجد مرا درکار نیست — جان بیما ہو چکا ہے حاجتِ غم خوار نیست
ہمنشیں من اگر شاعر نباشد گو مباش — با گزٹ کار است مارا منقبت درکار نیست

عجب بے تمیزی ہے اِس دور کی — زمانے کو دیکھو اور شیو پُکار
پپیہے سے کہتے ہیں اب پی کو چھوڑ — ضرورت ترقی کی ہے کیو پُکار

اونٹ نے برگٹ میں کل گردن اٹھائی تھی ذرا — ہو چکی تھی اس کو کمسریٹ میں اک مدّت دراز
وہ یہ سمجھا تھا مسلّم ہیں ہماری نیکیاں — خوش دلی سے آپ فرمائیں گے اس کو سرفراز
منزلِ مقصود اس کو سجدہ گاہِ خلق تھی — وہ تو تھا اک بارکش اور سالکِ راہِ حجاز
آپ نے ناحق سزاوارِ سزا سمجھا اُسے — آپ اُسے گردن کشی سمجھے جو تھا اِک پاکباز

یا الٰہی ہم غریبوں کا کہاں ہو اب نباہ
بدگماں اُشتر سے جب ہیں حضرتِ انجن نواز

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

یکے ذی علم در اسکول روزے فتاد از جانب پبلک بدستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی کہ پیش اعتقادات تو پستم
بگفتا مسلم مقبول بودم ولے یک عمر با ملحد نشستم
جمالِ نیچری در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم

نئے بزرگوں کو میں نے جانچا نیا ہی پایا بس ان کا سانچا
اگرچہ شیریں نفس بہت ہیں مگر سراپا وہ کیک ہی ہیں

تو تلاوت میں ہے مصروف تو پھر کیا یہ خیال کیوں ہے تجھ سے بتِ سرکش کو تباہیں بے حد
کیا نہیں تو نے سنا قولِ بزرگاں اے دوست دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں خواند

رُباعیات

کیا فرض ہے یہ کہ ہم ڈھٹائی سے رہیں
لازم کیا ہے۔ بلند ادائی سے رہیں
کافی ہے خدا کی یاد اِک گوشے میں
روٹی مل جائے اور صفائی سے رہیں

———— ۔۔۔ ————

اس بت نے کہا کہ تو ہے بے علم و خرد
کھول آنکھ زمانے کے موافق ہو جا
آخر میں کھلا کہ اس کا مطلب یہ تھا
اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہو جا

———— ۔۔۔ ————

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لئے
اور دکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت
مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

———— ۔۔۔ ————

عالم نے یہاں قبول و رد کو جانا
دیکھا دنیا کو نیک و بد کو جانا
عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگامِ عمل
اپنی قوت کو اپنی حد کو جانا

———— ۔۔۔ ————

اکبرؔ اس باب میں نہ کر فکر بہت
منطق کے گھر میں کچھ نہیں اس کا علاج
مذہب کے قبول میں زیادہ ہیں دخیل
سوشل اثرات اور افتادِ مزاج

مذموم ہے رمز و طعنہ و کبر و حسد — رکھو یہ روش کرے جو اللہ مدد
ہم رنگ سے ارتباط با صدق و صفا — بے میل سے احتراز بے کینہ و کد

آنتوں کے لئے زبان درازی ہے بُری — روٹی نہ ملے تو غل مچانا جائز
اس وقت میں ہے یہی نصیحت اچھی — اس ساز پہ ہے یہی ترانا جائز

سمجھیں نہ حضور تھرڈ والوں کو حقیر — انجن تو وہی ہے جس کی ہم سب کو ہے آس
اسٹیشن گور تک ہے یہ فسٹ و سکنڈ — بعد اس کے موافقِ عمل ہوگا کلاس

دنیا کی ہوس دھرم کا لیتی ہے جو رنگ — دقّت ہوتی ہے جاتری ہوتے ہیں تنگ
گنگا جی کا بہاؤ تو یکساں ہے — آفت ہے مگر پراگ والوں کی یہ جنگ

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال — دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب — بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال

انداز سلف کو یک قلم بھولی قوم — ہے سالک راہِ غیر معمولی قوم
جمعیت دین و دل سے کچھ کام نہیں — قومی اسکول ہے اور اسکولی قوم

میں ہوں یا آپ جناب برہم[1] — دنیا کی روش سے سب ہیں درہم برہم
بے تاب ہے زخم ہائے دل سے مشرق — یارب تری رحمتیں بنیں اب مرہم

---

[1] اڈیٹر مشرق

قرآن وحدیث میں ہے ڈوبا واعظ　　　چسپاں ہو مگر یہ اس کا مضمون کہاں
گھر پہلے بنا کے خانہ داری سکھلا　　　ملت ہی نہیں ہے جب تو قانون کہاں

میں کب کہتا ہوں وہ مسلمان نہیں　　　سب میں چمکے ہوئے ہیں لاثانی ہیں
میں تو اتنا ہی کر رہا تھا دریافت　　　قومی ہیں کہ مذہبی کہ روحانی ہیں

فطری خوبی ہے مبتلا فالج میں　　　بُلبُل داخل ہے میوزیکل کالج میں
داخل میں نوائے ساز کی کس کو ہے خبر　　　رعشہ ہر سُر کو ہے مگر خارج میں

پابند اگرچہ اپنی خواہش کے رہو　　　لائل سبجکٹ تم برٹش کے رہو
قانون سے فائدہ اٹھانا ہے اگر　　　حامی نہ کسی خراب سازش کے رہو

ہے اِن کی جبیں اور بتوں کی درگاہ　　　ہیں شرک خفی میں مبتلا شام و پگاہ
کِس کو یہ خیال ہے کہ مومن کے لئے　　　قرآں میں ہے اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ

منکر کے خیال میں پریشانی ہے　　　اس کا منشا فقط ہوس رانی ہے
دنیا فانی ہے، وہ بھی ہے اس کا مقر　　　لیکن نہ سمجھ سکا کہ کیوں فانی ہے

روشن سینے میں شمع ایماں کر دے　　　دل تیری طرف رہے وہ ساماں کر دے
دنیا سے ہو بے خبر ترے شوق میں روح　　　یارب اکبر پہ زیست آساں کر دے

اک روز بھی تارکِ تگ و دو نہ ہوئے
فارغ از بحث گندم و جو نہ ہوئے
جمعیّتِ دل کہاں حریصوں کو نصیب
ننانوے ۹۹ ہی رہے کبھی سَو نہ ہوئے

ہر اک سے سُنا نیا فسانہ ہم نے
دیکھا دُنیا میں اِک زمانہ ہم نے
اوّل یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز
آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

ظاہر تری رحمتِ نہفتہ ہو جائے
بیدار ہمارا بخت خفتہ ہو جائے
کملایا ہوا ہے دل ہمارا یارب
بھیج ایسی ہوا کہ وہ شگفتہ ہو جائے

ہر ساعت رخت بستہ دنیا میں رہے
مغموم و ملول و خستہ دُنیا میں رہے
عاشورہ ہے ہر روز پس از قتلِ حسین
مومن اب دل شکستہ دنیا میں رہے

دیکھا قدرت کا کارخانہ ہم نے
عِلمی طاقت کو پست جانا ہم نے
از بسکہ ضرور تھا کوئی طرزِ عمل
نبیوں نے جو کچھ کہا وہ مانا ہم نے

جب نورِ یقیں نہیں بصیرت کیسی
طاقت ہی نہیں دلوں میں ہمّت کیسی
اِسلام نئی روش میں کیا ہو یک رُخ
مسجد ہی نہیں تو پھر جماعت کیسی ؛

مثنویات

دُور کوہ لبِ ساحل سے جو گذری اک موج
کوہ نے اِس سے کہا تو نے نہ دیکھا مرا اوج

مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند
بولی۔ سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند

ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل

ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
پوچھئے موج سے ہی بھی اسے رک جانے کی تاب

اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلّی کیسی
اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی

بہہ گئی موج یہ کہہ کر کہ میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنیٔ طور نہیں

بُلبُلا ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

آزادی کا شور مُبارک
یہ تقلیدی زور مُبارک

میرا تو ہے اور ہی منظر
میں تو یہ کہتا ہوں اکبرؔ

عارف کو بیہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

میں بھی گریجوئیٹ ہوں تو بھی گریجوئیٹ
علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ

دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحاں
ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگماں

بولی یہ سچ ہے علم بڑھا جہل گھٹ گیا　　لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

کہتے تھے سابق میں سب اوپر خدا نیچے حضور　　اس مقولے کو مگر بدلیں گے اب اہلِ شعور
زیر پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ　　اب یہ کہنا چاہیئے نیچے بھی آپ اوپر بھی آپ

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی　　مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ووٹ بازی

جب اک بھائی تھے اس منصب پہ ممتاز　　تو پھر کیوں آپ نے کی جست و پرواز
لگے کہنے کہ رہنے دیجئے پند　　مرا کیا بس "مریداں مے پرانند"

درخت جڑ پہ ہے قائم تو اُستوار بھی ہے　　کبھی خزاں ہے اور اس پر کبھی بہار بھی ہے
خلاف اس کے کرے گی خرد جو بے صبری　　نہیں اُٹھانے کا نیچر حکومتِ جبری
جو کوئی چاہے کہ قائم کرے نئی بنیاد　　تو برگ و بار ندارد درخت بھی برباد
بنائے عظمتِ قومی ہے فطرتی اے یار　　اُسی بنا سے ہے وابستہ ہر خزان و بہار
خیال وقعتِ ملت کا جس پہ ہے غالب　　طریقِ راحتِ ذاتی کا وہ نہیں طالب
طریقِ حکمت و تزئین ہر ایک رنگ میں ہے　　نہ سمجھو یہ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے

نگاہِ غور کرو سوئے ٹرکی و ایراں
نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویراں
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے
تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جان آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا
تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا
جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر
کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو پل جُل کر

سمجھا رہے تھے مجھ کو بکٹ کی وہ گردشیں
خود گر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خُم سے آپ
اُلجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دُم سے آپ
بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی
میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی
اللہ رے ارتقائے سگانِ درِ حضور
کل تُو سے تم ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ
ہنس کر کہا انہوں نے الٹ بحث کا ورق
گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بُت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

جب نکیرین آئے مری قبر میں بہرِ سوال
میں نے یہ چاہا کہ لکھوا دوں انہیں سب اپنا حال
ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حیرت ہو گئی
یعنی تھی جو نوٹ بک وہ اس سفر میں کھو گئی
کہہ دیا میں نے کہ اب ہر طرح معذور ہوں
رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں

منشی کہ کلرک یا زمیندار
لازم ہے کلکٹری کا دیدار
ہنگامہ یہ وُدٹ کا فقط ہے
مطلوب ہر اک سے دستخط ہے

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل
ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل

ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر
جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر

شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے
آخر کیا شے یہ ممبری ہے

نیٹو ہے نمود ہی کا محتاج
کونسل تو ہے انکی ہی جن کا ہے راج

کہتے جاتے ہیں یا الٰہی
سوشل حالت کی ہے تباہی

ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں
اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں

در اصل نہ دین ہے نہ دنیا
پنجرے میں پھدک رہی ہے منیا

اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں
لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا
اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا

کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ
اس کو سمجھیں فرض کفایہ

بھائی بھائی میں ہاتھا پائی
سلف گورمنٹ آگے آئی

پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی
ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا
لیکن اِدھر تصوّر جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چُور ہو رہے ہیں

اس قبلہ رُو جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلکِ حسرت دُنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

یہیں کے پیدا یہیں کی رنگت یہیں کی بولی یہیں کا کھانا
تو پھر تفاوت ہو کیوں سُروں میں ہر اک کو بہتر ہے دیس گانا
رہے فرنگی ـ سو اُن کی سیوا ہر ایک پہ آپ فرض کر دیں

جو خاص مطلب ہوں اپنے اپنے الگ الگ جا کے عرض کر دیں
جو باہمی بحث ہو تو باہم ہم اس پہ قالَ اقُول کر لیں
جو فیصلہ ہو قبول کر لیں جو خار بھی ہو تو پھول کر لیں
برادرانہ محبتیں ہوں ۔ جئیں مزے سے خوشی منائیں
نہیں ہے اس میل کا یہ مطلب کہ ہم گورمنٹ کو ستائیں

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشکِ پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا اور خوفِ خدا ہے اس کی دوا
نیچر کی تو حد میں تقویٰ ہے اور نفس پہ کچھ الزام نہیں
ہاں ساتھ اگر شیطان کا ہو تو نیک تو انجام نہیں

در اصل نفس کی چالاکیاں ہیں گھاتیں ہیں
جو دیکھئے تو دکھاوے کی سب یہ باتیں ہیں
نہ قوم کی تمہیں اُلفت نہ قوم کا ہے وجود
فقط یہ پولٹکل ابخرات کا ہے صعود
تمہارے سامنے کچھ مغربی ضوابط ہیں
یہ اسم و فعل نہیں ہے فقط روابط ہیں
نہ قوم ساتھ تمہارے نہ تم ہو قوم کے ساتھ
تمہارا پیٹ تمہارا منہ اور تمہارا ہاتھ
خدا پرست کے تیور ہی اور ہوتے ہیں
خطا معاف وہ جوہر ہی اور ہوتے ہیں

کسی درجے میں دُنیا کے اگر کوئی معزز ہے
سمجھتا ہے کہ یہ اعزاز ہی بس میرا مرکز ہے
مگر ایسا سمجھنا ہے سراسر اُس کی نادانی
وہ عزت اِک تماشہ ہے وہ حالت اس کی ہے فانی

پناہِ نفس بے شک ہے مگر مرکز نہیں دل کا　　اسی پر مطمئن رہنا نہیں ہے کام عاقل کا
وہ کہتا ہے کہ دل کیا چیز ہے بس نفس کی خواہش　　وہ کہتا ہے کہ باطن کیا فقط اعضا کی ہے سازش
مگر یہ اس کی نادانی ہے کم فہمی کی ہیں باتیں　　یہ بے عقلی کے دن ہیں اور یہ غفلت کی ہیں راتیں
بشر اک نوبتِ ہستی میں جب مایوس ہوتا ہے　　حقیقت اپنی تب کھلتی ہے دل محسوس ہوتا ہے
اگر یادِ خدا مرکز ہے تسکین اس کو ہوتی ہے　　وگرنہ بے کسی میں جان اندر تن کے روتی ہے

ایمان پہ ہی قائم جو رہا پیدا ہوئی آخر شکل کوئی　　بالکل ہی سکوں اس میں جو نہ ہو پھر دائرہ تحقیق کہاں
ہر بات پہ جس نے شک ہی کیا وہ مضطر پریشاں باطن تھا　　پرکار سے نقش اس وقت بنا اک جز جب اس کا ساکن تھا

مخلوق ہی کا محور ہے رب کا ذکر کیا　　مطلب ہی کا غلام ہے مذہب کا ذکر کیا
غیرت ہی جب نہیں ہے تو ایمان ہو چکا　　انسان ہی نہیں ہے مسلمان ہو چکا

خس کی یہ معذرت ہے موجوں کے ساتھ ہم ہیں　　موجیں یہ کہہ رہی ہیں قدرت کے ہاتھ ہم ہیں
دریا رواں ہیں ہر سو چشمے اُبل رہے ہیں　　جس راہ لگ گئے ہیں اس راہ چل رہے ہیں

غم سے عبرت کا نور حاصل ہے　　غم نہایت مجلّیِ دل ہے
غم سے مطلب وہ غم جو داغ بنے　　نہ وہ جو رسم کا چراغ بنے

مذہب ہے امر قومی سمجھو نہ فعل ذاتی　　معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا وفاتی
شیعہ ہوں خواہ سُنّی لالہ ہوں یا برہمن　　مذہب کو موروثوں سے سب پاتے ہیں عموماً
پولیٹکل ضرورت بے شک تھی اس کی اوّل　　اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل

اچھا بُرا نہ کہدو تم مذہبی بنا پر
اخلاق اُس کے دیکھو اصلی تو یہ ہے جوہر
تعلیم ہے جو عمدہ صحبت اگر ہے اچھی
پاؤ گے اس کو اچھا طینت اگر ہے اچھی
ناری ہے یا کہ ناجی اُس کا بیاں نہیں ہے
سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو راز دیں ہے

جنابِ فاطمہؓ کے مرتبے کا کیا کہنا
ہمیشہ چاہیئے اُن پر درود خواں رہنا
جنابِ حیدرِ کرّار کی وہ ہیں بی بی
حسنؑ حسینؑ کی ماں ہیں رسول کی بیٹی

ذرّے ہیں چند جن کو صنعت اُبھارتی ہے
اک خاکِ عبرت آگیں لیکن پکارتی ہے
اس انجمن میں ہم بھی اک رات جل چکے ہیں
تم شمع بن رہے ہو اور ہم پگھل چکے ہیں

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے
قافیہ اُن کا مِلا تھا آنت سے
صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے
اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے
خوابِ راحت کس کو کھانا کون کھائے
رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے
درد کے آگے رہا منجن بھی گرد
مصطگی بھی رہ گئی با روئے زرد

یوں تو دونوں ہی ہیں مصروفِ عیادت میں مگر
ایک نکتہ ہے نظر چاہیئے جس پر اکبر
اہلِ ظاہر تو فقط حکمِ خدا پاتے ہیں
اہلِ باطن تپشِ دل کی دوا پاتے ہیں

بے حواس بات سے ہوں جلتا
مجھ سے مرا دل نہیں بہلتا
ہے شوقِ سوسائٹی میں مستی
کیا خاک ہے یہ خدا پرستی

عزلت سے پناہ چاہتا ہوں — گپ شپ ہی کی راہ چاہتا ہوں
اللہ کے واسطے جو ملتے — بے شبہ گلِ مراد کھلتے

کہاں کا گیان اور دھیان کیسا خدا کہاں کا کہاں کے وشنو
عمل کے بدلے اسی کا غل ہے ببیں و بشنو ببین و بشنو
صدائے فونوگراف بشنو ببین تماشائے لمپ برقی
ز سینہ و دل مجو تجلی خموش کن شمع ہائے شرقی

رہنما باطن کا ہو کوئی خضر یہ خوب ہے — اِس خضر پر سب سے لڑنا یہ مگر معیوب ہے
لپنے اپنے خضر سے ہر ایک رکھے دل کو شاد — نام ہے اللہ واحد کا برائے اتحاد

اِک اُٹھا کشور کشائی کے لئے — اِک اُٹھا حق کی صفائی کے لئے
جنگ میں دنیا رہی القصہ غرق — ہاں سکندر اور موسیٰ کا ہے فرق

حافظِ شیراز کا کیا پوچھنا تھے خوش بیاں — ان کا یہ مطلع ہے اب تک انجمن میں برزباں
دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما — چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما
حضرتِ اکبر بھی لیکن اس زمانے میں ہیں فرد — ان کا یہ مطلع کوئی پڑھتا تھا کل با آہ سرد
دوش از صحنِ حرم آمد بہ کالج قوم ما — دیدنی گردیدہ است اکنوں صلوٰۃ و صوم ما

ایک ہی موج فضا میں غفلتیں بہہ جائیں گی — سرکشوں کی گردنیں اپنی جگہ رہ جائیں گی
ساقیٔ بزمِ فنا کا لب پہ کپ آنے تو دو — کبر کی اڑ جائے گی قلعی وہ تپ آنے تو دو

بدن طاہر ہوا اور توحید دل میں — تو ہم اچھے ہیں اپنے آب و گل میں
شگفتہ رکھے گی ہم کو طہارت — جھکا ہی دے گی دلِ طاعت پہ وحدت

اس کا گھوڑا جس کی کاٹھی — بھینس اُسی کی جس کی لاٹھی
زور بٹھا دے تھانے تھانے — دُنیا دیکھے دُنیا مانے
تجھ کو تو ہے خالی چھپنا — اس سے اچھا ہر کو جپنا

غلط بالکل یہ دعویٰ ہے خدا کو جان سکتے ہیں — مگر یہ صاف ظاہر ہے خدا کو مان سکتے ہیں
تعجب کیا اُسے محدود ہستی نے نہیں جانا — تعجب ہے اگر محتاج ہستی نے نہیں مانا

دسمبر میں وہ دوڑے بے تحاشا — لگا ہونے ترقی کا تماشہ
زباں گنجینۂ لفظی میں لکھ لُٹ — چلی اسپیچ کے میدان میں بگ ٹٹ
ہوئی جب جنودی رو کڑ کی طالب — رپٹ لکھوا گیا قومی محاسب
مفاعیلن مفاعیلن فعولن! — مفاعیلن مفاعیلن فعولن!

قوّتِ طبع اگر صرف کرو اے اکبر — تو فقط دشمنِ توحید پہ لازم ہے نظر
کیوں پئے طعن کسی مسلمِ بدنام کو ڈھونڈ — بحث کرنا ہے تو بیگانۂ اسلام کو ڈھونڈھ
باہمی کشمکش و طعن کا ہنگام نہیں — کیدِ اغیار سے مسلم کو جب آرام نہیں

اتحادِ مذہبی اہلِ جہاں میں ہے محال — بہرِ اصلاح انتظار اس کا ہے اک وہم و خیال
اختلافِ باہمی سے چاہیئے قطعِ نظر — ورنہ دخلِ غیر سے ہرگز نہ پاؤ گے مفر

لعن وطعن آپس میں سمجھو عقل و ہمدردی کے خلاف   عادتیں ہیں ہسٹری ہے سب کو تم رکھو معاف
ہاں عمل اس پر کرو جس کو کہ خود سمجھو صحیح   محترز اُس سے رہو جس کو غلط سمجھو صریح
زور سے دبتی ہے دنیا یہ نہیں تو کچھ نہیں   حکم سے چلتا ہے کہنا یہ نہیں تو کچھ نہیں

ہو جاؤ کھڑے کہیں جو قوموا   بیٹھے جو رہیں فلا تلوموا
آنرا کہ قیام یا قعود است   بگذار کہ مایلِ سجود است

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیوں کر   اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیوں کر
اسبابِ کرے جمع خدا ہی کا ہے یہ کام   طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام
بے طاعت و نیکی نہیں تاثیرِ دُعا کچھ   آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ
منظور۔ اگر کبر و تفاخر کا سبق ہے   تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے
یہ کش مکشِ فطرتِ دنیا ہے مسلسل   اِک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل
نیکی کی طرف رُخ ہو یہی ناموری ہے   کھوٹے کو جُدا کر دے وہی بات کھری ہے

ہیں جو کمزور وہ قاضی سے مدد مانگتے ہیں   اور جو ہیں کور وہ ماضی سے مدد مانگتے ہیں
مردِ بینا کو فقط ارض و سما کافی ہے   یہی نظّارہ پئے یادِ خدا کافی ہے
یاد رکھو کہ یہ ہے ملتِ ابراہیمی   اتنا ہی کہہ دیا آواز ہے بہتر دھیمی

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا   جو بُت تھا نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہے کہ مر رہے ہیں   اللہ اللہ کر رہے ہیں

راویوں کا اور شاعر کا بتاؤں تم کو فرق — آسمانِ مطلب و معنی پہ دونوں ہی ہیں برق
وہ سُنایا کرتے ہیں تم کو کہ کس نے کیا کہا — یہ یہ کہتا ہے کہ مجھ سے میرے حس نے کیا کہا

اگرچہ لوگوں نے لکھا ہے حال بعد وفات — مگر کوئی بھی نہیں کہہ سکا یقینی بات
جو ٹھیک بات ہے وہ ہم کو ہو گئی معلوم — ہمارے شعر کی دُنیا میں مچ گئی ہے دھوم
بتائیں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

میسّر جب آجائے خوانِ نعیم — تو لازم ہے شکرِ خدائے کریم
بہت ہے یہ بیجا کہ کھا کر پلاؤ — کہو تم مُتنجن بھی کچھ ہو تو لاؤ

سلف کی بھی تھی اک پولٹکل مد — مگر اس وقت کی تھی مختصر حد
بہت کم تھے رسائی کے دلائل — الگ تھے اپنی قوت میں قبائل
تو اپنے وقت کا جغرافیہ دیکھ — یہ مضمون اور اپنا قافیہ دیکھ

ترجمے والے کرتے ہیں محنت — پا لیتے ہیں اپنی اُجرت
سینے ہو جاتے ہیں خالی — بھرتی جاتی ہے الماری
دل کا کورس تو ٹھہرا غربی — لب پر اُردو ہو یا عربی

اُدھر بدگٹ کا ملّا ہے اِدھر مندر کا صوفی ہے — نہ اس میں بیوقوفی ہے نہ اس میں بیوقوفی ہے
اُدھر وہ بھی اٹھائے نازِ مستانِ حکومت کا — اِدھر یہ بھی بنا ہے رازِ پیرانِ طریقت کا
فلک کھولے گا اِن پر جب کبھی میدان مردی کا — تو قصّہ ختم ہوگا ذہن کی آوارہ گردی کا

اِک مصیبت میں ہی سادھو ہو کوئی یا سیٹھ ہے — ہے تو یہ ساون مگر حکمِ خدا سے جیٹھ ہے
سچ تو ہے گردوں کو راہِ مہربانی کیوں ملے — آگ جب یورپ میں برسے ہم کو پانی کیوں ملے
یا الٰہی جلد ہو بارانِ رحمت کا نزول — یہ دعا لازم ہے سب کو چھوڑ کر کارِ فضول

مذہب کے باب میں کوئی کس کو بدل سکے — یہ تو وہ کر سکے کہ جو حِس کو بدل سکے
حِس امرِ فطرتی ہے خدا ہی کی شان ہے — منطق سے پہلے عادتِ حِس کی اُٹھان ہے
میلانِ طبع ہوتا ہے قائم شروع میں — پھر اس کے آگے رہتی ہے منطق رکوع میں
اِس کے خلاف کچھ جو کہیں ہو وہ شاذ ہے — یا جبر یا وہ مصلحتوں کا نفاذ ہے

انفلوئنزا چڑھا چوگان بازاری اب کہاں — اسپتالی ہو رہے ہیں اسپ تازی اب کہاں
چارے کی قلت ہوئی تو بیل بھی مرنے لگے — انفلوئنزا ہوا کر نیل بھی مرنے لگے
آدمی بھی تنگ ہیں اور جانور بھی زیر ہیں — عقل کی سڑکوں پہ بھی بیماریوں کے ڈھیر ہیں

کیا کھلے گیہوں کی منڈی کیا دُکانِ جَو لگے — موت کے دھڑکوں میں بہتر ہے خدا سے لَو لگے
ہم میں ٹیڑھا پن جو آجائے تو وہ سیدھا کرے — دیوتا بگڑیں تو پھر سرکار اس کو کیا کرے

سب کو لازم ہے دُعا مانگیں خدا سے رات دن — حد زیادہ کی نہیں لیکن کم از کم سات دن

ہو اگر اکبر تمہیں شوقِ صراطِ مستقیم — دیکھ لو قرآن میں مَن یَعتصِم باللہ کو

یاد آ رہی ہے مجھ کو موسیٰ کی گفتگو اب — ہوں محو اِستَعِینُوا بِاللہِ واصبِرُوا اب

طاعتِ باری سے دل کو شاد رکھ — اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ یاد رکھ

فرزندِ مہاراجہ کشن پرشاد وزیرِ اعظم حیدرآبادِ دکن کی موت پر

رحلتِ فرزند سے ہیں راجہ صاحب دردمند
شاد کا دل اس مصیبت سے بہت ناشاد ہے

اکبرِ پرخوں ہیں جگر اس غم میں ہے خود مبتلا
اس کے لب پر بھی فغان و آہ ہے فریاد ہے

حرفِ تسکین و تسلّی کیا زباں پر لائے وہ
شاد خود صوفی ہیں اُن کو درسِ حکمت یاد ہے

رحمتِ حق پر نظر ہے اور یہی ہے التماس
منزلِ ہستی کی یہ اِک فطرتی افتاد ہے

لُطف اشفاقِ خدا کی گود میں پلتا ہے وُہ
جنّت الفردوس اُس کے دم سے اب آباد ہے

اِس تصوّر میں رہے مہراج کی طبع بلند
یعنی اب عثمان پرشاد آسماں پرشاد ہے

علامہ شبلی نعمانی

مشتاق ترا اکبرِ رنجور بہت ہے
افسوس یہی ہے کہ دکن دُور بہت ہے

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے
ویران آج کوچہ بین السطور ہے

شبلیؒ کا خامہ صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا
اب مدّاہ و لوحِ دلِ ناصبور ہے

شبلی ہی اُٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس
شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اُداس

ڈھونڈھا جو دل نے مادۂ سالِ انتقال
پھرنے لگا نگاہ میں یارِ سخن شناس

۱۳۳۲ھ

سر علی محمدّ صاحب راجہ محمود آباد

ہیں حضرتِ ساحر آج اک حسنِ کمال — ہے مخزنِ حکمت و خرد اُن کا خیال
اشعارِ اکبر کے کیوں نہ ہوں یاد انکو — راجہ کے گھر میں موتیوں کا کیا کال

سیّد فضل الحسن حسرت موہانی

تھا دلِ حسرت بھرا ارمان میں — ہم نے لکھ بھیجا انہیں موہان میں
بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم — ہاتھ میں لو اب تجارت کا عَلَم
ہو چکی غیروں سے خوشی کی بہار — بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار
کام کو اٹھو چڑھاؤ آستیں — لَا يُضِيعُ اللّٰهُ أَجْرَ الْمُحْسِنِين

والدہ ڈاکٹر محمد اقبال کی رحلت پر

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جوان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت — یہ طریقِ راستی خود داریٔ بے تمکنت
اِس کے شاہد ہیں کہ اُن کے والدین ابرار تھے — باخدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر اُن میں اُنہیں کا ہے یہ فیضِ تربیت — ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت
مادرِ مخدومہ اقبال جنّت کو گئیں — چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہ گیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمتِ عظمےٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے — سالِ رحلت کا بیاں منظور اُسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات — رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

مہدی صاحب کی رحلت پر

فخرِ ملّت تھے مہدی[1] مرحوم کیوں نہ غم اُن کا ہو ہر اک دل کو
سالِ رحلت کا مادہ اکبرؔ مومنِ پاک بے نظیر لکھو

صدمۂ فرقت میں کر کے مبتلا آج ہاشم[2] عازمِ جنت ہوا
قوّتِ بازوئے عشرت چل بسی اور مرا نورِ نظر رخصت ہوا

چوک کی مسجد الہ آباد میں ممتاز ہے شہر میں سارے مسلمانوں کو اس پر ناز ہے
وسعت و رفعت میں تھی محسوس لیکن کچھ کمی تنگ ہوتی تھی جگہ جب ہوں زیادہ آدمی
دین میں راسخ ہیں عبد الکافی نیکو صفات ان کی باتوں میں اثر ان کے ارادوں میں ثبات
کی انہیں نے سعی دل سے اور لگائی حق سے لَو ہو گئی آخر خدا کے فضل سے تعمیرِ نو
ہو گئی کافی جگہ اسلام کے اقبال سے کہہ رہی ہے مسجد اب اپنی زبانِ حال سے
مسجدِ کافی کی شانِ آسمانی دیکھئے خاکساروں کی بلندی کی نشانی دیکھئے

مرثیہ ہاشم مرحوم

۵ رجون سنہ ۱۹۱۳ء

آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا اباّ سنائیے تو کیا آپ نے کہا ہے
اشعارِ حسرت آگیں کہنے کی تاب کس کو اب ہر نظر ہے نوحا ہر سانس مرثیا ہے

---

[1] رئیس جائس اودھ۔ وکیل الہ آباد
[2] فرزند حضرت اکبرؔ

آگرہ کا ایک مقدمہ

(ایک میم نے شوہر کو زہر دیا - ایک صاحب نے اپنی میم کو قتل کیا)

حالِ مسز کلاک و مسٹر فلمس کھلا / تھا کل بیان پیشِ عدالت کھلم کھلا
ان کو کرایا قتل اور ان کو پلایا زہر / تہذیبِ مغربی کی یہ تکمیل اور قہر
پردے پہ اعتراض ہو اور زہر ہو دوا / پالیگمی[1] پہ طعن ہو اور یہ ستم روا
لاکھوں مقدمات ہوئے بغض کھل گئے / گندہ زمانہ یاد کے دامن سے دھل گئے
فتنے کا ہے قصور نہ مفتون کا قصور / سب کچھ ہے یہ خرابیٔ قانون کا قصور
پردہ نہیں طلاق میں آسانیاں نہیں / جائز کہیں تعددِ ازواج یاں نہیں
فطرت کا اقتضا جو ہے کس طرح وہ رکے / پھر کیوں گناہ جرم کی جانب نہ دل جھکے
آسان ہو طلاق تو دل شاد کیجئے / بے قتلِ غیر اپنا گھر آباد کیجئے
پردہ جو ہو تو ایسے مواقع بھی کم ملیں / کیوں بزمِ مے میں شوخ نگاہیں بہم ملیں
قانون میں روا ہو اگر دوسرا نکاح / پھر کیوں یہ قتل زوجۂ اولیٰ کا ہو مباح
جب پردہ و طلاق و تعدد روا نہیں / پھر بد معاشیوں کے سوا کچھ دوا نہیں
جانیں ہزاروں جاتی ہیں بچے بلکتے ہیں / مستانِ مے جگہ سے بھلا کب سرکتے ہیں
مغرب کا دل جو خواہرِ مشرق کے ساتھ ہے / یہ بھی گھروں میں ان کے لئے ملتی ہاتھ ہے
اکثر یہی ہے حالتِ قانونِ مغربی / آزادیوں کی قید میں روح ان کی ہے پھنسی
بس، ظاہری نمود و چمک اور ادائیں ہے / دل کی خبر نہیں ہے کہ وہ کس ہوا میں ہے
لکچر ہے اس طرف تو ادھر بیہشی بھی ہے / اِس سمت ناچ ہے تو اُدھر خودکشی بھی ہے

---

۱ تعدد ازدواج

تعلیم عورتوں کی ضروری ہے لا کلام — لیکن جو یہ اثر ہے تو بس دُور سے سلام
ہم کو کمال شوق سے تعلیم دیجئے — لیکن کچھ اپنے گھر کی بھی اصلاح کیجئے
ہم فائدہ اٹھائیں گے مغرب کے راج سے — لیکن پناہ مانگیں گے ایسے رواج سے

(حسب فرمائش محمد عبدالرشید صاحب آرزو، سوداگر، دہلی)

دماغ کے لئے خوشبو کا کھیل اچھا ہے — ہوا بھی مست ہوئی ہے کہ تیل اچھا ہے

اِم۔آر۔آرزو کی یہ ترکیب دیکھئے — نیٹو کو رنگ روپ میں مسٹر بنا دیا
تاثیر میں مفید بنولے کا تیل تھا — خوشبو میں بھی اب اس کو لونڈر بنا دیا

الف دین صاحب وکیل کیمبلپور کی کتاب

الف دین نے خوب لکھی کتاب — کہ ب دین نے پائی راہ صواب

بست روزہ پسر سید عشرت حسین کی موت پر۔

نظر اُمید کی اِک غنچۂ دلکش کو تکتی تھی — فلک نے ناشگفتہ اس کو لیکن کر دیا رخصت
سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم اس باغ ہستی کا — بہ صد حیرت کہی تاریخ رمزِ گلشنِ فطرت

۱۳۳۶ھ

پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کی فرمائش پر۔

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا — نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ — تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

مالوی کا مال کچھ اور مولوی کا مول کچھ — کہتے ہیں بازار میں اکبرؔ سے تو بھی بول کچھ

بولا وہ دنیا کا سودا تو فقط اک کھیل ہے　　عمدگی ہے مال میں اور مول میں جب میل ہو

۱۹۱۱ء

مرے عزیز ہیں شیعہ میں کس طرح یہ کہوں　　کہ میں ہوں خوش جو ہوئی ان کی درسگاہ جُدا
دلی دُعا ہے مگر یہ کہ رُکن قوم رہیں　　گریجوئیٹ وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جُدا
بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا　　وہی ہے منزلِ مقصود گو ہے راہِ خُدا
برائے دولت و آنر ہے ایک ہی مرکز　　نہیں ہے اب بھی طریقِ حصول جاہ جُدا
یہ دونوں سایۂ الطافِ مغرب میں ہیں　　نہیں ہیں فضلِ الٰہی سے بادشاہ جُدا
جو نسخہ تھا رزولیوشن کا ہے ادھر بھی وہی　　نہ کوئی حسن جُدا ہے نہ ہے سپاہ جُدا
یہ دونوں اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں　　نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جُدا
ٹرین ایک ہی پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہوں　　کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جُدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج　　نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جُدا
شبِ وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت　　جنہیں ہے ہجر وہ کر لیں گے اپنی آہ جُدا
عجب نہیں جو بلندی و اتحاد بڑھے　　دکھائے رنگ جو دنیا کا اشتباہ جُدا
ہزار دُور ہوں۔ اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں　　کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جُدا
مگن ہیں ٹیچر و انجینیئر۔ رہے ذاکر　　وہ کر ہی لیں گے کسی طور سے نباہ جُدا
ثواب نیک خیالی بھی پائے گا اکبرؔ　　سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جُدا

خواجہ حسن نظامی

حسن نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت
عمل ہے اپنے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت
عنانِ اندیشہ ہائے مضطر ادھر اُدھر گو کبھی مڑی بھی
وہ دستِ دل ہے کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ حبل المتین وحدت

ضمیر میں اُن کے ہے تصوّف معاشرت میں ہیں بے تکلّف
فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں ان کے ہے قناعت

وفات دختر جناب منشی افتخار حسین صاحب کاکوروی ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ

چل بسی وہ دخترِ گل پیرہن | ہوگیا ویراں ہمارا باغ آہ
سالِ رحلت کیا کہوں اے افتخار | دیکھتے ہی ہیں جگر میں داغ آہ

فغاں کہ سوخت زغم جانِ افتخار حسین | دلش فسردہ شد از جورِ عالمِ فانی
شمیم فاطمہ دخت عزیز و نورِ نظر | نہال نورس و زیبا بباغِ امکانی
جمالِ صورتِ معنی خمیر ہستیِ او | بہ خلق نخبہ سعادت بخلق لاثانی
فغاں کہ دست اجل پنجہ زد بدامنِ او | کشید رخت اقامت زعالمِ فانی
بہار گلشنِ ہستی ہنوز نادیدہ | پرید طائر روحش بحکمِ یزدانی
فراق لختِ جگر را ز والدین بپرس | چہ برقہا کہ بیفگند سوز پنہانی
ہزار شعلۂ حسرت کہ سرزد ازدلہا | ہزار اشک مصیبت کہ کرد طغیانی
چو فکر سالِ وفاتش نمودم از سرِ آہ | شمیم خلد شدہ گفت فضل رحمانی
| ۱۳۴۳ھ

یہ تھا قول حمید اُترے تھے جب وہ تخت شاہی سے | جو پیش آیا ہے پیش آیا ہے تقدیرِ الٰہی سے
جو زار روس اترے تخت سے اُلٹا یہ شکوہ تھا | انہیں نے دی دغا ہم کو ہمیں جن پر بھروسا تھا
انہیں قولوں نے کھینچا عبرت و حسرت کا نقشا بھی | انہیں سے ہے عیاں طرزِ خیالِ دین و دنیا بھی

خدا کے بندۂ صالح نقی محمّد خاں | سپہر علم و خرد کے ہیں اخترِ تاباں
کتاب اُن کی یہ ہے ہادیِ طریق صواب | ملا ہے ہم کو یہ گنجِ جواہرِ خوش آب

جو غنچہ قلب کا تاریخ کی طلب میں کھلا
کلید خلق و سعادت میں سال طبع ملا
۱۳ ۳۵ ھ

نورِ باطن بڑھ گیا اعجوبۂ اسرار سے
دل نے پائی تقویت اس روح کے غمخوار سے
پردۂ غفلت اٹھا دیتے ہیں وہ مضموں یہ ہیں
پھیر دیتے ہیں طبیعت دہر کے بازار سے
ہیں مصنف اس زمانے کے بڑے عالی خیال
واقعی یہ ہے کہ ہیں وہ فرقۂ ابرار سے
بند ہی اس وقت چشم عبرت و عرفاں تمام
ہاں لیا ہے کام انہوں نے دیدۂ بیدار سے
ہے بجا اعجوبۂ اسرار کی نسبت یہ قول
دولتِ ایماں بڑھی تصنیفِ گوہر بار سے

حسبِ فرمائش سیّد منظور حسن صاحب اختر زیدی مصنف قصیدۂ ہدیہ حیدری

کس قدر پُر نور ہے یہ نظم مدح بوتراب
یہ بلاغت حیرت افزا یہ فصاحت لاجواب
اِس قصیدے سے ہوئے روشن زمین و آسماں
اوج معنی پہ دلِ اختر سے نکلا آفتاب

جناب سیّد مہدی حسن خجستہ صفات
بلند مرتبہ ذی علم مصدرِ حسنات
سدھارے دارِ فنا سے وہ سوئے خلد بریں
سنہ وفات کا خواہاں ہوا جو قلبِ حزیں
پڑھا یہ ہاتفِ غیبی نے مصرعہ جیّد
مقیم خلد بریں مہدی حسن سیّد
۱۳۳۷ ھ

ڈپٹی کمشنر جبل پور

پیشین گوئی

ماجد[1] کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت
دل ہیں مرے تو ہے اِک اُمید کا قصیدہ
ہیں غالبؔ اوہ مصداق اس شعر باثر کے
ارشاد کر گیا ہے اک مردِ برگزیدہ

من پاک باز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ماسوا رسیدہ

مسٹر برن چیف سکرٹری گورنمنٹ یو۔پی اردو فارسی کے ماہر مصنف کے بڑے قدرشناس۔ کلام عارفانہ وحکیمانہ کے شیدا

شاعروں میں جب آیا مرا ٹرن
پڑھ دیا میں نے پیش حضرتِ برن
اردو فارسی میں آپ ہیں برق
آپ ہی سے ہے نور مطلع شرق
صاحبِ فیض ولطف وحلم ہیں آپ
عزّت افزائے اہل علم ہیں آپ
حق تعالےٰ کو مانتے ہیں آپ
قدر طاعت کی جانتے ہیں آپ
فخر وناز آپ کے لئے ہے مباح
اِک زمانہ ہے آپ کا مدّاح
آپ سے مل کے دل کو راحت ہے
ایسا حاکم خدا کی رحمت ہے
آپ کا دل ہے مخزن ہمہ اوست
جو ملا آپ سے بنا وہ دوست
ہے بلند آپ کے کرم کا عَلم
ہیں مرید آپ کے سب اہلِ قلم
سازِ بزم آپ کا رہے برتر
ہو مبارک ترانۂ اکبرؔ

---

[1] یہ اشعار حضرت مولنٰا عبدالماجد صاحب دریابادی کی بابت اس وقت لکھے گئے تھے جب کہ وہ اپنے موجودہ رنگ سے بہت دُور تھے۔

بنگلہ سید عشرت حسین جونپور

فضل ہو اللہ کا ہوں جمع سالے سالیاں
وہ اچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں

لمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف
عشرتی جھوما کریں بچے بجائیں تالیاں

گھر رہے آباد سمدھی اور سمدھن خوش رہیں
ڈومنی انعام پائے گائے پیاری گالیاں

گرد بنگلے کے رہے سرسبز ہر شاخ درخت
نہر کے پانی سے لہراتی رہیں سب نالیاں

ڈھیر ہو پھولوں کا گلدستے بنائے باغباں
پیڑ پھل دیتے رہیں مالی لگائیں ڈالیاں

سونے چاندی کی بہیں موجیں دولہن کے ہاتھ سے
لیں بلائیں اور دعائیں دیں انہیں گھر والیاں

غل مچائیں کھیل میں بچے رہی بنگلے میں دھوم
میہمانوں کے لئے پکوان کی ہوں تھالیاں

جھانک کر دیکھیں تو جج صاحب کا دل بھی ہو نہال
کمرے کی دیواریں دواک بنی ہوں جالیاں

محمد موسیٰ صاحب برادر خورد شمس العلماء مولوی امجد علی صاحب ایم۔ اے کے نام

بھیجی جو تم نے مجھ کو لیچی
شربت کی نظر ہے اس سے نیچی

منہ میں رکھ کر جو میں نے چوسا
بولی یہ زبان واہ موسیٰ

عطائے شمشیر بہ شیخ شاہد حسین صاحب، رئیس اودھ بہ صلہ خدمات ایام جنگ

حسن کو ابروئے خمدار مبارک ہووے
مرے شاہد کو یہ تلوار مبارک ہووے

ترجیع بند

ذکر رسول پاک ہی فخر زبان انس و جن
روح کو اس سے ہی سرور قلب ہی اس سے مطمئن

ولولۂ دل جواں قوت خاطر مسن
سنئے اگر بہ گوش ہوش ورد ملک ہے رات دن

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

خضرِ رکوع ہے یہی شوقِ سجود اسی سے ہے
حالتِ ذوق و وجد کا دل میں ورود اسی سے ہے
دینِ خدائے پاک کی شان و نمود اسی سے ہے
منبعِ خیر ہے یہی ہمّتِ جود اسی سے ہے

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کردے سما اُبھار کر
اکبرؔ اسی کا ورد تو صدق سے بے شمار کر

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

شافعِ عاصیاں ہیں وہ تائبوں کے کفیل ہیں
فیض رسانِ خلق ہیں حامیٔ بے عدیل ہیں
شکل میں وہ جمیل ہیں شان میں وہ خلیل ہیں
منظرِ نورِ حق ہیں وہ مہبطِ جبرئیل ہیں

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

سینۂ بُت ہے اُن سے شق کفر کے دل میں تیر ہیں
حکمِ خدا کے ہیں مطیع دین کے دستگیر ہیں
راحتِ جان و روح ہیں روشنیٔ ضمیر ہیں
خلق ہے اُن سے مستفید ہادیٔ بے نظیر ہیں

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

حالتِ ملک و قوم پہ ہوں شب و روز بے قرار
دین سے دل کو پھیر دیں ایسے سبب ہیں بے شمار
مرکزِ طبع کیا بنے جس سے ہو کم یہ انتشار
آئی صدا فلک سے یہ پڑھ تو اسی کو بار بار

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

رہنے دے آسماں اگر تجھ سے ہے برسرِ جفا
ہو نہ ملول تجھ سے ہے دولت و جاہ اگر خفا
مسلکِ مستند یہ ہے چھوڑ نہ تو رہِ صفا
نسخۂ حفظِ دیں یہ ہے ہے یہی ٹھیک فلسفا

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

نگرانیٔ مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی
تندموجِ لبِ ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی
بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتون
ہند کے دل کو لبھالیتا ہے مل کا یہ فسون
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں دل
پائے کو ہاں کوئی زنداں میں نیا ہی مجنوں
آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

بیشتر اس سے طبائع کے نہ تھے یہ پہلو
کہیں اشنان کی تھی لہر کہیں موج وضو
اے مسِ سیمتن و ماہ جبیں و گل رو
تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

تعلیمِ نسواں[1]

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حُسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بند و بست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شادمست
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ
مذہب کے جو اصول ہوں اسکو بتائے جائیں
باقاعدہ طریق پرستش سکھائے جائیں
اوہام جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں
سکّے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حُسنِ عاقبت کی ہمیشہ دُعا کرے
تعلیم خُوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالق پہ لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں

---

[1] ایک پنڈت صاحب کی فرمائش پر لکھی گئی۔

خیرات ہی سے ہوگی غرض خاص عام میں
اس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں

اچھا بُرا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے
نیکی اگر کرے گی تو فطرت بھی ساتھ ہے

تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار پر نشان تو ہیں واہیات سے

یہ کیا زیادہ گن نہ سکے پانچ سات سے
لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے

گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا

لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا
مطبخ سے رکھنا چاہئے لیڈی کو سلسلہ

وقت آپڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا
گھر کیلئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی کی چوریوں سے حفاظت پہ ہو نظر

عورت کے دل میں شوق ہے اس بات کا اگر
کپڑوں سے بچے جاتے ہیں گُل کی طرح سنور

کسبِ معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید
اِک شغل بھی ہے دل کے بہلنے کی بھی اُمید

سب سے زیادہ فکر ہے صحت کی لازمی
صحت نہیں درست تو بے کار زندگی

کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا ہو لباس بھی
آفت ہی ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی

تعلیم کی طرف ابھی اور اک قدم بڑھیں
صحت کے حفظ کے جو قواعد ہیں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلیدِ مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے

اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے
دُنیا کی زندگی فقط اِک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
آج اُس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

نعت

مدیحِ سرورِ کونین میں خامہ اٹھاتا ہوں
خیالِ کفر کی ظلمت پہ اِک بجلی گراتا ہوں
شبِ اوہام ہے شمعِ یقیں محفل میں لاتا ہوں
چراغِ طورِ ایمن کوہِ معنی پر جلاتا ہوں

الٰہی شوخئ برق تجلّی دہ زبانم را
قبولِ خاطرِ موسیٰ نگاہاں کن بیانم را

محمد پیشوا اور رہنمائے خلق و عالم ہیں
معزّز ہیں مقدس ہیں معظّم ہیں مکرّم ہیں
فروغِ محفلِ ہستی میں نورِ عرشِ اعظم ہیں
حبیب حق ہیں ممدوحِ ملک ہیں فخرِ آدم ہیں

انہیں کے رنگ سے رنگِ گلِ ہستی کی زینت ہے
انہیں کی بُو سے عطر آگیں بنی آدم کی طینت ہے

انہیں کے دل کو آگاہی ہوئی تھی رازِ فطرت پر
انہیں کی طبع کو وجد آگیا تھا سازِ فطرت پر
وہی چشمِ خدا بیں محو تھی اندازِ فطرت پر
انہیں کا ناز غالب آگیا تھا نازِ فطرت پر

وقائع اُن کے عزم و فکر کے سانچے میں ڈھلتے تھے
ذرائع غیب سے تکمیل مقصد کو نکلتے تھے

وہ نظریں ساقئ میخانہ یزداں پرستی تھیں
وہ آنکھیں مظہرِ انوار رازِ بزمِ ہستی تھیں
انہیں پر بدلیاں خالق کی رحمت کی برستی تھیں
اسی محفل کی بخشیں خلد کے پھولوں میں بستی تھیں

اسی سرکار نے رتبہ بڑھایا طبع انساں کا
اسی دربار نے خلعت پنہایا نورِ ایماں کا

نہ سمجھا پھر ہر اک نے آب و سنگ و نار کو حاکم
طبائع ہو گئے تحقیق موجودات کے عازم
جو تھے صناع تاثیر عناصر کے ہوئے عالم
پرستارانِ عنصر نے عناصر کو کیا خادم

ہوئی توحید بالا جڑ کٹی عنصر پرستی کی   پڑی بنیاد اسی ارشاد سے علمی ترقی کی

غلط سمجھا گیا دعویٰ بتوں کی فاعلیت کا   یقین پیدا ہوا حکمِ خدا کی کاملیت کا

بڑھا نورِ بصر گذرا زمانہ جاہلیت کا   بجا ڈنکا زمانے میں بشر کی قابلیت کا

اشارہ عقل کی جانب کلامِ حق میں واضح ہے   یہی قرآن در گنجینۂ فطرت کا فاتح ہے

معانی ان کے روشن تھے اندھیرے میں اُجالے میں   سما جاتا تھا خوف اُن سے تعرض کرنے والے میں

وہ یوں اصحاب میں تھے جس طرح ہو چاند ہالے میں   مصنف سیل کو لکھنا پڑا اپنے رسالے میں

محمدؐ کی وہ نظریں تھیں کہ دل میں راہ کرتی تھیں   زباں میں وہ فصاحت تھی کہ قومیں واہ کرتی تھیں

قدم ان کے لئے تھے بہرِ حل مشکل مسائل نے   ہدایت ان سے حاصل کی جہاں میں طبع مائل نے

جوابوں میں تشفی پائی ان سے طبع سائل نے   نہایت ہی فصاحت سے لکھا ہے کارلائل نے

جو طاقت رات کو دن اور دن کو رات کرتی تھی   وہ طاقت یعنی یہ فطرت خود ان سے بات کرتی تھی

معاشر دیکھ کر شان ان کی ان کو شاہ کہتا تھا   مسافر راہ پا کر اُن کو خضرِ راہ کہتا تھا

مخاطب معترف ہوتا تھا حق آگاہ کہتا تھا   مخالف کو حسد تھا پھر بھی دل میں واہ کہتا تھا

دلِ کافر میں بھی قدر ان کی تھی ان کا ادب کچھ تھا   نہ ہے شانِ نبوت کچھ نہیں تھا اور سب کچھ تھا

جواہر خانہ اس چشمِ کرم سے سینہ بنتا تھا   حقائق کا خرد کا علم کا گنجینہ بنتا تھا

لطافت سے صفا سے نور سے آئینہ بنتا تھا   علوئے فکر سے عرشِ بریں کا زینہ بنتا تھا

مُریدان کے نہ تھے مشتاق دُنیا کی تگ و دو کے   قدم افلاک پہ پڑتے تھے اس ہادی کے پیرو کے

قلوب اُن کی نظر کے رعبِ ہوش افزا سے ہلتے تھے   چمن ان کے سخن کے فیض بے ہمتا سے کھلتے تھے

ہجومِ خلق تھا راہِ طلب میں شانے چھلتے تھے   بشر کی کیا حقیقت ہے فرشتے جھک کے ملتے تھے

فلک تھا دم بخود بادِ مخالف چل نہ سکتی تھی   خدا کی بات تھی ٹالے کسی کے ٹل نہ سکتی تھی

خلقت کی مصلحت سے بہم کچھ یہ پیار ہے — ورنہ ہر ایک اپنی طرف بیقرار ہے
جو ذرّہ ہے یہاں اُسے اِک انتشار ہے — مرجع تمام خلق کا پروردگار ہے
ہر آن میں ہے شان خدائے قدیر کی — ہر سمت اِک صدا ہے اِلیکَ المصیر کی

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار — جس کا تو حاسد ہے اس کا جو ہو حاسد تیرا یار
واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں
جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا — اب تو ہر اِک ہی مجاور اِک جدا درگاہ کا
واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں
ہاں تجارت اور پالٹیکس میں دیکھیں جو سُود — چند روزہ متفق ہوں ورنہ اے شیخ و ہنود
واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

متفرقات

الا یا ایہا السّاقی مکن تصنیف ناولہا — دروغ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا

جن لوگوں کا قومی کوئی مرکز نہیں ہوتا — اُن میں کا کوئی فرد معزز نہیں ہوتا

سند کیسی جمال ان میں اگر ہے ہوگا خود ظاہر — کوئی سارٹیفکٹ سے خوبصورت ہو نہیں سکتا

آپ کی کارروائی پہ میں کیا دُوں الزام — کر ہی کیا سکتے ہیں اب آپ حماقت کے سوا

جس سے ملتی تھی انہیں دل میں بزرگوں کے جگہ — وہ ادب لڑکوں کے دل سے آج کل جاتا رہا

حالِ دل خوب کہا ہے یہ زباں کا دعویٰ دل سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ کچھ بھی نہ کہا

شیخ نالاں ہیں کہ برگد کو برتنا ہی پڑا اس پرانے سُوت کو بھی بِل میں کتنا ہی پڑا

جو اصل و نقل سے واقف ہے اس نے دل کو ہے روکا مُبارک ہو تمہیں کو چاٹنا لڈو کے نوٹو کا

پئے ممبری جو اُبلے سمجھ اس کو خوُن اچھا یہ بجا ہے قول شاعر گزٹ بد جنون اچھا

مسلمانوں کا وہ آئینِ طبع مستقل بدلا چھٹی عربی گیا قرآں زباں بدلی تو دل بدلا

ہوٹل میں برہمن نے اگر بھوگ لگایا سمجھو کہ دھرم کو یہ بڑا روگ لگایا

ہیں نے سحری کھانے پہ ٹوکا تھا تو وہ جھنجھلائے تھے اور آج جنابِ واعظ نے چودن سے فقط افطار کیا

کیوں کر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز جغرافئے میں عرش کا نقشہ نہیں مِلا

فرقت نے کہا کہ جا گئے آپ کھٹمل نے کہا کہ بھاگئے آپ

بنی امیہ سے تھے تنگ قبل ازیں سادات ستانے آئے ہیں اب شیخ کو بنی کالج

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج اب دُم کی جگہ مِلّت نمدے کی جگہ کالج

کب میں کہتا ہوں الگ ہو سارا قصّہ چھوڑ کر　　کر طلب دُنیا مگر صاحب کا حصّہ چھوڑ کر

ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن　　اپنے مدّاح کا مدّاح نہ ہونا بہتر

ہم ڈنر خواہی و ہم آروغ صاف　　ایں خیال است و محال است وگزاف

کیا پوچھتے ہو اکبرِ شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

تذکرے انکی خوش اخلاقی کے بہت سُنتا ہوں　　جتنے راوی ہیں مگر سب ہیں وہ اربابِ نشاط

عدو کے شست سے بچتے نہیں ہیں　　یہ کالے ہیں مگر گوّے نہیں ہیں

تھیٹر والیاں دنیا میں ہر سو عیش کرتی ہیں　　جہاں رقصاں ہوئیں دل لیتی ہیں بل کیش کرتی ہیں

سائنس کا مطلب ہے کہ نیچر کو نچوڑیں　　اِس بُت کی یہ خواہش ہے کہ اکبر کو نچوڑیں

دیکھئے رہتا ہے کب تک ملتوی یہ قصدِ حج　　گھر کی جانب سے تو اطمینان ہونے کا نہیں

مصلحِ قوم ہوں اُمت کے نگہبان بنیں　　پہلے اللہ مگر خود تو مسلمان بنیں

دفع دل سے اثرِ یاس کیا کرتے ہیں　　رزولیوشن ہی بس اب پاس کیا کرتے ہیں

گوشۂ مسجد میں کارِ شیخ اب بنتا نہیں پیٹ کو تسکین پا جائے مگر تنتا نہیں

خدا کی راہ میں اب ریل چل گئی اکبر جو جان دینا ہوا انجن سے کٹ مرو اِک دن

مسلمان تو وہی ہیں جو ہیں مسلمان عِلم باری میں کروڑوں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں

گرو جی دیکھ کر ہم کو لہو کے گھونٹ پیتے ہیں جو سچ پوچھو تو ہم بھگوان کی کرپا سے جیتے ہیں

وصل کا اُس بُت خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں صرفِ بوسے میں بھلا سلف گورمنٹ کہاں

صداقت کے نشاں اِس مصرعۂ اکبر میں ملتے ہیں کلیں سائنس سے چلتی ہیں دل مذہب سے ہلتے ہیں

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے محل میں بیٹھ کر اب عشق قومی میں تڑپتے ہیں
زمیں اچھی شعاعِ مہر کا جس پر اثر پہنچے وہی دل خوب ہیں جو گرمیٔ عرفاں سے تپتے ہیں

ملکی خیال جب ہے تو ہو سازِ ملک بھی بیلا لیا ہے اس نے تو ہم بین کیوں نہ لیں
رسماً تو ایک بوسہ ہے کافی دمِ وداع لیکن مزا جو آئے تو دو تین کیوں نہ لیں
مصرعہ طرح یہ تھا (بی بی نے دل لیا تو سُسر دین کیوں نہ لیں)

لُطف ہے واعظ کو اکبر قوم خود مختار میں وقت کیوں کھوتا ہے اپنا کمپ کے بازار میں

ہمارے کل خیالوں کو وہ مستحسن سمجھتے ہیں بجز اس کے کہ ہم شیطان کو دشمن سمجھتے ہیں

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے
جب اِس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشہ کیوں نہ کریں

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں
لیکن معائنے کو وہی تابدان ہیں

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
مِس زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

یہ خوب مصرعہ اکبر ہے اس کو شوق سے گاؤ
جو تم کو منہ نہ لگائے تم اس سے دل نہ لگاؤ

محو پرواز ہیں گلشن میں جو تھے زمزمہ سنج
فیض صیاد نے بخشی یہ ترقی اُن کو

یہ برہمن سے تھا موصحت کو بھگوان کی ہر دم جاپ کرو
اسکول کمیٹی میں ہی پھنسا تم اپنی ترقی آپ کرو

ہجر کی شب یُوں ہی کاٹو بھائیو
ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو

انگلش سے بھی ہم کہتے ہیں انصاف کرو نعمت چکھو
جب تم کو خدا خوش رکھتا ہے تم خلق خدا کو خوش رکھو

عقل دنیاوی بڑھانے کی نہ تم کوشش کرو
عقل دنیاوی سے بچنے کے یہ دن ہیں چپ رہو

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

جو چاہتے ہیں کٹے عمر اعتدال کے ساتھ
بٹھا رہے ہیں وہ بسکٹ کا جوڑ دال کے ساتھ

وہی صاحب عمل ہیں شرع و دیں جن کا وظیفہ ہے
یہ صلح کل فقیری فقرہ یا شاہی لطیفہ ہے

سمجھتے تھے جوان کو اُن کی گردن تم نے کل ماری
سمجھ لو آج بیکار ان کتابوں کی یہ الماری

کچھ اس کا غم نہیں آفس میں ہو کہ مل میں رہے
شکم کے ساتھ نہ پھیلے حدود دل میں رہے

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی
ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے
خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

ماہِ جون میں یاد قانوں کیجئے
اور گوارا خفّتِ نوں کیجئے

فرنگی سے کہا پنشن بھی لے کر بس یہیں رہیئے
کہا جینے کو آئے ہیں یہاں مرنے نہیں آئے

کافی ہیں امیروں کو قانونِ گورمنٹ
مذہب کی ضرورت تو غریبوں کیلئے ہے

کالج سے جنہیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے
مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

تم بن گئے ہو صاحب مرزا غریب ٹھہرے
پھر اُن کو کیا تم ان کے گھر کے قریب ٹھہرے

میم نے شیخ کو ڈانٹا تو پکارے وہ غریب
دیکھئے توپ نے لاٹھی کو دبا رکھا ہے

تمہارے حُسن میں سائنس کا بھی دل اُلجھتا ہے
کمر کو دیکھ کر وہ خطِ اقلیدس سمجھتا ہے

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ
مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے
ندا آئی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کر
خوشامد یا شکایت دونوں ہی میں وقت کھونا ہے

نزولِ وحیِ مغرب نوجوانوں پر ہے اے اکبرؔ
زبانیں کالجوں کی کھل گئیں آپ چپ رہئے

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت ہے
پولیٹکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے

قائلِ تقدیر یہ تھے قائلِ تدبیر وہ
یہ قضا سے اور وہ اپنی حماقت سے مرے

دو حرف ہیں دفتر تجھ کو اگر نظر ہے
مذہب مُریدِ کُن ہے سائنس میں "اگر" ہے

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحے رُکا رہتا ہے کام
تنگ ہے وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے

بھائیو گیہوں کا آٹا ڈھائی آنہ سیر ہے
پھر عجب کیا ابن آدم زندگی سے سیر ہے

جو چاہتا ہے زمیں کو لالہ زار کرے
برائے سعی وہ موسم کا انتظار کرے

بھائی عربی، دوست ہندو، بادشاہ انگریز ہے
آپ کی فکرِ ترقی انتشار انگیز ہے

دل میں اب نُورِ خدا کے دن گئے　　ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

یہ ینگ پارٹی کی بنا کس غرض سے ہے　　واللہ یہ علاج تو بد تر مرض سے ہے

اِن میں موجِ مغربی مجھ میں ہوائے شرق ہے　　حضرت گزٹ میں غرق ہیں بندہ غزل میں برق ہے

اب تو پنڈت جی کا ہائی مارک ہے　　دل میں لے کر ما نہیں ہے پارک ہے

بدن کو کچھ سمجھ سکتے ہو نشتر اور شعاعوں سے　　مگر آساں نہیں تشریح استعداد روحانی

رکن محفل وہ ہوئے رنگ بدل دینے سے　　بات میری بھی بنی رہ گئی چل دینے سے

بہ قول اہل مغرب یہ زمانہ ہے ترقی کا　　مجھے بھی شک نہیں اس میں کہ غفلت کی جوانی ہے

اُس بُت کے لب و رخ کا لیا بوسہ پس از عقد　　مجھ شاعرِ مشرق کا ہنی مُون یہی ہے

تجربہ خود ہی بنا دیتا ہے مُرشد اکبرؔ　　سچ کہا آپ نے پیری میں مریدی کیسی

نہ پوچھو ہم سے اکبرؔ حالتِ سائنس و مذہب کو　　وہاں ابجد یہ ہنگامہ ہے یاں ضغطہ یہ بیہوشی

ہر شخص میں جوشِ خودسری ہے　　سوشل حالت کی ابتری ہے

عجب حالت ہی شیخِ ہند کی اطفال کی نسبت   جوانی بھی یہیں گذرے بچیں بھی بت پرستی سے

جب غور کیا تو مجھ پہ یہ بات کھلی   دقّت میں وہ ہیں کہ جو نہ صاحب نہ قلی

کالج و اسکول کی بجتی ہے ہر سو تومڑی   چار دو نی آٹھ ہیں اور فاکس معنی لومڑی

پہلے ہوتا تھا وصال اور اب ہی مرگِ نیچری   عرس کا اب اس لئے ہی نام اینی ورسری

دلیری سکھاتے ہیں ہم کو یہ کہہ کر   جہنم سے ڈرنا بڑی بزدلی ہے

مری کھیتی تو اک مدّت ہوئی چڑیوں نے چُگ لی ہی   میں کیوں پوچھوں جگہ ٹھاکر کی جمنا ہے کہ ہُگلی ہی

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے   ضرورت کیا ہو پردے کی جہاں بمبے کا پانی ہی

ہمارے مصلح اگر یہی ہیں بدل ہی دیں گے مزاجِ لیلیٰ   یہ مشورے دے رہی ہیں حضرت کہ بھیج دو قیس کو برلی

مرا ٹٹّو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب سے   کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بھڑکتا ہی

صبا نے جارج کو مژدہ یہی سنایا ہے   محافظِ حرم اب آپ کی رعایا ہے

نہیں ملنے کی اب فطرت سے لَے اُن کے ترانے کی   ہدایت مرشدوں نے کی ہی اُن کو کپ اُڑانے کی

شاپ میں سب جمع ہیں مجھ سے نہ پی پی کیجئے　　آپ اس بوتل کو میرے گھر پہ وی پی کیجیے

٭

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی　　اب ہیں اچھے جانور پہلے بُرے انسان تھے

٭

ٹرخا دیا ہر ایک کو مغرب نے پاس کر کے　　سیّد بھی کو رے کھسکے برسوں مساس کر کے

٭

جمال صورت و معنی میں بحث و ردّ و کد کیسی　　گل و بلبل کے حق میں کیا شہادت اور سند ہے

٭

نہ دعوے کی ضرورت ہے نہ کوئی روک سکتا ہے　　کسی میں فطرتی جوہر جو ہو وہ خود چمکتا ہے

٭

اتحادِ مذہبی کا شوق گو ہے نیچرل　　اس زمانے میں مگر کچھ اور ہے طرزِ عمل

٭

پہلے سُنتے تھے صدائیں مردِ میداں کون ہے　　اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گوٹیاں کون ہے

٭

وُہی ہنسائے وُہی رلائے وُہی جگائے وُہی سلائے
وُہی بگاڑے وُہی سنوارے وُہی نکالے وہی بلائے
اُسی سے خوش رہ اُسی کا غم کر اُسی کو دیکھ اور اسی میں گم ہو
دُعا اُسی سے ثنا اُسی کی جو گر تو چپ ہو سنبھل جو قسم ہو
جہانِ فانی کے گل کو اُلف اسی کی قدرت کے ہیں لطائف
اسی کی رحمت پہ کوئی غافل اُسی کی عظمت سے کوئی خائف
دلوں کا مالک نظر کا حاکم سمجھ کا صانع خرد کا بانی
جمال اُسی کا جلال اُسی کا اُسی کو زیبا ہے لن ترانی

خواہشیں کھو دیتی ہیں صبر و شکیب — خواہشوں میں ہوتے ہیں اکثر فریب
ہمنشیں کے نفس کے شیطان کے — خود غرض احباب کے سلطان کے
پہلے آپ اصلاح خواہش کیجئے — بعد ازاں دنیا سے سازش کیجئے

ضرورت نے کیا قائم جب باس اور رفیل کا پھندا — تو مشتِ استخواں نے مشتِ پر کو کر دیا چندا
ہمائے اوج عزت کا مگر حق اب تو غالب ہے — شرف اس کا ہے محفوظ غیرت اس کی طالب ہے

اس چیز کا کیا کہنا اکبر تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا ہموار کیا اور ایک کیا
جو قوم کو ابتر کرتے ہیں اب ان اثروں پر روتا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہوتا ہے
تعلیم جنہوں نے پائی ہے وہ بد تو نہیں ہیں بے حس ہیں
دعوے جو ہیں رسم و مذہب کے سب ان کے یہاں سے ڈسمس ہیں
کیوں دولت و قوت کی ہی کمی اس کے تو سبب پیچیدہ ہیں
کچھ اس کو سمجھ سکتے ہیں وہی بوڑھے جو زمانہ دیدہ ہیں
لیکن یہ جو سوشل آفت ہے طوفان بپا ہے فتنوں کا
بے مہری ملت کی یہ ہوا اک قہر ہے جس کا ہر جھونکا
اس کا جو سبب ہے سن لو اسے سب پر وہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں یہ مطلع اکبر حاضر ہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے جھگڑے کو شیعہ سُنّی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی
بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انہیں فرنگی کے پاس پہنچا
وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو ہو وہ بھی نیٹو
فلک نے آخر ہر اک کی سن کر کہا کہ تم سب ہو مست غفلت
سمجھ لو اس کو تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

برگڈ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے　　مغرب کی پالسی کا عربی میں ترجمہ ہے

نہ تیرا فگنی ہے نہ اب حکم رانی　　نہ وہ وضع ملّت نہ قرآن خوانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی　　یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی
ہر اک شاخ میں پاس یہ اپے ہوا ہی　　مرا لال کالج کا کاکا تُوا ہے

پسنجر کی آمد رہی درکنار　　ہُوا ڈاک گاڑی میں بھی انتشار
جو لی ریل والوں نے راہِ فرار　　ٹریفک کا ہے بند سب کاروبار
کئی دن سے سونی ہے ای آئی آر　　یہ سچ کہہ گیا شاعرِ نامدار
بیک گردش چشم نیلوفری　　نہ انجن بجا ماند نہ انجینئری

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق　　بے پُکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مرے ہمسائے کی خاطر سے نہیں　　صرف حکّام سے ملنے میں مزا آتا ہے

قدردانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہی آج   بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ الّو نہ ہوئے

اِک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرعہ یہ تھا   دیدۂ عبرت سے رنگِ دہر فانی دیکھئے
کوئی بول اٹھا زوالِ حسنِ بُت مقصود ہی   اِس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے   بزمِ دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

کہنا ہی مجھ کو جو کچھ، سنئے گا اُس صدی میں   پوچھا کہ اِس صدی میں کیوں چپ ہو گئے جی میں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیاں میں   کہنا ہے جو، کہیں ہم کونسی زباں میں
سُن کر یہ بات اُن سے ہر اک کو آیا چکّر   ایک صاحبِ بصیرت چلتے ہوئے یہ کہہ کر
پیرِ فلک نہ کیوں کر ابوابِ بحث کھولے   جیتے رہیں گرو جی زندہ رہیں یہ بھولے

پہلے کام اپنا پالیسی کرتی ہے   ہمدردی طبع بے حسی کرتی ہے
تنگی ہوتی ہے جب بہت خلقت پر   فطرت خود اُٹھ کے ثالثی کرتی ہے

زبانِ سنسکرت اِس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے   کہ اچھا ہی مری الفت تمہارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھ کو جِلاؤ گے   مگر وِہسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے
جیوں گی میں کہ پھر تم کو ملاؤں دیوتاؤں سے   بھڑاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے
اگر شوقِ عبادت ہے تو میں موجود ہوں اب بھی   اگر دنیا کا سودا ہے تو کب میں اس سے راضی تھی

پیدا جو ہوئے یہ غُل مچانے والے   دل اُن کا نہیں ہیں ہم بڑھانے والے
لیکن بہ ادب کریں گے یہ عرض کہ ہیں   اس فن کے حضور ہی سکھانے والے

فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی   اب تو دھن ہی اُنہیں فرنگن کی

فنا کے دور میں عبرت کو بھی قیام نہیں — نشان ہی نہ رہے جب تو یاد کیا آئے

دلی خواہش تو یہی بیشک کہ ایک اور ایک دو کہیئے — مگر کہنے کو ہوں موجود سب کچھ آپ جو کہیئے
بتانِ مغربی کی مدح و ذم کی بحث نازک ہے — سکوت اس وقت اولیٰ ہو نہ یس کہئے نہ نو کہیئے

گو وہ جدید روشنی کے شعلوں کی ہے یہ — پردے کی احتیاج ہے کیا اس بنا پر
جب شمع ہو تو اس کی حفاظت ضرور ہے — فانوس کوئی رکھ نہیں سکتا الاؤ پر

نام میرا دفترِ اعزاز سے خارج ہے اب — پارک کی زینت میں میری قبر بھی خارج ہو اب

یہ وصالِ لبِ گنگ کبھی گل نہیں سکتی — کلّو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

افعی سے کہا میں نے مجھے تو نے ڈسا کیوں — بولا کہ بلا لاٹھی کے تو بن میں بسا کیوں
پاؤں میں تو مہندی ہے لگی شوق ڈنر کی — حیران ہوں اکبر نے کمر کو یہ کسا کیوں

پیٹ مصروف ہے کلرکی میں — دل ہے ایران اور ٹرکی میں

بعض مُسلم تو ایسے ہیں موجود — مُنہ جو لحمِ البقر سے موڑتے ہیں
فوجی گورے مگر رُکیں کیوں کر — جان جُل کب گئو کو چھوڑتے ہیں

نہ وہ جان کے ہیں نہ ہیں تن کے دشمن — فقط ہیں ہمارے میاں پن کے دشمن
جو ہوں دوست اپنے کہاں وہ میسر — غنیمت ہیں اس وقت دشمن کے دشمن

قناعت نہیں ہے تو ایمان رخصت　　عبادت نہیں تو مسلمان رخصت

یہ آپ کا فرمانا ہی بجا قرآن بھی ہے اللہ بھی ہے　　مشکل تو یہ ہی لیکن کہ اِدھر آنہ بھی ہے اور تنخواہ بھی ہے

ہر طرف برپا ہی طوفانِ عناد و اختلاف　　برہمن اور شیخ سوشل ساز و ساماں کیا کریں
پالسی مغرب یہ مشرق پر تعصب ہی سوار　　اس کو ہندو کیا کریں اس کو مسلماں کیا کریں

تقلیدِ حریف میں جو پہنچے نقصان　　افسوس اس کا ہو کیوں دلِ ملّت میں

مسجد کی مصیبتوں میں دیتے امداد　　ہوٹل میں پٹو تو شیخ جی کیوں دوڑیں

کانٹے بونے لگے اب شکسپیر پڑھ کے عزیز　　گل کھلائیں گے کہاں تک یہ گلستاں والے

سگے بدنبال و نشہ مے، رفل بدست و غرور در سر
کدھر ہما ہے یہ عزم قاتل خدا کرے خیر جان اکبر

ہو گیا ہے الہلال[1] آماجگاہِ تیر غرب　　اس نئے دورِ فلک کی چاندماری دیکھئے

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو　　جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

ضبطیٔ پرچۂ توحید[2] ہوئی نیر یہ ہے　　قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ضبط نہیں خیر یہ ہے
نورِ ایماں کی ضرورت نہیں سمجھا سائنس　　وجہ خاموشیٔ شمع حرم و دیر یہ ہے

---

[1] اخبار الہلال کلکتہ　[2] اخبار توحید خواجہ حسن نظامی صاحب کی ایڈیٹری میں میرٹھ سے نکلتا تھا۔

مغربی پارک میں چکر کے سوا کچھ بھی نہیں | دلِ رنگیں کی ہوا کھاؤ بڑی سیر یہ ہے

قید ہر کروٹ پہ ہر بوسے پہ اک مضمون ہے | عشقِ مس کیا ہے نرا قانون ہی قانون ہے
گو نئی نظریں مبارک باد دیں اس لطف پر | میں تو کہتا ہوں کہ شامت اس کی جو مفتون ہے

صاف کہتا ہوں میں خوش یا ہوں ناخوش مولوی | آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

بابو صاحب کا یہ ہے شکوۂ افلاس بجا | سچ تو کہتے ہیں کہ مچھلی نہ سہی بھات تو ہو

چاہو بھلا جو اس کا ہرگز نہ تم سکھاؤ | بحثِ حقوقِ انساں نیٹو آف انڈیا کو

حج کو کیوں کر جائے کارِ خانگی کو چھوڑ کر | اتنی کثرت ہو جو چوہوں کی تو بلی کیا کرے

بھلا کیا پوچھنا ہے شانِ اکبر کا زمانے میں | کہ نیٹو بھی ہے ہندوستانی بھی مسلمان بھی

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے | ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

قوتِ زیرِ حراست سے نہیں پیدا شکوہ | جب لیا لیسنس وہ رعبِ رفل جاتا رہا

باوجود اس بیکسی کے بدگمانی اس قدر | میں نے کی اللہ سے فریاد آڑے آ یا دیں
ڈائری میں ہو گیا تھا اختلافِ اندراج | لڑ گئے خفیہ پولس سے کل کراماً کاتبیں

سول سرجن تو ساڑھے سات سے پہلے نہیں اٹھتے | ولیکن ان کے مرغے کی سحر خیزی نہیں جاتی

اے ذہن عرب گوش مکن صلح عجم را | ایں نغمہ نشیداست دگر صوت و نعم را

ضمیمہ

در بحرِ زندگی دلم آہے کشید رفت ۔۔۔ برقے بگو میش کہ درا برے طپید رفت
داغ دل است رنگ فنا اندریں چمن ۔۔۔ سبزہ دمید و مُردگلِ تر رسید و رفت

اِس وعدہ خلافی پہ کرو غور کسی دن ۔۔۔ ہر روز یہ کہہ دیتے ہو اب اور کسی دن
ہر لذتِ دُنیا پہ وہ جُھک پڑتے ہیں فی الفور ۔۔۔ آفت میں پھنسائے گی یہ فی الفور کسی دن

خیالِ حالتِ قومی سے دل کو پست کرتا ہوں ۔۔۔ مگر جب اپنا بنگلہ دیکھتا ہوں جست کرتا ہوں

مورّخ اور صوفی میں یہی ہے فرق اے اکبرؔ ۔۔۔ کہ وہ مصروف ماضی ہے اور اس کو حال آتا ہے

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بے شک مگر جناب ۔۔۔ فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

نکال دیں تو در فیضِ عام چھٹتا ہے ۔۔۔ جو منہ لگائیں تو اُن کا گدام لُٹتا ہے
سکھائیں کیوں نہ یہ فقر و فنا رعایا کو ۔۔۔ کہ حرص بڑھتی ہے اس سے نہ دم ہی گھٹتا ہے
کریں یہ خاک نشینوں کی طبع کو ہموار ۔۔۔ کہ جس طریق سے کنکر سڑک پہ کُٹتا ہے

نہ کٹ لِٹ ہیں نہ یاں کانٹا چھُری ہے ۔۔۔ مگر ٹھی ہے تو کھچڑی کیا بُری ہے
کہاں مسجد میں وہ اگلے سے مسلم ۔۔۔ خدا کے نام کی خانہ پُری ہے

ترقی پا کے وُہ برگد میں پہنچے　　کسی کو کیا کہ جب تنہا خوری ہے
یہ لیڈر گا رہا ہے حمد کے گیت　　مگر آواز بالکل بے سُری ہے

عقد سے کیا ہوں وہ خوش کہتی ہے بیوی اُن کی　　بے نماز آئے تو کب ہاتھ لگانے دوں گی
میں مسلمان کی لڑکی ہوں مسلمان ہوں خود　　سامنے بھی انہیں واللہ نہ آنے دوں گی
ساس کہتی ہیں کہ پڑھواؤں گی سمجھا کے نماز　　ایسے مسٹر کو بھلا ہاتھ سے جانے دوں گی

دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اِک ہاتی　　بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی
شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے　　مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

جو ایر شپ پر چڑھے تو ایسے کہ بس ہمیں ہیں خدا نہیں ہے
جو ایر شپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے
حیاتِ دُنیا کو آیتوں میں خدا نے لہو و لعب بتایا
کسی کو ہو کچھ تامل اس میں ہمیں تو شبہ ذرا نہیں ہے

گپیں اڑانے کو اِک وادیٔ عمل تو ہے　　ہمارے واسطے اِک ناز کا محل تو ہے
الٰہی رکھ تو سلامت ہمارے لیڈر کو　　کہ بزم قوم میں اس سے چہل پہل تو ہے
چلا ہی لیں گے کسی کھیت میں بہ حکم حضور　　خدا کے فضل سے محفوظ اپنا ہل تو ہے

اُسے اقرار اغوا ہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں　　علیہ اللّعن ہے شیطان لیکن اُن سے اچھّا ہے
بہت مبہم تمہارا مصرعۂ ثانی ہے اے اکبرؔ　　اشارہ ہے کدھر شیطان آخر کن سے اچھّا ہے

جو سچی بات ہے کہہ دو لگا بے خوف و خطر اس کو ۔۔۔ نہیں رُکنے کا میں ہرگز پری ٹوکے کہ جن ٹوکے
انار آتے جو کابل سے تو پڑتے سب کے حصے میں ۔۔۔ امیر آئے تو ہم کو کیا مزے ہیں لارڈ منٹو کے

شاہی و حکومت کی ہے اصل یہی بیوٹی ۔۔۔ ہر طور سے انسان سمجھ لے اُسے ڈیوٹی
حاکم میں اگر ناز ہے اور عیش پرستی ۔۔۔ حاکم میں اگر بادۂ نخوت کی ہے مستی
کتنا ہی زبردست و بلند اُس کا ہو پایا ۔۔۔ ہرگز نہ کہیں گے اُسے اللہ کا سایا
حاکم کو ضروری ہے مذاہب کی اعانت ۔۔۔ اللہ کی ہو جس سے پرستش بہ فراغت
با ایں ہمہ کرنا ہے مجھے صاف یہی عرض ۔۔۔ حاکم کی اطاعت ہی بہرحال تمہیں فرض
دنیا یہ بنی ہے پئے تیاری عقبےٰ ۔۔۔ بیجا ہے حکومت کا جو ہر اک کو ہو سودا
یہ ملک نہ فطرت کا ہے شیدا نہ خدا کا ۔۔۔ دادا کا کہیں ہٹ ہے کہیں رسم کا خاکا
جو شرک میں ڈوبا ہے نہ پھولا نہ پھلے گا ۔۔۔ غیروں ہی کی امداد سے کام اس کا چلے گا

مجھ میں اب زورِ ناتوانی ہے بہت ۔۔۔ با ایں ہمہ ان کو بدگمانی ہے بہت
خاموش رہو تو سانس لینے دیں گے ۔۔۔ اتنی بھی یہ ان کی مہربانی ہے بہت

میر منشی رضا حسین خاں صاحب نے سلسلہ مراسلت میں مجھ کو یہ شعر لکھ بھیجا تھا

چشمے داریم و عالمے در نظرم ۔۔۔ دیگر چہ معلم و کتابم باید

میری طبیعت میں اس شعر نے ایسا ہیجان پیدا کیا کہ اشعار ذیل موزوں ہو گئے۔

اے آنکہ فسانہ گوئی از دیر و حرم ۔۔۔ ایں دفترِ تست باعث دردِ سرم
بگذار مرا بہ حالم از راہِ کرم ۔۔۔ چشمے داریم و عالمے در نظرم
دیگر چہ معلم و کتابم باید

جامے نہ مئے طہور دارم در دست　　جانم بہ سرود عاشقی بیخود و مست
نے طالب نغمہ ام نہ من بادہ پرست　　تارِ نفس است و یادِ از عہدِ الست

دیگر چہ مغنی و شرابم باید

یہ کہتے تھے اِک لالہ با وقار　　کہ عربی حروف اب تو ہم پر ہیں بار
رُکی ہے انہیں سے ہماری نمود　　یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال　　ہٹے جائے حطی رہیں رام لال

رقبہ تمہارے گاؤں کا میلوں ہوا تو کیا　　رقبہ تمہارے دل کا تو دو انچ بھی نہیں

بوئے وفا نہیں ہے مسوں کے اصول میں　　بس رنگ دیکھ لیجئے گملے کے پھول میں

روتا تھا میں اس غم میں کہ حالت تو یہ ایسی　　اور اس کا کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے

ہو اس کا بھلا جس نے کہا دل کو قوی رکھ　　جو تجھ پہ گذرتی ہے خدا دیکھ رہا ہے

بھائی صاحب تو یہاں فکرِ مساوات میں ہیں　　شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں　　صرف آنرز کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بہ کف　　اِک ہمیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں
ہوش میں رہ کے کرو دُور نقائص اپنے　　مغربی لوگ تو مست اپنے کمالات میں ہیں

طالب ہوں میں ترقئ بابو پسند کا　　اخلاق کو اگرچہ ہے خطرہ گزند کا

بابو ہمیں نگل گئے اِس عہد میں تو خیر　　رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

جس نے کہ یہ کہا ہے واللہ کیا کہا ہے
تعلیم خواہ سب ہیں حاجت روا خدا ہے

مٹنے پر ہے نقشِ باطل
لا تستعجل لا تستعجل

عالمِ وحدت میں کثرت رنگ دکھلانے لگی
ہوش کے ٹکڑوں سے مَیں مَیں کی صدا آنے لگی

جو بات صاف ہے کہتا ہوں بے دریغ اُس کو
نہ مجھ کو کام ہے ٹھکرائی سے نہ شیخی سے
زیادہ زینت دنیا بھی ہے فساد انگیز
جنون جنگ ہے پیدا اسی ترقی سے

اب حدیثِ لیڈری ہے عمر راوی ہو چکی
آفت ارضی کی شدت ہی سماوی ہو چکی
پند ہے کو تو اعباد اللہ اخوانا کی خوب
ووٹ بازی پر مگر یہ پند حاوی ہو چکی

خلوتِ ناز میں کیا شانِ خود آرائی ہے
حُسن خود عالمِ حیرت میں تماشائی ہے

میرے اس مصرع پہ سب کی واہ ہے
ہوش میں ہوں زندگی اللہ ہے

جب غم ہوا چڑھالیں دو بوتلیں اکٹھی
مُلّا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹّی

چلا جاتا تھا اِک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اِک داغ کاغذ پر رہا اُس کا

ابھی وہ روشنی میں شمع کی کاغذ پہ پھرتا تھا
ابھی یوں مٹ گیا اک جنبش انگشت انساں سے
لیا میرے سوا نوٹس ہی کس نے اس کا دنیا میں
نہ تھی فطرت کی کیا کاری گری اس کے بنانے میں
نسب نامہ بھی اس کا عالمِ ذرات میں ہوگا
یہی تھی اس کی ہستی اور اس میں اُس کی مستی تھی
نہ ماتم کرنے والا ہے نہ لائف لکھنے والا ہے
وہ دھبا درسِ عبرت دے رہا ہے مجھ کو اے اکبرؔ

معاذ اللہ کیا سمجھا ہے تو نے اپنی وقعت کو
تجھے بھی صفحۂ روئے زمیں سے ایک دن آخر
مٹا دے گی کوئی تحریک فطرت حکم باری سے
عجب حیرت سے میں ہوں دیکھتا اس داغ کاغذ کو
مری نظروں میں تو نقشہ یہی دنیائے فانی کا
مر گیا جسم تھا اک جان تھی احساس تھا اس میں
اور اب دھبّا سا ہے کیا جانے کوئی کیسا دھبّا ہے
عجب کیا ہی جو سمجھے کوئی پنسل کی لکیر اس کو
معاذ اللہ معاذ اللہ سنّاٹے کا عالم ہے
بہت جی چاہتا ہے روؤں اس ہستی کے دھبے پر
یہ ہیں برسات کے دن تیسری بھادوں گذرتی ہے
میں اپنا غم غلط کرتا ہوں کچھ اشعار لکھنے سے

(اصل کاغذ جس پر دھبّا ہے حسن نظامی دہلوی لے گئے اس کا فوٹو انہوں نے چھاپا ہے)

پوچھے کوئی اگر تصنیف کیا
کہہ دو اکبر کہ لفظ بے معنی
پوچھے کوئی اگر شریعت کیا
کہہ دو اکبر کہ لفظ با معنی
پوچھے کوئی اگر تصوف کیا
کہہ دو اکبر کہ معنیٔ بے لفظ

ہمارے شیخ صاحب کا عمل کتنا مناسب ہے
اُدھر برگد بھی لٹّو ہے اِدھر جنت بھی واجب ہے

مطبع کی یاں مدد نہ کتابوں کا زور ہے
میخانہ دل ہے اس کی شرابوں کا زور ہے

فدا ہوں ہادیانِ دین و ملت کے نشانوں پر
پرستش میں مگر تقلید ابراہیم کرتا ہوں
فروغِ روئے انسانی بھی ہے اور شمس تاباں بھی
مگر میں لا احب الآفلین تعلیم کرتا ہوں
درِ دل اہلِ دل کا جب کھلا ہو جانبِ عرفاں
تو بے شک فیض روحانی کو بھی تسلیم کرتا ہوں

اِک بحث میں اُلجھ کر دنیا کا کام چھوڑا
چھوڑی سحر نہ اس نے ہنگام شام چھوڑا
ہر فلسفی نے لیکن عمر اپنی ختم کر دی
جو بحث اٹھائی اس کو بس ناتمام چھوڑا
اکملت کا اشارہ کافی ہے تجھ کو اکبرؔ
پھر دل کا کیا ہے مرکز جب یہ مقام چھوڑا

عجم کی زبنتیں سیکھیں مباہات عرب سیکھیں — زمانے کی ترقی جو سکھائے ان کو سب سیکھیں
مگر اک التماس ان نوجوانوں سے میں کرتا ہوں — خدا کے واسطے اپنے بزرگوں کا ادب سیکھیں

دل کو فطرت سے ہے تعلق — مذہب کا اثر زبان پر ہے
چاہو جو شناخت نیک و بد کی — موقوف یہ امتحان پر ہے

دنیا کی بے وفائی سے اکبرؔ ملول ہے — لیکن زیادہ اس کا تصوّر فضول ہے

اب تک وہ رو رہا ہے میں سمجھا تھا رو چکا — اتنی سمجھ نہیں کہ مرا وقت ہو چکا

جن میں ہر گام پہ اک دام بلا ہے درپیش — نفس کو تو انہیں باتوں میں مزا آتا ہے
اس کمیٹی میں نہیں روح کی لذّت کا خیال — ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکرِ خدا آتا ہے

بہتر سمجھے ہو تم جو خاموشی کو — یہ بھی نہ کہو کہ خامشی بہتر ہے

الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا — الف اللہ کا اور ماسوا بُت

نہ ازل کی رہی یاد اور نہ ابد کی ہے خبر — آفریں تجھ پہ مجھے ہوش میں لانے والے

بے حد وہ خفا ہیں اکبرؔ سے اور اس کی دُعا یہ ہے کہ انہیں
اللہ بصیرت ایسی دے اپنی غلطی کو دیکھ سکیں

علم پر گو غرور بیجا ہے — جاہلوں سے ہے اجتناب روا

شیخ برگد کہتے ہیں مذہب ضروری ہے مگر / فائدہ مذہب کا جو کچھ ہے اسی دُنیا میں ہے

وہ خرافات پر ہیں داد طلب / واہ واہ پر عجب مُصیبت ہے

حضرت کی شعر گوئی کچھ مستند نہیں ہے / کہنے کی ایک حد ہے بکنے کی حد نہیں ہے

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا / کہ وہ جامے سے باہر ہے یہ پاجامے سے باہر ہے

کیا خبر خلد سے کیوں حضرتِ آدم نکلے / ہم تو مصروف ہیں گیہوں کی خریداری میں

لاکھ چھانٹیں وہ مذہبی باتیں / فرق ہے شیخی و کلرکی میں

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض / کالج کے کیڑے پڑ گئے دلقِ فقیر میں

اصطلاحِ بُتِ بے پیر اسی پر ہے درست / جس کا مرشد نہیں استاد نہیں پیر نہیں

تعلیم اس کی اچھی جو اپنے گھر میں خوش ہو / مذہب اُسی کا اچھا جس کو پولس نہ پکڑے

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے / جو مارتے تھے مکّھی اب مارتے ہیں چوہے

تمہاری شاعری یہ پُھل جھڑی ہی یا پٹاقا ہے / یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا سا دھاقا ہے

تم خدا کو خوش کرو سب کی خوشامد چھوڑ کر / با خدا حاکم جو ہوگا خود ہی خوش ہو جائے گا

فرما گئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن / دُنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

نا ملائم کیوں کہو اور کیوں سُنو　　بات یہ ہی چُپ کر دیا چپ رہو

سمجھی ہوئی باتوں نے پریشان کیا ہے　　مشتاق ہوں اس کا جو سمجھ میں نہیں آتا

قائل ہمہ اوست کا ہے اکبرؔ　　محسوس مگر ہمہ نہیں ہے
کرتا ہوں مضمون یہ مغرب سے نقل　　بولتا ہے علم اور سُنتی ہے عقل

کالج کے مفتیوں سے کل کہہ رہے تھے اکبرؔ　　بسکٹ سے باز آنا رُہبانیت نہیں ہے

کہتے ہیں کہ تم قوم سے قسم کیوں نہیں کہتے　　کہہ دو یہ مناسب ہے تو تم کیوں نہیں کہتے

یہ ہی اُن کے عقائد ہیں یقیں اُس کا نہیں ہوتا　　جو کرتے ہیں نہ کرتے یہ اگر ان کو یقیں ہوتا

فرمان کسے بودہ دُر ہا کہ چنیں سُفتم　　گفتند بگو گفتم ۔ گفتند مگو خفتم

سایہ مدت ہوئی غبارہ بنا　　پاپُوں میں بھی اب بھری ہے ہوا

جو کہہ رہا ہے خود اسکو نہیں ہے وہ محسوس　　غرض کہ داد ہی پالے اثر سے ہو مایوس

رجز تو تو نے ستائی رہ عمل کو بھی دیکھ　　پُرانے قصّے تو ہیں یاد آج کل کو بھی دیکھ

یاں نہ منطق ہے کتابوں کے نہ پشتارے ہیں — جوش ہے دل میں مضامین کے فوارے ہیں

مغربی تعلیم ہو اور ہوم رول بات ہو — لطف موسم ہے یہی مینڈک ہو اور برسات ہو

دین پر جب ہم نے دنیا کو مقدم کر دیا — دنیوی درجے کو بھی اللہ نے کم کر دیا

خوب عالم ہے زمانے کو جہاں دخل نہیں — بزمِ توحید میں یہ گردشِ ایّام کہاں

سر جھکا رکھ سر اُٹھانے کی جگہ اے دل کہاں — چاند ماری ہو رہی ہے بدر کی منزل کہاں

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا — غم نہ کھا روٹی تو گیہوں کی رہی

ہے حوادث کا محبانِ الٰہی پر بھی فیر — ہاں حسابِ دوستاں در گور اگر کہیئے تو خیر

نبوّت کا زمانہ اور تھا اب اور جھرمٹ ہے — وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بسکٹ ہے

کیا ترقی کہ ہم جس سے بڑھے بغض و نفاق — فربہی کیا ہے اگر خلط ہے فاسد پیدا

اِس وقت مولویت صوفی سے بھڑ گئی ہے — اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
ملا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم — صُوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم
مُلا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو — صُوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو

ملا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی　　صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھئے　　صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے
اس جنگ میں ہے بے شک نادانی سیاسی　　یہ بات ہے یقینی ہرگز نہیں قیاسی
گو قید ظاہری کی پاتے ہیں اُن میں قلت　　وہ بھی جماعتیں ہیں وہ بھی ہے نظم ملت
دینی طریق میں تو ہر سمت اب کمی ہے　　مجلس میں ہے تزلزل میلوں میں برہمی ہے
کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن　　دیکھا نہیں تھا لیکن مُردوں پہ آپریشن
بازو قوی جو رکھتے ہوتی اگر حکومت　　اس وقت شاید آتی کچھ کام یہ خصومت
تنگیِ رزق نے تو چرخے دیئے ہیں کتوا　　کیسی دلیل شرعی کیسا خرد کا فتوے
ہوتا رہے گا نشتر پہلے چلائیے تو　　جانِ حزیں کو ان کے تن سے ملائیے تو
ہے ہاتھ میں قلم بھی منہ میں زبان بھی ہے　　لیکن یہ دیکھئے تو حضرت میں جان بھی ہے
وضع کہن کا مٹنا اس کی یہ رُت نہیں ہے　　تیشے سے توڑ دو تم ایسا یہ بُت نہیں ہے
اِس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں　　آپس میں گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
بہتر ہے کام لینا نغمات موعظت سے　　روکو گلے کو لیکن ایسی چلت پھرت سے
شیعہ ہوں خواہ سُنّی ملا ہوں خواہ صوفی　　بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی
باتیں نئی کہاں سے لاکر کوئی کہے گا　　تم بھی وہی رہو گے وہ بھی وہی رہے گا
دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے　　موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے
وقتِ نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو　　اللہ کو پکارو اللہ کو پکارو

وہ خود آرائی کہاں۔ خوشیوں کی تمہید اب کہاں　　رسم ادا کر دیتے ہیں مل لیتے ہیں عید اب کہاں

دانے کو ہی حق نشو و نما اس سے تو نہیں انکار مجھے　　لیکن یہ بتا دو مجھ کو ذرا وہ کھیت میں ہی یا پیٹ میں ہے

چلتی نہیں کچھ اپنی کوئی ہزار چاہے
ہوتا ہے بس وہی جو پروردگار چاہے
بے رونقیِ اکبرؔ میں ہو شریک اگر
جو موسمِ خزاں میں رنگِ بہار چاہے

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسالِ خدمت ہے
ہمارے لختِ دل ہیں آپ کا مالِ تجارت ہے

کہوں کیا ہستیِ باری میں شک ہونے کے کیا معنی
یہی سمجھا نہیں میں آج تک ہونے کے کیا معنی

تنہائی میں بھی فکرِ جماعت کی جی میں ہے
دنیا میں میں نہیں ہوں یہ دنیا مجھی میں ہے

شاگردِ ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا
اکبرؔ مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

اگرچہ دعوئے اسلام ہے مگر بالفعل
سوا خدا کے ہمارا کوئی گواہ نہیں

چھوڑنا ممکن ہے اکبرؔ شوخیِ گفتار کو
ترکِ حق گوئی ہے مشکل محرمِ اسرار کو

جوانی نے تو اپنے واسطے ہم کو اٹھایا تھا
بڑھاپا تو بٹھائے اب خدا کے واسطے ہم کو

جلد دوم تمام شد